سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو پاکستان نمبر ۲۸۵

سعادت یار خاں رنگین

از

ڈاکٹر صابر علی خاں ام اے، پی ایچ۔ ڈی،

استاد اردو کوئن میری کالج، لاہور

شائع کردہ

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، کراچی

سنہ ۱۹۵۶ء

مصنّف: ڈاکٹر صابر علی خاں ایم اے، پی ایچ ڈی
متوطّن فضل گڑھ ضلع بجنور

ناشِر: انجمن ترقّیٔ اُردو، پاکستان

طابع: انجمن پریس، لارنس روڈ، کراچی

کاتب: محمّد اختر

تعداد اشاعت: ایک ہزار

محترم بھائی مکرّم علی خاں صاحب

کے نام ....

فہرست مضامین

پیش لفظ

اُردُو کے بدنام شعرا میں سعادت یار خاں رنگین کا نام سرِ فہرست ہی۔ لوگ عام طور پر انھیں انشاء اللہ خاں انشا کے یار اور ریختی کے موجد کی حیثیت سے جانتے ہیں یا پھر 'مجالسِ رنگین' کی اشاعت کے بعد ان کے رسالے سے اس عہد کی ثقافتی زندگی اور شاعرانہ سرگرمیوں کا کچھ پتہ چلا، لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ اس بے اعتنائی اور گمنامی کا شکار رہے جو ہمارے اکثر متقدمین شعرا اور ادیبوں کے حصے میں آئی ہی۔ بدنامی کی ہی بدولت سہی رنگین کا نام بہرحال باقی رہ گیا اور یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی اکثر و بیشتر تصانیف کے خود نوشتہ نسخے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ رہ گئے اور ان کی فہرست اور نوعیت سے یہ اندازہ ہوا کہ رنگین اپنے کلام کی مقدار اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے اُردو زبان اور شاعری کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے کلام کے مطالعے سے اس عہد کے شاعرانہ اور ادبی ماحول شعر و شاعری کے میلانات اور رجحانات معاصرین کے مقابلے میں رنگین کی حیثیت اور بالعموم اُردُو شاعری اور زبان کی تاریخ میں رنگین کا مرتبہ متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہی۔ یہ خیال اس مقالے کی تحریر کا محرک ہوا ﴾

نواب سعادت یار خاں رنگین جو مصحفی، انشا اور جرأت کے ہم عصر اور

ہم طرح تھے متوسطین شعرائے اردو کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں عبوری دور کا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس دور کے شعرا نے ایک طرف ولی کے شاگردوں اور معاصرین مثلاً حاتم، آرزو وغیرہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اور دوسری طرف اپنے آخر زمانہ میں لکھنؤ میں اس دبستان کو ابھرتے دیکھا جس کی نمایندگی ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ میں یہ ایک اہم دور ہے کہ اس میں قدیم و جدید کا سنگم اور عمل و ردِّ عمل نظر آتا ہے۔ دوسرے یہی عہد اردو شاعری کی بعض اصناف کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ میر کے زمانے میں غزل اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گئی، لیکن مثنوی اپنی معراج کے لیے میر حسن اور ان کے دور کی منتظر رہی۔ پھر اس دور میں شاعری میں بعض خاص میلانات اور رجحانات ایسے نمایاں ہوئے جو بہ راہ راست اس عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول، تہذیبی حوادث و انقلابات، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب کی وفات فروری سنہ ۱۷۰۷ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک کا ڈیڑھ سو سال کا عرصہ برِّعظیم کی تاریخ میں نہایت پُر آشوب گزرا ہے۔ دہلی کے تخت کے لیے شاہ زادوں کی باہمی کش مکش درباریوں کی سازشیں اور جتھے بندیاں، ملک کے طول و عرض میں نئی سیاسی جماعتوں اور حریفوں کی ریشہ دوانیاں، عسکری نظام کی ابتری، معاشی تباہ حالی، اخلاقی پستی، عیش پرستی اور فرار کی ذہنیت کی داستانیں تاریخوں اور شعر و ادب کے صحیفوں میں بکھری پڑی ہیں۔ نادر کا حملہ اور ابدالی کی یورش، صرف دو بڑے واقعے معلوم ہوتے ہیں لیکن اثرات و نتائج کے اعتبار سے اس ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں روزمرّہ چھوٹے بڑے سیکڑوں واقعات ایسے پیش آتے رہے جن کی

اہمیت نادر گردی سے کم نہیں ہے۔ قدرتی طور پر اس دور کا شعر و ادب ان حالات کا ایک اہم ترجمان ہے۔ اور رنگین بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ؏

رنگین نے اکیاسی سال کی طویل عمر پائی تھی۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کا زمانہ چھیاسٹھ ۶۶ سال قرار پاتا ہے۔ شعرگوئی کی اس طویل مدت میں ان کے رجحان، شوق اور قادر الکلامی کو پیش نظر رکھیں تو کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ انھوں نے بلا مبالغہ لاکھوں اشعار کہے ہیں اور اصناف سخن میں سے کوئی صنف ایسی نہیں جس پر انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اور ہماری بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ہمارے لیے محفوظ رہ گیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس میں سے بیشتر خود ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نادر اور نایاب ذخیرہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں موجود ہے اور بڑی حد تک اس مقالے کی بنیاد اسی ذخیرے پر رکھی گئی ہے جس کے لیے میں پنجاب یونی ورسٹی لائبریری اور انڈیا آفس کے کتب خانے کے منتظمین کا شکرگزار ہوں جن کے تعاون سے مجھے اس سرمائے سے استفادے کا موقع ملا ؏

اس خوش قسمتی کے ساتھ رنگین کی بدقسمتی یہ ہے کہ اب تک ان کے کلام کا بہت کم حصہ طبع ہوا ہے اور سوائے 'مجالسِ رنگین' کے جسے سید مسعود حسن رضوی نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کرایا ہے، رنگین کا قابلِ ذکر اور بیشتر کلام نظم و نثر قلمی نسخوں کی شکل میں ہے جو عام لوگوں کی رسائی سے تقریباً باہر ہے۔ 'مجالسِ رنگین' کا یہ مطبوعہ نسخہ بھی ایک اور قدیم مطبوعہ نسخے پر مبنی ہے اور رنگین کے اپنے لکھے ہوئے نسخے سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ رنگین کی شہرت صرف ریختی گو کی حیثیت سے ہے کہ اکثر انھیں اس فن کا موجد بتایا جاتا ہے۔ ریختی

کی فنی حیثیت کچھ نہیں اور اخلاقی اعتبار سے تو بعض ناقدین کے نزدیک شعر و ادب میں اس کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ رنگین کی یہ ایجاد ان کے حق میں زہر ثابت ہوئی اور اس بدنامی یا شہرت نے ان کے کلام پر ایسا پردہ ڈالا جسے آج پہلی مرتبہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور رنگین کی ۲۳[1] تصانیف جو خود ان کے قول کے مطابق ان کی تصانیف کی کل تعداد ہے تحقیق و تنقید کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں:۔

اس مقالے کی تدوین و ترتیب میں رنگین کی حسب ذیل قلمی اور مطبوعہ تصانیف سے مدد لی گئی ہے:۔

(۱) 'دیوانِ ریختہ'، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری۔ مصنف نے اپنے قلم سے باندہ میں ۹ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ کو نقل کیا۔ دراصل رنگین نے اپنا پہلا دیوان ریختہ ۱۲۰۲ھ میں مکمل کر لیا تھا لیکن وہ جنگ پاٹن[2] میں ضائع ہو گیا۔ دوسرا نسخہ ۱۲۱۵ھ میں مکمل ہوا۔ اس نسخے میں ۱۲۱۵ھ والا دیوان پورا نقل ہوا ہے۔ کچھ اور متفرق کلام ہے جس میں رباعیات، قطعات اور فردیات شامل ہیں۔ آخر میں قطعات تاریخ ہیں جن میں ۱۱۹۶ھ سے ۱۲۴۰ھ تک کے حالات اور واقعات کی تاریخیں ہیں۔ دیوان غزلیات ۸۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع میں ایک فارسی دیباچہ ہے جس میں رنگین نے اپنے ذاتی حالات اور واقعات لکھے ہیں اور اس میں اپنی ولادت ۱۱۷۰ھ میں سرہند میں بتائی ہے۔ اس دیباچے میں رنگین اپنی تصانیف کی کل تعداد ۲۳ بتلاتے ہیں۔

(۲) 'دیوان ریختہ'، قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۷۹ تعداد اوراق ۱۵۱۔ خط نستعلیق یہ بھی مصنف کا قلمی نسخہ ہے جو ۶ رجب ۱۲۴۹ھ کو باندہ میں مکمل ہوا دراصل دیوان ۱۲۱۵ھ میں شروع ہو کر ۱۲۲۵ھ میں مکمل ہو گیا تھا مصنف نے

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۵۲ [2] قریب جے نگر

اپنے اس قلمی نسخے کے شروع میں اُردو میں ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں اپنے تصانیف کے مجموعے 'نورتن رنگین' کی تفصیل لکھی ہے۔ زیر نظر دیوان اس مجموعے کا دوسرا حصہ ہے اور اس قلمی نسخے میں علاوہ دیوان غزلیات کے ایک قصیدہ نواب سیّد احمد میر خاں کی تعریف میں اور دو خط بی افرخندہ کے نام بہ طور مثنوی شامل ہیں۔ آخر میں رباعیات، فردیات، مسدس اور مخمس ہیں۔ اس دیوان میں صنعات کی قید ملحوظ ہے ؛

(۳) 'دیوان بیختہ'۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۸۰۔ تاریخ کتابت چہارشنبہ ۲ محرم ۱۲۵۵ھ۔ کاتب محمد ولی طالب علم۔ تعداد اوراق ۹۶

(۴) 'دیوان آمیختہ'۔ یعنی دیوان ہزلیات رنگین قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۱۔ قلمی نسخہ مصنف تاریخ کتابت ۲ رجادی الثانی ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ تعداد اوراق ۶۳۔ اس کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ فارسی میں ہے جو پانچ اوراق پر مشتمل ہے ؛

(۵) 'دیوان انگیختہ' (دیوان ریختی) دلّی کی بیگماتی زبان میں، قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۲ قلمی نسخہ مصنف۔ تاریخ کتابت ۲۵ رجب ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ تعداد اوراق ۷۱۔ دیوان ۱۲۲۰ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان مکمل ہوا۔ شروع میں دس صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ ہے جس میں عورتوں کے خاص محاورات اور مصطلحات کی تشریح ہے۔ یہ دیوان مجموعہ نورتن رنگین کا چوتھا حصہ ہے۔ دیباچے کا آغاز اردو نثر کی ایک عبارت سے ہوتا ہے جس میں سبب تصنیف وغیرہ کا ذکر ہے ؛

(۶) 'مجموعہ رنگین'۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۳۔ تعداد اوراق ۴۵ مصنف کا قلمی نسخہ تاریخ کتابت ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ یہ

'نورتن رنگین' کا پانچواں[۵] حصہ ہے۔ اس میں ایک قصیدہ ٹیپو سلطان کی مدح میں بھی شامل ہے۔ دیوان ۱۲۳۵ھ میں مکمل ہوا تھا لیکن کتابت کے وقت رنگین نے بعد کی نظمیں بھی شامل کرلی ہیں ؛

(۷) 'مجالس رنگین'۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۴ - تعداد اوراق ۵۳ مصنف کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ تاریخ کتابت ۵ - جمادی الاول ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ اس میں ۶۵ مجالس کا حال ہے ؛

(۸) 'مجالس رنگین'۔ نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری مطبوعہ محمدی پریس سنہ ۱۲۶۴ھ۔ تعداد صفحات ۴۰

(۹) مجالسِ رنگین قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۵ کاتب اصغر بن محمد عبدالعزیز تاریخ کتابت ۱۴ ر دسمبر ۱۸۹۸ء بہ مقام غازی پور ؛

(۱۰) 'مجالسِ رنگین'۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔

(۱۱) 'امتحانِ رنگین' تاریخ تصنیف ۱۲۳۲ھ۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۶ - تعداد اوراق ۲۴۔ قلمی نسخہ مصنف سنہ کتابت ۱۲۴۶ھ بہ مقام باندہ۔ تاریخ کتابت تحریر نہیں۔ مجموعہ 'نورتن رنگین' کا یہ ساتواں حصہ ہے ؛

(۱۲) اخبار رنگین[۶]۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۷ تعداد اوراق ۴۰ - قلمی نسخہ مصنف سنہ کتابت ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ ۔

(۱۳) 'ششِ جہاتِ[۷] رنگین' قلمی نسخہ انڈیا آفس تاریخ کتابت ۷ تا ۲۶ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ بہ مقام دہلی ؛

---

[۵] 'مجموعۂ رنگین' کے خانے پر، رنگین نے اس دیوان کو 'نورتن رنگین' کا پانچواں حصہ ہی بتایا ہے ؛

[۶] اس کے متعلق رنگین لکھتے ہیں: "در ہندی زبان نثر مسجع و مقفٰی حکایات عجائب کہ از گوش شنیدہ و از چشم خود دیدہ بطور اخبار آں را نوشتہ ام"

[۷] تفصیل کے لیے دیکھیے ص۱۷۷ و ۲۸۱

(۱) عجائب غرائب رنگیں۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۸۶ تعداد اوراق ۴۶ تاریخ کتابت ۱۹۔ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ کاتب بانکے سنگھ ملازم نواب اسدالدولہ ممتاز الملک فیض محمد خاں۔ ۴۶ حکایات ہیں ٭

(۲) 'مثنوی مثلث رنگین'۔ 'شش جہت رنگیں' کا تیسرا حصہ۔ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۰۔ تعداد اوراق ۲۴ قلمی نسخہ مصنف۔ تاریخ کتابت ۱۴ محرم ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ ۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے ٭

(۳) چہار چمن رنگین، 'شش جہت' کا چوتھا حصہ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۱ تعداد اوراق ۳۰۔ قلمی نسخہ مصنف تاریخ کتابت ۱۹ محرم ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ اس کی چاروں مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں ٭

(۴) 'پنجۂ رنگیں'۔ 'شش جہت' کا پانچواں حصہ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۲ تعداد اوراق ۳۱۔ قلمی نسخہ مصنف۔ تاریخ کتابت ۹ ربیع الاول ۱۲۴۸ھ بہ مقام دہلی۔ اس میں پانچ قسم کے آدمیوں کے حالات ہیں اور ہر مثنوی کا طرز جدا ہے ٭

(۱۴) 'نظم رنگیں' قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۲۔ تعداد اوراق ۱۴۔ قلمی نسخہ مصنف۔ تاریخ کتابت ۲۸ صفر ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ اس میں ایک ہزار اشعار ہیں۔ کل سو حکایات ہیں۔ ایک سو شعر میں دس دس حکایات ہیں اور دس دس حکایات میں سو سو شعر ہیں اور ہر دس دس حکایات جدا بحر میں نظم ہیں ٭

(۱۵) 'داستانِ رنگین'، قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۴، تعداد اوراق ۹۴، مصنف کا قلمی نسخہ، تاریخ کتابت ۱۲ صفر ۱۲۴۹ھ بہ مقام باندہ۔ تاریخ تصنیف ۱۲۴۵ھ۔ اس میں گجرات کے سوداگر بچے کی کہانی ہے جو عجیب و غریب ہے

اور یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

(۱۶) "خمسۂ رنگین" قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۵۔ حسب ذیل تصانیف شامل ہیں:-

(۱) جنگ نامۂ رنگین' تاریخ کتابت ۲۰ جمادی الاوّل ۱۲۴۷ھ قلمی نسخہ مصنف۔

(۲) ... [۱]

(۳) نصاب ترکی' تاریخ کتابت ۱۰ محرم ۱۲۴۵ھ بہ مقام دہلی مصنف کا قلمی نسخہ، ۲۴ ورق اور ۵۰۰ شعر ہیں۔

(۴) مثنوی بہ طرز مولانا روم حسب فرمایش شمشیر خاں [۲]، تاریخ کتابت ۱۷ رجب ۱۲۴۸ھ، قلمی نسخہ مصنف

(۵) "حکایات رنگین" قلمی نسخہ مصنف۔ کتابت ۲۸ شوال ۱۲۴۸ھ بہ مقام باندہ۔

(۱۷) "جنگ نامۂ رنگین" قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۶، مصنف کا قلمی نسخہ تاریخ کتابت یکم رجب سنہ ۱۲۴۸ھ

(۱۸) "حکایت رنگین" قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۱۷۔ تعداد اوراق ۲۲۔ مصنف کا قلمی نسخہ، تاریخ کتابت ۴ رجب ۱۲۴۸ھ اس میں بدھو گل فروش اور وزیرن سبزی فروش کا واقعہ ہے جس کو رنگین نے سنہ ۱۲۳۰ھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا یہ پانصد شعر پر مشتمل ہے۔

(۱۹) "نصاب رنگیں" قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۹۸۔ مصنف کا قلمی نسخہ تاریخ کتابت ۱۴ رجب ۱۲۴۸ھ بہ مقام باندہ۔

---

[۱] فٹ نوٹ ۲ ص ۴۹ [۲] نواب باندہ کے مصاحب

(۲۰) حکایاتِ رنگین[1] مصنف کا قلمی دوسرا نسخہ موجودہ انڈیا آفس نمبر ۹۹
تاریخ کتابت ۱۰ شوال ۱۲۴۸ بہ مقام باندہ ؛

(۲۱) مجموعہ سبع سیارۂ رنگین، رنگین کی سات تصانیف کا مجموعہ ۔
مصنف کا قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۱۰۰ ۔ تعداد اوراق ۱۰۰ ۔ اس میں
حسب ذیل تصانیف شامل ہیں :۔

(۱) تصنیفِ رنگین، شاہ ولی اللہ کے فارسی رسالے کا ترجمہ بہ طور
مثنوی، مصنف کا قلمی نسخہ سنہ کتابت ۱۲۴۱ھ بہ مقام دہلی ؛

(۲) گل دستۂ رنگین، مصنف کا قلمی نسخہ، کتابت ۵ رجب ۱۲۴۹ھ
بہ مقام دہلی مثنوی در ہندی در قیدِ تجنیس پند و نصیحت پانصد شعر تجنیس
بہ طرز اہلی شیرازی ؛

(۳) سُبحۂ رنگین (انڈیا آفس کی فہرست میں اس کا نام سنجۂ رنگین
لکھا ہے جو غلط ہے) ایک سو ایک رباعیات کا مجموعہ ۔ جس میں الٰہی بخش خاں
معروف کی ہجو ہے ۔ مصنف کا قلمی نسخہ، کتابت ۷ رجب ۱۲۴۱ھ بہ مقام دہلی

(۴) رنگین نامہ، مصنف کا قلمی نسخہ کتابت ۱۲۴۱ھ ۔ غزل کے پہلے
مصرع کے شروع میں جو حرف ہے غزل کے آخری مصرع کے آخر میں بھی
وہی حرف ہے ؛

(۵) ساقی نامہ، مصنف کا قلمی نسخہ تاریخ کتابت ۲۰ شوال ۱۲۴۸ھ
بہ مقام باندہ

(۶) تجربۂ رنگین، مصنف کا قلمی نسخہ تاریخِ کتابت ۲۵ جمادی الثانی
۱۲۴۸ھ بہ مقام باندہ ؛

---

[1] رنگین لکھتے ہیں کہ تمام مثنویاں قریب قریب بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں ؛

(۲۱) کلامِ رنگین، مصنف کا قلمی نسخہ تاریخِ کتابت ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ
به مقام بانده ؞

(۲۲) تصنیفِ رنگین، مصنف کا قلمی نسخہ نمبر ۲ انڈیا آفس نمبر ۱۰۱ تاریخِ
کتابت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ بہ مقام دہلی ؞

(۲۳) گل دستۂ رنگین، قلمی نسخہ نمبر ۲ انڈیا آفس نمبر ۱۰۲ تاریخ کتابت
۱۱ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ بہ مقام دہلی، مصنف کا قلمی نسخہ ؞

(۲۴) رنگین نامہ، قلمی نسخہ نمبر ۲ انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۔ مصنف کا قلمی نسخہ
تاریخ کتابت ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۴۸ھ

(۲۵) ساقی نامہ، قلمی نسخہ نمبر ۲ انڈیا آفس نمبر ۱۰۴ مصنف کا قلمی نسخہ
تاریخ کتابت ۵ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ بہ مقام باندہ

(۲۶) تجرباتِ رنگین، قلمی نسخہ نمبر ۲ انڈیا آفس نمبر ۱۰۵۔ مصنف کا
قلمی نسخہ۔ تاریخِ کتابت ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ بہ مقام دہلی باندہ ؞

(۲۷) کلامِ رنگین، قلمی نسخہ نمبر ۲، انڈیا آفس نمبر ۱۰۶ مصنف کا قلمی نسخہ
تاریخِ کتابت ۱۰ شعبان ۱۲۴۵ھ بہ مقام باندہ ؞

(۲۸) فرس نامۂ رنگین، انڈیا آفس قلمی نسخہ نمبر ۱۰۷۔ تاریخ کتابت ۱۱ صفر
۱۲۴۵ھ۔ کاتب نے نام نہیں لکھا۔ نہ مقامِ کتابت تحریر ہے۔ یہ فرس نامہ
کئی مرتبہ طبع ہوا (لکھنؤ ۱۸۴۹ - ۱۸۶۹) کان پور ۱۸۴۷) انگریزی
میں اس کا ترجمہ لفٹننٹ کرنل ڈی۔سی فلٹ نے کیا تھا جو ۱۹۱۱ء میں
لندن میں طبع ہوا

(۲۹) متفرقات، مجموعہ قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر ۱۰۸۔ مصنف کا قلمی نسخہ
سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ بہ مقام باندہ۔ اس میں حسب ذیل تصانیف شامل ہیں:-

(۱) قوت الایمان، ۹ ورق سنہ ۱۲۵۰ھ
(۲) ترجمہ قصیدہ غوثیہ، ۷ ورق سنہ ۱۲۵۰ھ
(۳) ترجمہ قصیدہ بانت سعاد، ۱۲ ورق سنہ ۱۲۵۰ھ
(۴) نسخہ درستی قصیدہ مرزا رفیع سودا بہ موجب فرمایش شمشیر خاں[1] فوراً در یک جلسہ، ورق ۴

(۳۰) مثنوی 'مہ جبین و نازنیں'، یہ قصہ مہ جبین شہزادہ اور نازنیں رانی سری نگر کا ہے جو دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے

ہماری داستان کا آغاز رنگین کے سیاسی اور سماجی ماحول کے تجزیے سے ہوتا ہے جو باب اوّل کا موضوع ہے۔ اس میں اورنگ زیب کی وفات سے سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ آخری مغل فرماں روائے دہلی کی تخت نشینی تک کے اہم سیاسی واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے ملک کی ابتر سیاسی اور سماجی حالت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی واقعات کی جھلک جس طرح شعر و ادب میں نظر آتی ہے اسے بھی پیش نظر رکھا ہے خاص طور پر شہر آشوب میں جس طرح اس دَور کی عکاسی ملتی ہے اس کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ان نمونوں سے یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں شرفا کو زوال ہوا، کمینوں کو عروج نصیب ہوا۔ عیش پرستی، خود غرضی اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ قدرتی طور پر اخلاقی اقدار کا ان حالات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا چنانچہ علم و فن کی ناقدری نے باکمالوں پر رزق اور عافیت کے دروازے تنگ کر دیے۔ امن و امان کی تلاش میں سرگرداں پھرنے والے ارباب علم و فن اس ناقدری پر مرثیہ پڑھتے ہیں کبھی دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ کبھی خود بھی اس طوفان میں بہ نکلتے ہیں اور اس سے شعر و ادب میں جو بے راہ روی یا کج روی پیدا ہوتی ہے وہ نظر انداز

---

[1] مصاحب نواب باندہ اور رنگین کے دوست

نہیں کی جا سکتی۔ اس پس منظر کو کسی قدر تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ رنگین کی زندگی اور شاعری کے نقوش اس کے بغیر پوری طرح اُجاگر نہیں ہو سکتے ؛
اس کے بعد حیاتِ رنگین' کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ رنگین نے میر تقی میر یا مصحفی کی طرح اپنی سوانح عمری خود نہیں لکھی ہے اور اس عہد کے تذکروں میں شاعروں اور ادیبوں کا حال بھی بہت کم لکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر کے بارے میں بھی ہماری معلومات بالعموم اس قدر تشنہ ہیں کہ ہم اکثر تاریخ ولادت تاریخ وفات ذاتی زندگی اور شاعر کی تہذیبی و مجلسی تفصیلات بہ مشکل تلاش کر پاتے ہیں۔ رنگین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اب تک رنگین کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیلات انڈیا آفس کے کتب خانے کے مرتب نے مہیا کی تھیں[1]۔ ان تفصیلات کا ماخذ رنگین کے وہ اُردو فارسی دیباچے ہیں جو انھوں نے اپنے کلام پر تحریر کیے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دیوانوں، مثنویوں، مختلف نظموں، قطعاتِ تاریخ، منظوم مکاتیب، 'مجالسِ رنگین'، 'اخبارِ رنگین'، 'جنگ نامہ رنگین'، 'سبحۂ رنگین' اور دوسری تصانیف میں بہ کثرت ایسے داخلی اشارے موجود ہیں جن کی مدد سے رنگین کی زندگی کی مزید تفصیلات مہیا کی جا سکتی ہیں چناں چہ ان کی مدد سے رنگین کے خاندانی حالات ان کے بہن بھائیوں کے نام اور تفصیلات، بچپن کی تعلیم و تربیت، مشاغل، سیر و سفر، شادی بیاہ، آل اولاد احباب و متعلقین کے بارے میں بہت سی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور پہلی مرتبہ رنگین کی تصویر کے یہ خد و خال نمایاں ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے مذہبی معتقدات، تفریحی مشاغل، سپاہیانہ زندگی، احباب سے ان کے تعلقات، طوائفوں سے ان کی دلچسپی سب کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس طرح رنگین کی جو تصویر

---

[1] زیرِ عنوان 'دیوان ریختہ' نمبر ۸۷ فہرست مخطوطات انڈیا آفس صفحہ ۹۴

ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک مردِ پاک باز کی نہیں ہے لیکن چوں کہ اس کی بنیاد ناقابلِ تردید داخلی شہادت اور رنگینؔ کے اپنے اعترافات پر ہے اس لیے اس کی تاریخی اور سوانحی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حیاتِ رنگینؔ کے اس حصّے کو زیادہ طول دیا جاسکتا تھا۔ لکھنؤ میں شاہ زادہ سلیمان شکوہ کے دربار اور اس کے شاعرانہ ماحول پر تفصیل سے لکھا جاسکتا تھا، لیکن ان موضوعات پر اب اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اس کا صرف اشارہ کافی سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح رنگینؔ نے جن مقامات کا سفر کیا ہے، جن لوگوں سے ان کے تعلقات قائم رہے ہیں ان کا ذکر بھی اختصاراً سے کیا گیا ہے کہ اس مقالے کا موضوع رنگینؔ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی جگہ ان کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ تھا۔ اسماء الرّجال[1] کے عنوان سے البتہ ایک اشاریہ ایسا دے دیا گیا ہے جس سے رنگینؔ کی مختلف تصانیف سے ان کے متعلقین و متوسلین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس سوانحی اور تاریخی پس منظر کے بعد مقالے کا ادبی اور تنقیدی حصّہ شروع ہوتا ہے جس میں سب سے پہلے رنگینؔ سے پہلے اُردو زبان، شاعری اور ادب کے سرمایے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ موضوع بہ جائے خود نہایت اہم تفصیل طلب اور ہنوز کسی قدر تشنۂ تحقیق ہے، لیکن تناسب اور موضوع متعلقہ کے پیشِ نظر صرف اہم مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور تحقیق و تنقید میں جدید ترین تحقیقات پیشِ نظر رکھی گئی ہیں تاکہ یہ حصّہ بھی افادی نقطۂ نظر سے صحیح اور درست ہو۔ اس کا اندازہ کتابیات پر نظر ڈالنے سے بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما کے بعد دکن اور پھر شمالی ہند میں اُردو شاعری اور ادب کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ پر تفصیل سے اظہارِ خیال

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۴۸۹

کیا گیا ہی اور یہ سلسلہ رنگینؔ کے دور پر لا کر ختم کر دیا گیا ہی۔ یہ حصّہ مناسب اختصار کے باوجود مکمّل ہی اور تمام اہم متعلقہ مسائل پر محیط ہی جس سے اردو شاعری کی مختلف اصناف کا اس سرمایے سے اندازہ ہو جاتا ہی جو رنگینؔ کو ورثے میں ملا تھا۔ اس تمہید کے بعد رنگینؔ کے کلام پر بحث شروع ہوتی ہی۔ مقالے کا باقی حصّہ جو رنگینؔ کی تصانیف کے جائزے پر مشتمل ہی رنگینؔ کے غیر مطبوعہ مسودات پر مبنی ہی جن میں سے اکثر و بیش تر ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور بلاشبہ نہایت مستند ہیں۔ رنگینؔ کا یہ دل چسپ، اہم اور مستند کلام نظم و نثر فارسی و اُردو پہلی مرتبہ قلمی مسودات سے نکل کر تحقیق و تنقید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہی ؁

رنگینؔ کی تصانیف میں بعض ایسی اہم دستاویزات ملتی ہیں جو ان کی زندگی اور ماحول کے بارے میں نہایت اہم ماخذات ہیں۔ ان میں 'مجالسِ رنگین' ایک مرتبہ شائع بھی ہو چکی ہی، لیکن 'مجالس' کا جو نسخہ رنگینؔ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہمیں دست یاب ہوا ہی وہ مطبوعہ نسخے سے کسی قدر مختلف ہی۔ چناں چہ اس مقالے میں مجالس کے اس قلمی نسخے کو ہی پیشِ نظر رکھا گیا ہی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم قلمی نسخہ 'اخبار رنگین' کا ہی۔ اس سے اس زمانے کے ماحول، تہذیبی زندگی اور معاشرتی حالات کا بڑا اچھا اندازہ ہوتا ہی اور اس طرح یہ اہم دستاویز نہ صرف رنگینؔ کے بارے میں ہی ایک اہم ماخذ ہی بلکہ اس عہد کے ایک عمومی تبصرے کے لیے بھی اسے ایک اہم بنیاد قرار دیا جا سکتا ہی۔ ان کے علاوہ رنگینؔ کی ایک اور اہم مثنوی 'جنگ نامہ' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی جس میں جنگ پاٹن میں رنگینؔ نے اپنی شرکت کا حال لکھا ہی۔ رنگینؔ صرف صاحبِ قلم ہی نہ تھے صاحبِ سیف بھی تھے اور اس جنگ میں وہ تماشائی کی حیثیت سے شریک نہیں ہوئے تھے۔ فنونِ سپہ گری میں ان کے کمالات کا اندازہ کچھ تو اس 'جنگ نامہ' سے ہوتا ہی

اور کچھ اس دوسری اہم تصنیف سے جو 'تجربۂ رنگین' کے نام سے لکھی گئی ہو اس میں رنگین نے اپنی فوجی اور سپاہیانہ تربیت کا حال لکھا ہو اور پھر مختلف آلاتِ حرب کی تفصیل دے کر ان کا استعمال، ان کی نگہ داشت اور مرمت پر ماہرانہ تبصرہ کیا ہو۔ اسی طرح گھوڑوں کی پہچان اور ان کے علاج معالجے پر ایک اور رسالہ 'فرس نامہ' کے نام سے لکھا ہو۔ ان تمام تصانیف نثر و نظم پر بھی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ جو متفرق کلام ہو اسے ایک الگ باب کا موضوع بنایا گیا ہو۔

رنگین ایک کثیر اللسان صاحبِ کمال تھے اور کم از کم سترہ زبانوں پر انھیں ایسا عبور حاصل تھا کہ وہ ان میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ترکی ان کی آبائی اور خاندانی زبان تھی۔ چناں چہ انھوں نے ترکی اشعار کے علاوہ اس کی ایک لغت بھی لکھ ڈالی۔ فارسی اس عہد تک ادبی اور علمی زبان تھی۔ اس میں ان کی دست رس اور لیاقت فارسی نظم و نثر کے مجموعوں سے ظاہر ہو۔ عربی پر جو قدرت تھی اس کا اظہار بھی جابہ جا ہوا ہو، لیکن خاص طور پر قصیدہ 'بانت سعاد' اور 'قصیدہ غوثیہ' کے تراجم سے پتہ چلتا ہو کہ وہ عربی میں بھی استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے تھے جہاں قدرتی طور پر پنجابی سے واقفیت کا موقع ملا۔ مرہٹہ سرداروں سے تعلقات نے مرہٹی سکھائی۔ دلّی کے قیام میں برج اور پوربی سے واقف ہوئے۔ اب تک عام خیال تھا کہ اس اعتبار سے انشا ایک دل چسپ شخصیت ہیں کہ ان کے کلام میں مختلف زبانوں کے آثار ملتے ہیں اور 'دریائے لطافت' ایک اہم لسانیاتی تصنیف ہو۔ لیکن رنگین کے کلام سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہ اس میدان میں اپنے تمام معاصرین بلکہ سابقین و متاخرین سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ 'مجموعۂ رنگین'

سے رنگین کی زبان دانی کے اس پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

اس طرح نہایت اہم اور قلمی دستاویزوں کی شہادت سے سعادت یار خاں رنگین، ان کے عہد اور تصانیف کے نقش و نگار تیار کیے گئے ہیں۔ رنگین نے اپنی تصانیف کی تعداد ۳۲ بتائی ہے اور ہمیں فخر ہے کہ ہم نے یہ ۳۲ تصانیف دریافت کر لیں۔ رنگین خوش قسمت ہیں کہ ان کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی بیش تر تصانیف اب تک زمانے کی دست برد سے بچی رہیں ورنہ میر و سودا، میر حسن مصحفی، انشا اور جرأت کی طرح بہت ممکن تھا کہ ان کا بھی بڑا حصہ ضائع ہو جاتا اس کتاب میں جستہ جستہ نقوش اور اقتباسات سے ان کے تعارف اور انھیں کسی قدر ثبات دینے کی جو کوشش کی گئی ہے اور اس پر جس محنت سے کام کیا گیا ہے اس کا اندازہ آئندہ اوراق میں نظر آئے گا، ممکن ہے ان کی اہمیت کے پیش نظر کبھی ان تصانیف میں سے سب نہ سہی کچھ منتخب کلام کسی صاحب ذوق کو اس کی ترتیب و اشاعت کا خیال دلا دے اور اس طرح رنگین کو وہ درجہ مل سکے جس کے وہ مستحق تھے۔

یہاں رنگین کی خود نوشتہ تصانیف کے املا کے بارے میں بعض اشارے ضروری ہیں۔ رنگین کی زبان مادری ترکی تھی وہ اپنے آپ کو عربی، فارسی اور اُردو کا عالم بلکہ علامہ بتاتے ہیں لیکن ان کی تحریر میں املا کی بہ کثرت "غلطیاں" موجود ہیں۔ انھیں "غلطی" صرف اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان الفاظ کی از روئے اصل جو املا ہے رنگین نے کہیں کہیں اس سے انحراف کیا ہے۔ قدیم دکھنی دور میں یہ بات بالکل عام تھی کہ عربی فارسی الفاظ جب اُردو میں لاتے تھے تو اکثر ان کا املا اُردو میں ان کے صوتی تلفظ کے اعتبار سے اختیار کرتے تھے۔ مثلاً ملا وجہی نے اپنی 'سب رس' (مطبوعہ انجمن ترقیٔ اُردو مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق) میں "وضع" کو "وضا" اور "وزا"، "نفع" کو "نفا"، "مرصع" کو "مرصا" اور جمعرات کو

"جمیرات" لکھا ہی۔ رنگین کی بعض غلطیاں تو اس قسم کی ہیں لیکن کہیں کہیں انھوں نے واقعی زیادتی کی ہو مثلاً کثیر کی جگہ کسیر، صدا کی جگہ سدا، ثروت کی سروت، تانیث کی جگہ تانیس، انصرام کی جگہ انسرام لکھا ہو ان کی مختلف کتابوں میں اس طرح "املا" کے تصرفات کی مثالیں حسب ذیل ہیں:-

رنگین کا املا	مروجہ املا	رنگین کا املا	مروجہ املا
'دیوان ریختہ'		قضاقی	قزاقی
بلکل	بالکل	تانیس	تانیث
تبل	طبل	معنّس	مؤنّث
فورن	فوراً	مثلً	مثلاً
ترجیہ	ترجیح	نستالیق	نستعلیق
اطوار	اتوار (دن)	زرافت	ظرافت
'اخبار رنگین'		امتحان رنگیں	
منحنی	منہنی	فورن	فوراً
ذکات	زکوٰۃ	بوقویش	بوقوعش
جحاز	جہاز	کسیرالانعام	کثیرالانعام
خصوص	خصوصاً	'فرس نامہ'	
حیضہ	ہیضہ	قواید	قواعد
'مجالس رنگین'		'مہ جبین و نازنین'	
ریاعت	رعایت	ثمرن	سمرن
سقہ	ثقہ	گھڑ	گرڈ
محمد غوس	محمد غوث	سدا	صدا (آواز)

رنگین کا املا	مروجہ املا	رنگین کا املا	مروجہ املا
ہواس	حواس	'مثنوی' دستان رنگین'	
توس قزہ	توس قزح	عرض	ارض
'مواجد رنگین'		انسرام	انصرام
صواب	ثواب	تشنیہ	تشنیع
کسافت	کثافت	'مجموعۂ رنگیں'	
ساالیس	سائیس	ملاذم	ملازم
'تجربۂ رنگین'		یاقوب بیگ	یعقوب بیگ
سروت	ثروت	⁘	

اس مقالے کی تیاری کے سلسلے میں سب سے زیادہ مجھے انڈیا آفس لائبریری کے ارباب انتظام کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے وسیلے سے مجھے رنگین کے کلام کے اس نادر ذخیرے سے استفادے کا موقع ملا، نیز پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کے لائبریرین ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔ اے' ڈی۔ لٹ اور اسسٹنٹ لائبریرین محترم جناب مولوی نذیر احمد صاحب خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی ذمہ داری پر یہ کتابیں مجھے ملیں۔ یہ مقالہ شروع سے آخر تک ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایم۔ اے' پی ایچ۔ ڈی کی نگرانی میں لکھا گیا جنھیں یونی ورسٹی نے نگراں مقرر کیا تھا' میں ڈاکٹر صاحب کی خصوصی توجہ کا مرہون منت ہوں' ان کی فاضلانہ تحقیق و تدقیق سے مجھے بہت مدد ملی۔ اس کام کی تکمیل کے دوران میں مجھے وقتاً فوقتاً مولانا ظہور الحسن صاحب سیوہاروی اور مولانا عبدالصمد صاحب صارم استاد عربی اورینٹل کالج سے بھی مفید مشورے ملے ہیں۔ ان کا بھی شکر گزار ہوں ⁘

صابر علی خاں

باب اوّل

رنگین کا سیاسی اور سماجی ماحول

سعادت یار خاں کی ولادت ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء میں ہوئی اور انھوں نے ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں وفات پائی۔ اس طرح انھوں نے بارھویں صدی کے نصف آخر اور تیرھویں صدی ہجری کے نصف اوّل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ زمانہ سیاسی سماجی اور معاشی اعتبار سے ایک طرف جس قدر پُر آشوب اور ہنگامہ خیز گزرا ہے اتنا ہی دوسری طرف علمی اور ادبی تاریخ میں ایک نہایت اہم دَور ہے کیوں کہ اس زمانے میں اُردو شاعری کا مرکز دکن سے شمالی ہند میں منتقل ہوتا ہے اور اگلی ایک صدی میں دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ شمالی ہند کے بعض دُوسرے مشہور شاعر بھی شہرت پاتے ہیں۔ درد (ولادت ۱۱۳۳ھ) سوز (ولادت ۱۱۳۳ھ) میر (ولادت ۱۱۳۷ھ) میر حسن (وفات ۱۲۰۱ھ) مصحفی (ولادت ۱۱۶۴ھ) سودا (ولادت ۱۱۲۵ھ) انشاء وغیرہ سب اس دَور میں نظر آتے ہیں۔ اس دَور کے پہلے کے اساتذہ ولی (وفات ۱۷۰۸ء) آبرو (وفات ۱۱۶۳ھ) ناجی (وفات ۱۱۵۶ھ) خان آرزو (وفات ۱۱۶۹ھ) مظہر (وفات ۱۱۹۴ھ) اور حاتم (وفات ۱۱۹۶ھ) اس دَور کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ شاعروں کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو زمانہ سیاسی اعتبار

سے انتہائی زوال اور انتشار کا تھا وہ شعر و ادب کے حق میں نہایت خیال انگیز اور ترقی کا دور ثابت ہوا۔

سیاسی ماحول کی تفصیل یہ ہے کہ اورنگ زیب نے ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔ اورنگ زیب کا زمانہ خود بڑی سیاسی کش مکش میں گزرا تھا۔ دکن کی طویل فوج کشی نے خزانہ خالی کر دیا تھا۔ اور ان لڑائیوں میں اکثر قابل اور آزمودہ کار لوگ مارے جا چکے تھے۔ سلطنت اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ مرکز کی کمزوری کی بدولت دور دراز صوبوں میں مضبوط انتظام قائم رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ شمالی ہند میں وہ طاقتیں جنہیں اکبر اور اس کے جانشینوں نے کسی نہ کسی طرح اپنا معاون بنا لیا تھا۔ اب مغلوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی کوشش میں تھیں۔ خاص طور پر راجپوت جنہیں سیاسی اور معاشی اعتبار سے اکبر اور اس کے جانشینوں کے سامنے جھک کر نہایت ذلت نصیب ہوئی تھی اس کا بدلا لینا چاہتے تھے۔ دکن میں ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ یہ مرہٹے تھے۔ جنہوں نے اورنگ زیب کی وفات سے پہلے اور بعد ایک عرصے تک ہندستان کی سیاسی فضا میں بڑی ابتری پھیلائے رکھی۔ سیواجی (ولادت مئی ۱۶۲۷ء) دکن کے سرداروں اور دلی کے شہنشاہوں کے لیے دردِ سر بنا رہا اور اپنی وفات ۱۴ اپریل ۱۶۸۰ء تک اس نے نہ صرف مرہٹوں کی طاقت کو ایک سیاسی اہمیت دے دی۔ بلکہ مغلیہ سلطنت پر ایک ایسی ضرب کاری لگائی جس کا اندمال کسی طرح نہ ہو سکا۔ اگرچہ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو آخری شکست دے دی لیکن اس مدت میں جو تخریبی کارروائی مرہٹے کرنا چاہتے تھے وہ کر چکے تھے۔

مصیبت یہ ہوئی کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب کے تین بیٹے معظم (ولادت ۱۰۵۳ھ مطابق ۱۶۴۳ء) اعظم (ولادت ۱۰۶۳ھ مطابق ۱۶۵۳ء) اور محمد کام بخش (ولادت ۱۰۷۷ھ مطابق

۱۷۰۷ء) تھے۔ عالم گیر کی وصیت یہ تھی کہ تینوں بیٹے مملکت کے بیس صوبوں کو آپس میں تقسیم کر لیں لیکن مُلک گیری کی ہوس نے اورنگ زیب کی اس وصیت کو ناکام بنا دیا اور تینوں شہزادوں نے تلوار سے اپنے اپنے حق کا فیصلہ کرنا چاہا۔ جانشینی کے لیے اس جنگ میں اعظم اور کام بخش دونوں مارے گئے اور طرفین کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ اس طرح ۱۷۰۷ء میں معظم دو سال کی جدّوجہد کے بعد مغلیہ سلطنت کا وارث قرار پایا۔ لیکن سلطنت کو جو گھُن لگ چکا تھا، اس کا علاج معظم بھی نہ کر سکا۔ اس کے عہد میں بھی خود غرضی، سازش، سازباز اور جتھے بندی اپنا رنگ دکھاتی رہیں۔ جس تخت کو معظم نے دو بھائیوں کا خون کر کے حاصل کیا تھا وہ اسے پانچ سال سے زیادہ نصیب نہ ہوا۔ اور ۱۸ فروری ۱۷۱۲ء مطابق ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جانشینی کے لیے اس کے بیٹوں میں جھگڑا شروع ہو گیا اور اور اس کی بدولت معظم کی لاش ایک مہینے تک لاہور میں پڑی رہی۔ پھر دفن ہونے کے لیے دہلی بھیجی گئی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا اندازہ محمد ہادی کامور خاں کے اس بیان سے ہو سکتا ہے: "وفات[۵] کی خبر سنتے ہی شاہی لشکر میں ابتری پھیل گئی اور ہر طرف شور و غوغا بلند ہوا۔ امراء اور سرکاری عہدہ دار رات کی تاریکی میں اپنے خیموں سے باہر نکل گئے تاکہ کسی ایک شہزادے کے ساتھ شامل ہو جائیں بعض لوگ ایسے تھے جو کسی جتھے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان میں کچھ سپاہی بھی تھے۔ اور ان سب پر بڑی سراسیمگی کا عالم طاری تھا اور ان میں سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہ لوگ اپنے اہل و عیال کو لے کر شہر میں پناہ لینے کے لیے چلے گئے۔ چوروں، اُچکوں کی بن آئی اور آزادی سے انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ سڑکوں پر ایسی بھیڑ ہو گئی کہ راستہ چلنا دشوار تھا اور لوگوں کو مکانوں میں بھی پناہ کی جگہ نہیں ملتی تھی۔

---

[۵] 'تاریخ چغتائی' بحوالہ 'تاریخ ہند' جلد ہشتم صفحہ ۱۹ از سر ایم۔ ایچ۔ ایل بیٹ۔

لوگ گھبرا کر دوکانوں میں گھسنے لگے تھے ۔ عزیز اور رشتہ دار بھی اپنے اقربا کو پناہ نہ دے سکتے تھے ۔ شہزادوں کے لشکروں میں سخت بے چینی تھی اور امراء میں سے کسی کو اپنی زندگی کی خیر نظر نہیں آتی تھی ۔ سپاہیوں نے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ شروع کیا، اس سلسلے میں سخت ہنگامہ ہوا ۔ اور دوسرے ملازمین بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے یہ لوگ گالی گلوج کرتے اور ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے ۔ نہ باپ اپنے بیٹوں کو بچا سکتے تھے اور نہ بیٹے اپنے والدین کو پناہ دے سکتے تھے ۔ ہر شخص اپنی مصیبت میں ایسا گرفتار تھا کہ بالکل قیامت کا دن معلوم ہوتا تھا"۔

معظم کا جانشین جہاں دارشاہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں زوالِ سلطنت کے وہ تمام آثار پیدا ہوگئے تھے ۔ جو محمد شاہ کے عہد میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے ۔ خزانہ خالی تھا لیکن جہاں دارشاہ کے اسراف کا یہ حال تھا کہ اس کی تفریح کے لیے مہینے میں تین مرتبہ دلی میں چراغاں ہوتا تھا۔ جس میں اس قدر روغن صرف کیا جاتا تھا کہ اس کا کال ہی پڑ گیا پھر اس کی جگہ گھی استعمال ہونے لگا اور وہ بھی ناپید ہوگیا۔ سپاہی اپنی تنخواہوں کے مطالبے کے لیے جنگ کر رہے تھے لیکن شہنشاہ اپنی عیاشی پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے پر لگا ہوا تھا۔ عیاشی کی ایک مثال یہ ہے کہ جہاں دارشاہ نے ایک ادنیٰ درجے کی عورت لال کنور سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ جسے "امتیاز محل" کا لقب دیا گیا اور اسے وہ تمام دولت بخش دی گئی جو جہاں دارشاہ نے اپنے مرحوم بھائیوں عظیم الشان اور جہان شاہ کے لشکروں سے ضبط کی تھی ۔ لال کنور کے رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدے دیے گئے ۔ انھیں اپنے دروازوں پر نوبت نقارے رکھنے کی اجازت دی گئی ۔ ان کے جلوس کے آگے آگے نوبت بجتی تھی لال کنور کے تین بھائی قسمت خاں، نامدار خاں اور خانہ زاد خاں کے خطابات

سے سرفراز کیے گئے۔ شہر کے امراء اور شرفاء کے محلات ضبط کر کے ان کو بخش دیے گئے۔ مشہور مورخ ہادی کامور خاں لکھتا ہے کہ "اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ باز کے آشیانے میں چغد آباد ہیں اور بلبل کی جگہ زاغ نے لے لی ہے" اس زمانے میں ملتان کی صوبے داری پر ایک گویا نعمت خاں کو مقرر کیا گیا اور جہاں دار شاہ نے اس کی منظوری دے دی۔ نعمت خاں کے تقرر کے احکام ذوالفقار خاں کو صادر کرنا تھے۔ اس نے اس باب میں کچھ دیر لگائی تو نعمت خاں نے اس سے جلد حکم صادر کرنے کا مطالبہ کیا۔ ذوالفقار خاں نے ایک ہزار ستار بہ طور تحفہ طلب کیے۔ نعمت خاں اس طنز کو نہ سمجھ سکا اور اس نے دو سو ستار واقعی پیش کر دیے۔ ذوالفقار خاں کو ایک ہزار کی تعداد پر اصرار تھا۔ آخر نعمت خاں نے جہاں دار شاہ سے شکایت کی تو اس نے ذوالفقار خاں سے دریافت کیا کہ اتنے ستاروں کی کیا ضرورت ہے۔ ذوالفقار خاں نے جواب دیا کہ جب جہاں پناہ نے گویّوں اور ڈھاڑیوں کو صوبے کی صوبہ داری اور حکومت کے اعلیٰ عہدے بخشنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو امراء اور شرفاء کے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہ تلوار اور سپر اُتار کر رکھ دیں اور ستار نوازی اختیار کریں۔ چناں چہ انھیں کے لیے یہ ستار جمع ہو رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شاہی محل جلسۂ نشاط میں تبدیل ہو گیا اور محل میں کمینوں کا ہجوم ہونے لگا۔ جہاں دار شاہ زیادہ عرصے تک اس عیاشی کو نہ دیکھ سکا اور فرخ سیر کے ہاتھوں اسے بھی وہی انجام نصیب ہُوا جو خود جہاں دار شاہ کے بھائیوں کا ہُوا تھا۔ سیّد حسین علی خاں اور سیّد عبداللہ خاں سادات بارہہ کی مدد سے فرخ سیر نے جہاں دار شاہ کو شکست دی۔ جہاں دار شاہ مارا گیا اور فرخ سیر اس شان سے دارالخلافہ میں داخل ہوا کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار تھا اور عبداللہ خاں

پیچھے مورچھل ہلا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھی پر جلاد ایک بانس پر جہاں دار شاہ کا سر علم کیے ہوئے تھا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ اور اس کے وزیر ذوالفقار خاں کی لاشیں محل کے سامنے میدان میں پھینک دی گئیں۔ جہاں تین دن تک وہ اسی حالت میں پڑی رہیں۔ اس طرح اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۳ء تک چھ سال کے مختصر عرصے میں یہ تیسرا خونی انقلاب تھا جو دلی والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

فرخ سیر ساداتِ بارہہ کی مدد سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر سادات بارہہ اپنے آپ کو بادشاہ گر سمجھنے لگے اور اُن کی وجہ سے دلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے مغل شہزادے بدلتے رہے۔ فرخ سیر کا انجام یہ ہوا کہ اسے نہایت بے آبروئی کے ساتھ اندھا کر کے قید کر دیا گیا اور آخر ۱۷۱۹ء میں وہ مرگیا یا مار ڈالا گیا۔ اس عرصے میں دلی خانہ جنگی میں مبتلا رہی۔ دربار میں مختلف جماعتیں تھیں اور مختلف امیر اپنا اپنا اقتدار جمانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ سازشوں کا زور تھا نااہلوں کو فروغ ہو رہا تھا۔ سکھوں کی طاقت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مرہٹے بھی آہستہ آہستہ شمالی ہند تک آپہنچے تھے۔ ادھر آگرہ اور دلی کے نواح میں جاٹوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ حالات اسی طرح خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کا عہد آپہنچا۔ یہ بادشاہ جو رنگیلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے عیاشی اور عیش پرستی کی آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے زمانے میں دلی میں بڑی افراتفری تھی۔ عمالِ حکومت ملکی انتظام قائم رکھنے کے بجائے ڈاکوؤں اور لٹیروں کے سرپرست تھے۔ ملک میں امن و امان کا نام تک نہ تھا۔ سارے پیشہ ور پریشان حال تھے۔ اس کا اندازہ ان شہر آشوبوں سے ہوتا ہے جو اس کے بعد سودا وغیرہ نے لکھے۔ سودا کے مشہور شہر آشوب کا پہلا بند یہ ہے ؎

کہا یہ آج میں سودا سے کیوں ہے ڈانواڈول | پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کا جواب ہیں دو بول | اگر کہوں ہیں تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول[۵۳]

دلی کے یہ حالات تھے کہ نادر شاہ بلائے آسمانی بن کر نازل ہوا اور نادر گردی کے بعد دلی ایسی ویران ہوئی کہ پھر شرمندۂ تعمیر نہ ہو سکی۔ لوگ اس حملے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ روہیلوں کا زور ہوا۔ ان کے استیصال کے لیے بہت کچھ کوشش کی گئی۔ مرہٹوں سے بھی مدد لی گئی۔ اور اس طرح مرہٹے دلی کے قریبی علاقے تک پہنچ گئے۔ مرکز کی اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف صوبے تقریباً خودمختار ہو گئے۔ جن میں دکن اور اودھ کے صوبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دلی کے ویران ہونے کے بعد ان صوبوں میں نسبتاً امن وامان زیادہ تھا۔ خاص طور پر اودھ جو دلی سے قریب تر تھا، دلی والوں کے لیے جائے پناہ بن گیا اور دلی کے شاعر، ادیب، طبیب اور علوم و فنون کے ماہر آہستہ آہستہ ترکِ وطن کر کے فیض آباد پہنچنے لگے جو اس وقت سلطنتِ اودھ کا دارالخلافہ تھا۔ اس کے بعد آصف الدولہ نے لکھنؤ کو مرکز بنایا۔ تو یہی رونق لکھنؤ منتقل ہو گئی اور شاعری کی وہ شمع جو دلی میں روشن تھی اب لکھنؤ میں جگمگانے لگی۔ ان دو بڑی سلطنتوں کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی تھیں جو ابھر رہی تھیں۔ ان میں فرخ آباد اور روہیلوں کی ریاست بھی تھی جہاں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو پناہ ملی۔

ادھر دکن کی سیاست میں ایک نئی تبدیلی ہوئی۔ مرہٹوں کا زور توڑنے کے لیے حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے جدوجہد شروع کی۔ لیکن اب ہندستان کی سیاست کی بساط پر کئی نئے مہرے آ چکے تھے، جس میں پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز قابلِ ذکر ہیں

۵۳ "کلیاتِ سودا" جلد اول صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ نول کشور ۱۹۳۲ء سنہ ۵۳ ۳۹ ۱۷ء

ان تینوں میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ ہوتی رہی اور آخر کار انگریز فتح یاب ہوئے۔ ان انگریزوں نے دیسی ریاستوں کے نظم ونسق میں دخل دینا شروع کیا۔ اس کا سلسلہ دکن سے شروع ہوا اور سلطان ٹیپو نے مزاحمت کی لیکن دوسری ریاستوں نے ٹیپو کی امداد نہ کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ سرنگاپٹم کے محاصرے میں ۱۲۱۳ھ میں سلطان کو ناکامی ہوئی۔ اس دن ٹیپو کی شکست گویا ہندستان کی پہلی شکست تھی اور انگریزوں کی یہ کامیابی اس کامیابی کا پیش خیمہ تھی جو انھیں ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں حاصل ہوئی اور جس کے بعد وہ عملی طور پر ہندستان کے ایک حصے کے مالک ہو گئے۔

جس سال رنگین پیدا ہوئے اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابدالی[1] نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دے دی۔ لیکن خود دلی پہ جو کچھ گزرا[2] اس کا چشم دید حال میر تقی میر اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"شام کے بعد منادی ہوئی کہ بادشاہ نے امان دے دی ہے لیکن رات کا کچھ حصہ گزرنے ہی پایا تھا کہ شہر میں قتل وغارت کا بازار گرم ہو گیا۔ صبح ہونے تک بے انتہا کشت وخون ہوا۔ لوگوں کا مال واسباب لوٹا گیا۔ عزتیں برباد کی گئیں اور ان کے گھروں کو آگ لگائی گئی۔ عورتوں اور بچّوں کی چیخ پکار سے شہر میدانِ محشر بنا ہوا تھا۔ تیسرے دن جا کر نظم قائم ہوا۔ لوگ دانے دانے کو ترس گئے، تمام راستے بند تھے اور کاروبار بالکل معطل ہو چکے تھے۔ بہت سے لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی اور ایک بڑی مخلوقِ خدا ان ظالموں کے شکنجۂ قید میں گرفتار ہوئی۔

الغرض ہر طرف ایک سراسیمگی کا عالم تھا۔ شہر اُجاڑ، مکانات تباہ اور بستیاں ویرانوں میں بدل گئیں۔ شرفا اور امرائے شہر در بہ در خاک چھانتے

---

[1] ۱۷۶۱ء [2] ۱۷۵۶ء ملاحظہ ہو فارسی عبارت، ذکرِ میر صفحہ ۸۵ تا ۸۸ مرتبہ مولوی عبدالحق

پھرتے تھے۔ عورتوں کی عزت سر بازار لوٹی جاتی تھی۔ اور ہر طرف گلی کوچوں میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ آگے چل کر میر صاحب لکھتے ہیں کہ میرا حال نہ پوچھو۔ پہلے ہی سے فقیر مصیبت زدہ تھا۔ اس ابتری نے بالکل بدحال اور مفلس کر دیا اور اکثر عزیز و اقارب اس حادثۂ عظیم کے شکار ہوئے"۔

ابدالی کے جانے کے بعد شاہ عالم[1] بادشاہ ہوا لیکن اس کے زمانے میں سلطنت اور ضعیف ہوتی گئی۔ شاہ عالم کو غلام قادر روہیلہ نے اندھا کر دیا۔ اور محلات میں ایسا ظلم و ستم ہوا جس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ اس زمانے کے حالات کو شاہ عالم نے خود ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ یہ ان کے اندھے ہونے کے بعد کا کہا ہوا مرثیہ ہے۔ جسے مولوی ذکاء اللہ نے نقل کیا ہے اس کا آغاز یوں ہوتا ہے

چہ[2] حادثہ برخاست پئے خواری ما ۔۔۔ داد برباد سرِ برگ جہاں داری ما

لیکن غلام قادر نے جو کچھ کیا تھا، اسے اس کا بدلا ملا۔ چناں چہ مرہٹوں نے میرٹھ کے قلعہ میں غلام قادر کو گھیر لیا اور ۲۱ دسمبر ۱۷۸۸ء کو اس پر سخت حملہ کیا غلام قادر کسی طرح قلعہ سے نکل بھاگا لیکن پکڑا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی اس کے بعد لاش قیمہ قیمہ کر کے بادشاہ کے روبرو پیش کر دی گئی[3]۔

شاہ عالم کا جانشین اکبر شاہ ثانی ہوا۔ لیکن اس کی سلطنت برائے نام تھی دلی کے قلعہ تک میں ریزیڈنٹ کا حکم چلتا۔ قلعہ کا حال ذکاء اللہ اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"اس[4] نے انگریزوں کے خلاف سازش کرنا چاہی مگر یہ راز کھل گیا قلعہ میں بادشاہ کو کل اختیار تھا۔ وہاں انگریزی حکومت کو مداخلت نہ تھی اس لیے اس کی

---

[1] ۱۷۵۹ء [2] "تاریخ ہندستان" از ذکاء اللہ جلد نہم و دہم صفحہ ۳۴۳، ۳۴۴

[3] "تاریخ ہندستان" از مولوی ذکاء اللہ دہلوی صفحہ ۳۴۲

[4] " " " " صفحہ ۳۴۶

عجب کیفیت تھی۔ سارے شہر کے بدمعاش اس میں گھسے رہتے تھے۔ شہر سے
مال چُرا کر لے جاتے تھے۔ قلعہ میں کھلے بازار بیچ کر کھا جاتے۔ لاوارث لڑکوں
اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے جاتے اور وہاں دام کھرے کر لیتے۔ ڈگری دار مارے مارے
پھرتے۔ قرض دار وہاں مزے اڑاتے۔ شہزادے عجب عجب حرکتیں کرتے کبھی
مال چُراتے کبھی کسی کو قتل کرتے۔ کبھی کسی کو مارتے کسی کو پیٹتے، آپس میں لڑتے
اس کے زمانے میں سوائے بدمعاشوں کی سازشوں کے کوئی اور بات نہیں واقع
ہوئی۔ تعظیم و تکریم اس کی اور نام بادشاہت کا اور قلعہ کی حکومت قائم رہی "
اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا اور اس پر نہ صرف مغلیہ
خاندان بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مئی ۱۸۵۷ء تک جو
ہنگامہ ہُوا اس میں بالآخر انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ لیکن ہماری داستان اس سے
کچھ پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ رنگین نے ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں وفات پائی
اور بہادر شاہ اس کے دو سال بعد ۲۸۔ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء
کو تخت نشین ہوئے تھے۔

رنگین کی زندگی کے حالات و واقعات

رنگین نے میر تقی میر کی طرح اپنی مستقل سوانح عمری خود نہیں لکھی ہے لیکن اپنے
کلام نظم و نثر میں انھوں نے اپنے متعلق بعض تفصیلات مہیا کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے
کہ ان کے والد کا نام طہماس بیگ خاں تھا اور وہ توران کے رہنے والے تھے۔
طہماس بیگ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کی فوج کے ساتھ آئے۔ رنگین کے قول کے مطابق
اس وقت ان کی عمر سات سال کی تھی[1]۔ ظاہر ہے سات سال کی عمر میں طہماس بیگ

[1] فارسی دیباچہ دیوان ریختہ، قلمی نسخہ تاریخ کتابت ۹ ربیع الثانی ۱۲۴۹ھ مطابق ۲۹ جلوس محمد اکبر شاہ
بادشاہ موجودہ انڈیا آفس لائبریری نمبر D ۱۰۱ ۱۸۷۸ ورق ۲

سپاہی کی حیثیت سے نہیں آئے ہوں گے۔ بلکہ اپنے کسی عزیز کے ساتھ ہندستان پہنچے ہوں گے۔ یہاں پہنچ کر دہلی میں مقیم ہوئے اور ترقی کر کے ہفت ہزاری کا منصب اور اعتقاد جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طہماس بیگ خاں کو ایک سفارتی مہم پر روانہ کیا تھا[1]۔ رنگین کی تحریروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد نے نام و نمود کے ساتھ اس قدر دولت بھی حاصل کر لی تھی کہ ان کی اولاد نے اپنا بچپن عیش و عشرت میں گزارا اور ان کی تعلیم ہر طرح مکمل ہوئی۔ خاندانی پیشہ سپاہ گری تھا۔ اس لیے اولاد کو بھی اس کی تربیت دی گئی۔ طہماس بیگ نے خاصی طویل عمر پائی تھی اور ۱۲۱۷ھ[2] میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت رنگین کی عمر ۴۷ سال کی تھی۔

رنگین لکھتے ہیں کہ میں ۱۱۷۰ھ[3] میں سرہند میں پیدا ہوا۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ سرہند میں رنگین کا خاندان کب اور کس طرح مقیم ہوا۔ رنگین کے علاوہ طہماس بیگ کے کئی اور لڑکے لڑکیاں تھیں جن کا ذکر رنگین نے اپنی تصانیف میں بار بار کیا ہے۔ ان میں اپنے بڑے بھائی صوفی اللہ یار بیگ خاں کا ذکر رنگین نے ہر جگہ نہایت ادب کے ساتھ کیا ہے[4]۔ معلوم ہوتا ہے کہ صوفی اللہ یار بیگ مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ اور انھوں نے شاہ جہاں آباد میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جس کی تاریخ 'امتحان رنگین' میں رنگین نے نظم کی ہے جس سے سن تعمیر ۱۲۲۸ھ برآمد ہوتا ہے۔

دوسرے بھائی خدا یار خاں تھے۔ جو رنگین سے چھوٹے تھے اور جن کا انتقال ۱۲۱۳ھ[5] میں ہوا۔ تیسرے بھائی کا نام محمد یار خان تھا[6] جو اپنے والد کے ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۹۰ مجلس ۲۲ [2] مجموعہ رنگین، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۱۸۵/ ۱۸۲۵ یہ تاریخ کتابت ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۴۹ھ بدست خط مصنف ورق ۴۹ ب۔ اس موقع پر رنگین نے اس مصرع سے تاریخ وفات نکالی ہے

۶ بہ گو خدا ایشان بیامرزید

[3] دیباچہ دیوان ریختہ قلمی نسخہ انڈیا آفس ورق ۲ [4] مجالس رنگین، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری ورق ۲۲

[5] دیوان ریختہ، ورق ۹۵/ ۱ [6] اخبار رنگین، خبر نمبر ۲۸، ۴۹، ۵۴

سفارتی مہم پر بھی گئے تھے۔ ان کے علاوہ رنگین نے ایک چچازاد بھائی مرادبیگ خاں[۱] کا بھی ذکر کیا ہے۔ گھریلو زندگی کے متعلق رنگین نے خود بہت کم لکھا ہے۔ مجموعۂ رنگین میں اپنی ایک بیٹی محمدی خانم کے تولّد کی تاریخ میں لکھتے ہیں :۔

؎ بہ خانہ اہل خانہ دویم بندہ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین نے کم از کم دو شادیاں ضرور کیں لیکن کسی بیوی کا نام یا حال نہیں ملتا۔ البتہ اولاد کا بار بار ذکر ہے۔ ان کا ایک بیٹا نواب یار خاں ۱۲۱۴ میں پیدا ہوا اور ۱۲۱۷ میں وفات پا گیا اس کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ[۲] خانم تھا :۔

ایک اور بیٹے کا نام مرزا علی یار عرف نواب یار خاں ثانی تھا۔ اس کی ولادت کی تاریخ بھی 'مجموعہ رنگین' میں ہے۔ ایک اور بیٹا اختیار خاں تھا، جس کی پیدائش کی تاریخ 'دیوان ریختہ' میں ۱۲۰۱ھ ہے ؎

چوں تولّد گشت اختیار خاں   از خرد تاریخ جستم بے خلل
گفت تاریخش بہ لفظ اختر است   شد طلوع اختر از برج حمل

ایک بیٹی محمدی خانم اور تھی جس کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا :۔

ایک نواسہ بھی تھا۔ جس کا ذکر 'مجموعۂ رنگین' میں کیا گیا ہے۔ اس کا نام یعقوب بیگ عرف آغا مرزا تھا جو کسی جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ ایک اور بیٹا نصرت یار خاں تھا :۔

گھریلو زندگی کے متعلق رنگین نے خاموشی اختیار کی ہے۔ لیکن گھر سے باہر کی زندگی کی خاصی تفصیلات ملتی ہیں۔ رنگین نے بچپن کی تعلیم و تربیت کا حال 'تجربۂ رنگین' میں اس طرح بیان کیا ہے :۔

---

[۱] 'مجالس رنگین' مجلس ۳۱۔ [۲] 'مجالس رنگین' مجلس ۱۹ [۳] تاریخ تولّد 'مجموعہ رنگین' میں ہے۔

"اور باپ میرا یعنی محکم الدولہ طہماس بیگ خاں اعتقاد جنگ بہادر رومی[1] وہ شخص تھا کہ نادر شاہ کے لشکر میں دس برس رہا اور اپنے باپ سے تعلیم ہوا تھا۔ جب وہ ہندستان میں آیا اور اسے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ثروت اور اولاد عنایت فرمائی تو مجھے اور میرے بڑے بھائی یعنی نواب معتقد الدولہ صوفی الہٰ یار بیگ خاں بہادر شہادت جنگ رومی کو کہ ہم دس دس بارہ بارہ برس کے تھے تو چار گھڑی رات باقی رہے سے اُٹھا کر اور لشکر سے باہر لے جا کر گھوڑوں پر اور پا پیادہ کر کے ہر ایک فن سے آگاہ اور آراستہ کرتا تھا اور ہر ہتھیار کے باندھنے اور رکھنے اور برتنے سے تعلیم کرتا تھا۔ پھر صبح کے ہوتے ہی لشکر میں آکر اپنے درباری امورات کی درستی کرتا تھا۔ باوصف اس فراغت اور حشمت کے سب طرح کی مشقت اور محنت اُٹھا کر ہر ہر قسم کی ہم دونوں کو تعلیم کرتا تھا اور کوئی فن سپاہ گری کا اس سے باقی نہ رہا تھا کہ جس سے اسے بہ خوبی آگاہی نہ تھی۔ سوائے بانک اور پٹا اور لکڑی اور کشتی اور کٹار اور تیم وغیرہ کے کس واسطے کہ یہ چیزیں ولایت میں نہایت کم ہیں"۔

اس کے بعد رنگین نے دہلی میں قیام کیا اور پندرہ[2] سال کی عمر سے نظمیں لکھنا شروع کیں۔ اس وقت دہلی میں شاہ حاتم کی استادی کا شہرہ تھا چناں چہ یہ بھی ان کے شاگرد ہو گئے اور سترہ سال کی محنت کے بعد ۱۲۰۲ھ میں اپنا پہلا دیوان 'دیوان ریختہ' کے نام سے مکمل کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پیشہ کے اعتبار سے یہ سپاہی تھے۔ چناں چہ 'جنگ نامہ' میں وہ اسمٰعیل خاں[3] کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وہ ہم سارے مغلوں کا سردار تھا"۔ چناں چہ

---

[1] 'مجربہ رنگین'، قلمی انڈیا آفس ورق $\frac{1}{3}$ب [2] فارسی دیباچہ 'دیوان ریختہ'، 'دیوان ریختہ' انڈیا آفس لائبریری [3] ساکن نارنول

یہ اسمعیل خاں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے پاٹن[1] کے قریب پہنچے اس لڑائی کا حال رنگین نے 'جنگ نامہ' میں تفصیل سے لکھا ہی۔ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ رنگین جس رسالے میں شریک تھے۔ اسے جنگ میں بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کے ہاتھ سے شکست کھا کر اسمعیل خاں گجرات کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے جودھ پور پہنچے اور رنگین ملازمت ترک کرکے بھرت پور چلے آئے۔ یہ واقعہ جنگ پاٹن (۱۲۰۲ھ) کا ہی۔ اگلے دو سال رنگین نے بھرت پور میں گزارے وہاں سے وہ لکھنؤ پہنچے۔ اس اعتبار سے لکھنؤ پہنچنے کا زمانہ ۱۲۰۴ھ کے قریب قرار پاتا ہی۔ یہاں پہنچ کر شہزادہ سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ اس زمانے کے حالات نہایت تفصیل سے اپنی تصانیف میں لکھتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ رنگین میر و شکار میں بھی شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادے نے انھیں اپنے خزانے کا منتظم بھی مقرر کیا تھا۔ رنگین آزاد منش آدمی تھے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے لیے ان کی معمولی تنخواہ کفایت نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے خزانے سے بہت سا روپیہ غبن کرکے خرچ کرلیا تھا۔ لیکن بعد میں خود اس کا اقرار کرلیا اور شہزادے نے معاف کردیا۔ 'جنگ نامہ' سے یہ پتہ چلتا ہی کہ انھوں نے نو سال لکھنؤ میں قیام کیا اور آصف الدولہ کی وفات (۲۸، ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ) کے بعد وہ لکھنؤ سے باہر نکلے۔ اس زمانے میں انھوں نے مرشد آباد، ڈھاکہ اور بنگال کی سیر کی۔ اس سے جی بھر گیا تو گوالیار چلے آئے اور کھانڈو جی[2] سندھیا کے ملازم ہوگئے۔ اس زمانے میں ایک بڑے علاقے کی سند انھیں مل گئی۔ اس میں کونچ سے لے کر جھانسی

---

[1] قریب جے نگر [2] کھانڈو جی

تک اور دیُوگڑھ سے ہانسی تک کا علاقہ شامل تھا۔ اس میں اٹیر، بھنڈ اور گجرا بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ نوابی کا خطاب اور ایک کمپو یعنی فوجی کیمپ کمان لینے ملا۔ علاقے کی آمدنی میں سے اپنا خرچ اور کمپو کے اخراجات نکال کر باقی رقم خزانے میں داخل کرنا پڑتی تھی۔ اس زمانے کو یاد کرکے 'جنگ نامہ' میں لکھتے ہیں :-

مہیّا جو یہ مجھ کو اسباب تھا   کہاتا ئیں اس جا پہ نواب تھا

زمانہ موافق ہوا ایسا آ   کہ جو ئیں نے چاہا وہی ہوگیا

ایک اور تصنیف 'تجزیۂ رنگین' میں اس زمانے کی تفصیلات اس طرح لکھی ہیں :-

"کہ[۱] بہ حسب اتّفاق (۱۲۱۵ھ) ایک ہزار دو سو پندرہ میں یہ عاصی کھنڈ و مرہٹے کی طرف سے کرور رُپے کی مِلک کا مستاجر تھا اور پانچ کنپو اور بادن پاگاہ یعنی بادن رسالے سواروں کے اور دس علی غول اور تین چار سو ضرب توپ کا وہ مالک تھا اور پانچ کنپو اور دس علی غول اور سواروں کی فوج میں پانچ سردار تھے۔ ہر ایک سردار کے سپرد ایک ایک کنپو اور دو دو علی غول اور دس دس پاگاہ اور توپ خانہ اور بیس بیس لاکھ رُپے کا ملک سپرد تھا یعنی ہر ایک سردار اپنے ملک کو تحصیل کرکے اپنی فوج کی طلب تنخواہ دے کر باقی سرکار میں پہنچا دیتا تھا۔ ایک سردار مستر جبس اور دوسرا کوٹ جہنگایہ دو فرنگی تھے اور تیسرا شیخ کلب علی خاں اور چوتھا کرنیل محمد زمان خاں اور پانچواں بندہ تھا۔ گوہد سے لگا قریب کالپی اور کونچ اور جھانسی سے لگا اٹیر اور بھنڈ اور سمتھر اور امیٹھ اور بلادہ اور گجرا اور دیوگڑھ اور جیہ گاؤں وغیرہ یہ مقامات سب میرے سپرد تھے اور

---

[۱] 'تجزیۂ رنگین'، ورق ۴۹ ب

ہر ایک سردار ان پانچوں میں سے صاحب دستخط اور مختار اپنے کام کا تھا کسی کو کسی سے کچھ سروکار نہ تھا "

اس طرح رنگین نے چھ سال گوالیار میں گزارے لیکن "جنگ نامہ" سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اور وہ اس ملازمت کو ترک کر کے گوالیار سے چل پڑے۔ پہلے میر افضل علی خاں نیاز کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہاں سے مختلف شہروں میں گھومتے پھرے۔ ایک دفعہ سفر حج کا بھی ارادہ کیا لیکن جہاز کے سفر میں ایسی تکلیف ہوئی کہ رستے ہی سے لوٹ پڑے تیس سال تک آزاد زندگی گزارنے کے بعد ۱۲۴۳ میں باندہ پہنچے۔ لکھتے ہیں[۵]

نیں ایک جا پہ دل کو لگاتا نہیں | مجھے رہنا ایک جا کا بھاتا نہیں
چلا اب ہانڈ سے ہی میرا بس گیا | کہ باندہ میں ہوں آن کر پھنس گیا
برس دو سے اس جا پہ پابند ہوں | میں پابند ہوں لیک خورسند ہوں

باندہ میں انھوں نے خاص طور پر شمشیر خاں کی صحبت سے لطف اٹھایا۔ اور یہاں انھوں نے اپنے کلام کے مختلف مجموعے اپنے قلم سے لکھے ہیں جن میں سے بیش تر انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

رنگین کے علم و فضل کا حال ان کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے وہ بہ یک وقت کئی زبانوں پر قادر تھے اور ان میں نظم و نثر لکھ سکتے تھے۔ ان میں اردو، فارسی، پنجابی، برجی، گجراتی، مرہٹی، پشتو، عربی اور ترکی شامل ہیں۔ انھوں نے صرف ان زبانوں کے الفاظ ہی اپنے کلام میں استعمال نہیں کیے ہیں بلکہ مستقل نظمیں کئی کئی زبانوں میں لکھی ہیں اور اس اعتبار سے جہاں تک مختلف زبانوں کے عالم ہونے کا تعلق ہے اردو کا کوئی دوسرا شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۵۔ اخبار رنگین، نمبر ۴۷ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۸
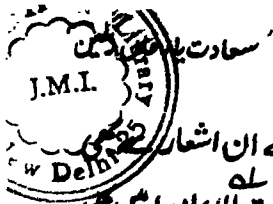
ان کے حنفی المذہب ہونے کی تائید مدح اصحاب کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جو ان کے کلام میں جابہ جا ملتے ہیں۔ اور رسالہ 'قوت الایمان'[1] میں بھی جن مسائل کو بیان کیا ہے وہ حنفی فقہ کے مطابق ہیں اور رنگین نے اسے اپنا مذہب بنایا ہے۔

'سبع سیارۂ رنگین' کے پہلے حصہ 'تصنیفِ رنگین' میں بھی حنفی ہونے کے متعلق اس طرح کہا ہے[2]

میرا مذہب ہے مذہب حنفی — سب پہ روشن ہے یہ جلی و خفی
چاروں مذہب کو جانتا ہوں حق — لیک بھاتا ہے مجھ کو اس کا نسق

رنگین نے ایک مرتبہ ہاتھیوں کی تجارت بھی کی تھی لیکن ان کا زیادہ وقت سیر و سیاحت، امیروں کی مصاحبت، شکار اور شاعری میں صرف ہوا۔ یہ تفصیلات رنگین کی اور تحریروں کے علاوہ 'اخبار رنگین' اور 'مجالس رنگین' میں نہایت تفصیل سے ملتی ہیں۔

'جنگ نامہ' کی تصنیف (۱۲۴۵) کی تصنیف کے بعد وہ چھ سال اور زندہ رہے لیکن اس آخری زمانے کے حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ کیوں کہ رنگین کی تصانیف یہاں آکر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ حالات ان تصانیف میں ہیں وہ اس سے پہلے کے ہیں۔

رنگین کے تعلقات ہر طرح کے لوگوں سے تھے۔ جن میں امیر، وزیر، تجار، شاعر سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ان کی تحریروں میں بے شمار طوائفوں کے نام بھی آئے ہیں۔ جن میں سے بعض سے اپنے تعلقات کا انھوں نے اعلانیہ اعتراف کیا ہے۔ اور ان حالات کو اس طرح بیان کیا ہے، گویا وہ اسے معیوب نہیں سمجھتے۔ رنگین کی زندگی کا یہ پہلو ان کی شاعری پر بے حد اثر انداز ہوا ہے اور ریختی

---

[1] صفحہ ۲۶۳ ملاحظہ ہو [2] 'تصنیفِ رنگین'، ورق ۲ب

یا ہنرل کے جو نمونے ملتے ہیں وہ بڑی حد تک انھیں صحبتوں کا نتیجہ ہیں۔ اور انھیں صحبتوں میں انھوں نے عورتوں کی خاص زبان، ان کے محاورے اور خاص خاص رسموں، ریتوں کا علم حاصل کیا ہے۔ ان کے تجربات اعلیٰ درجے کی اخلاقی قدروں کے حامل نہ سہی بعض اوقات دل چسپ ضرور ہیں اور اس عہد کی تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات تعجب خیز نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان طوائفوں کی صحبت میں رنگینؔ کو رقص یا موسیقی سے کوئی دل چسپی پیدا نہیں ہوئی، جس کی ایک مثال ہمیں واجد علی شاہ کے یہاں ملتی ہے۔ اس سے صرف ایک نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ رنگینؔ نہ صرف آزادمنش بلکہ کسی حد تک آوارہ مزاج تھے۔ اور ان عورتوں سے ان کے تعلقات نہایت سطحی جنسی قسم کے تھے۔ ان عورتوں کی ایک کثیر تعداد کا ذکر اور ان سے تعلقات کی نوعیت خود رنگینؔ نے جابہ جا بیان کی ہے۔ اور بجائے کسی اشارہ یا کنایہ کے صاف گوئی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ رنگینؔ نے بعض ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو اعلیٰ درجے کی حکیمانہ اور صوفیانہ ہیں۔ خاص طور پر مولانا روم کی مثنوی سے وہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جن کی تقلید میں انھوں نے خود مثنوی معنوی کے انداز کی مثنوی اُردو فارسی میں لکھی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ رنگینؔ نے صرف زمانے کی ایک رسم کو پورا کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔ کیوں کہ اس قسم کی بعض مثنویاں اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی لکھی ہیں۔ میر حسنؔ کی مثنوی 'رموز العارفین' (۱۱۸۸) اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ زمانے کے حالات و واقعات نے ان کو اس طرح متاثر کیا ہو کہ اپنی رنگین زندگی میں ایک لمحے کے لیے

رُک کر جب انھوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا ہو تو انھیں خود اپنے اعمال، افکار اور اشعار پر ندامت ہوئی ہو۔ بہ ہر حال اس قسم کی نظموں کے محرکات خواہ کچھ ہی ہوں ان کے وجود سے رنگین کی زندگی کا ایک ایسا پہلو سامنے آجاتا ہے، جو کسی حد تک ان کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ کسی داخلی یا خارجی شہادت سے یہ قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ رنگین زندگی میں عشق و عاشقی کے کن مراحل سے گزرے تھے لیکن 'شش جہتِ رنگین' کے پانچویں حصہ 'مخمسِ رنگین' میں اپنے بھائی خدایار خاں کو ایک خط لکھتے ہوئے دلی کی صحبتوں کو یاد کرتے ہیں۔ اور اپنی ایک محبوبہ کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام ان کے بھائی کو معلوم ہے۔ اس مجموعے میں لکھنؤ سے ایک خط الہی بخش کو لکھا ہے جس میں اپنے ایک فرنگی عورت پر عاشق ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان مثالوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کے عشق کی نوعیت کس قسم کی ہوگی۔ اور وہ شہد کی مکھی بن کر ہر پھول کا مزہ چکھنے کے قائل ہوں گے۔ بہ قول غالب شیرے کی مکھی نہ ہوں گے کہ عشق میں استواری کے قائل ہوں۔

رنگین کے دوسرے مشاغل میں سپاہیانہ اعمال کے علاوہ شہسواری بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کا اندازہ ان کے رسالہ 'فرس نامہ' سے ہوتا ہے جس میں گھوڑے کی پہچان اور اس کی بیماریوں کے علاج نظم کیے ہیں۔ جن سے اس فن کے کمالات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ خیرآباد[1] سے لکھنؤ تک گھوڑے پر آئے اور فوراً واپس گئے۔ غرض ہماہمی اور رنگین زندگی بسر کرنے کے بعد اکیاسی سال کی عمر میں ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں رنگین نے وفات پائی۔ ان کے بارے میں معاصرین اور مؤرخین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی اور موقع پر نقل کیے گئے ہیں۔

---

[1] 'اخبارِ رنگین'، خبر ۹۲

باب دوم

رنگین سے پہلے اُردو شاعری کا پس منظر

کسی زبان یا ادب کی ابتداء کا مسئلہ بالعموم متنازعہ فیہ ہوتا ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ زبان کی علمی تحقیق کا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب زبان بولی کی منزل سے گزر کر ادبی اور پھر علمی زبان کی منزل میں داخل ہوتی ہے۔ یہ زمانہ بالعموم ہزار سال کا ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر بولی اور زبان کے ابتدائی نمونے یا تو تحریر میں آتے نہیں یا پھر اتنی مدت گزرنے پر ناپید ہو جاتے ہیں۔ تحقیقی دور کا آغاز ہوتا ہے تو آثارِ قدیمہ کی طرح ان کی بھی تلاش ہوتی ہے۔ کوئی لفظ، کوئی فقرہ، کوئی شعر یا نثر کا کوئی ٹکڑا دست یاب ہو جاتا ہے تو ایک نادر نمونے کی طرح اسے سینے سے لگایا جاتا ہے۔ اور اس پر مزید علمی تحقیق و تلاش کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ولی کو ریختہ یعنی اُردو غزل کا موجد اور اُردو شاعری کا بادا آدم قرار دیا گیا تھا۔ ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ[1] میں ہوئی۔ اس اعتبار سے اُردو شاعری کی عمر تین سو سال کے قریب ہوتی ہے۔ اگر اُردو کی ابتدا کے متعلق یہ نظریہ تسلیم کر لیں کہ

---

[1] ولی گجراتی، ظہیر الدین صفحہ ۸۱

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کی عربی، فارسی، ترکی اور دیسی زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو پہلے ہندوی اور بعد ازاں ہندی کہلائی اور جس نے بعد میں ہندُستانی ہندی اور اُردو کی شکلیں اختیار کیں تو ہمیں اُردو کی ابتدا کا زمانہ گیارھویں صدی عیسوی تک لے جانا پڑتا ہے۔ اور پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نو سو سال کے طویل عرصے میں ابتدائی چھ سو سال ایسے گزرے کہ اُردو شعر یا نثر کا کوئی نمونہ پیدا نہ ہوا۔ پھر ولی کی شاعری جو فنی اعتبار سے خاصی پختہ ہے۔ خود یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ کسی زبان کی شاعری کی ابتدائی کوشش ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ ولی پر ایک دَور ختم ہوا ہو اور ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہو۔ ولی کو اس نئے دَور کا نقیب یا پیش رو قرار دے سکتے ہیں ؛

جہاں تک تحقیق ہوئی ہے اُردو نثر و نظم کے قدیم ترین نمونے جو ہندوی اور ہندی کے نام سے ملتے ہیں وہ صوفیائے کرام کے ملفوظات میں ہیں۔ اور ان کا سلسلہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی (وفات ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) سے لے کر حضرت امیر خسرو (وفات رمضان ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء) تک ایسے نمونے بہ کثرت ملتے ہیں[1] جن سے زبان کی ابتدائی شکل و صورت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعری کی تاریخ کا آغاز باقاعدہ حضرت امیر خسرو سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو اپنی مشہور تصنیف 'غرۃ الکمال'[2] کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"جزوی چند نظم ہندوی نیز نثر کردہ شدہ است ایں جا ہم بہ ذکری بس کردم و نظر بر نظیر نہ داشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے نہ دارد مگر بہ ضرورت آں جا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شدہ است۔"

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے 'اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' از مولوی عبدالحق

[2] 'غرۃ الکمال' قلمی ورق ۲۴ کاتب شیخ کبیر دہلوی ذالحجہ ۹۸۲ھ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری۔

چو من طوطیِ ہندم ار راست پرسی — زمن ہندوی بپرس تا نغز گویم "

اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ خسرو نظم ہندوی کے مصنف یقیناً ہیں لیکن اس ہندوی کا کوئی مستند نمونہ خود ان کی فارسی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ان کے نام سے بے شمار چیزیں مشہور ہیں جن میں 'خالق باری' نصف ہندی و نصف فارسی غزلیں، پہیلیاں، مکرنیاں، دو سخنے، اَن مِل وغیرہ شامل ہیں لیکن ان کے سرسری مطالعے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب امیر خسرو کی تصنیف نہیں۔ مثلاً حقّے کی پہیلی ہرگز امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ تمباکو اور حقّے کا رواج ہندستان میں جہاں گیر کے عہد سے پہلے نہیں تھا۔ اس طرح 'خالق باری' کے متعلق اب یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں[۱]۔ نصف ہندی و نصف فارسی نام جو عام طور پر تذکروں میں ملتا ہے۔ اس کی قدیم ترین شہادت میر کے تذکرے (۱۱۸۸ھ، ۹۲[۲]) میں ملتی ہے جو امیر خسرو سے تقریباً چھ سو سال بعد کا ہے۔ اس نمونے میں وہ غزل شامل ہے جس کا مطلع ہے

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے[۳] نیناں بنائے[۴] بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

لیہو، کاہے اور لگائے برج کے اثر کو صاف ظاہر کرتے ہیں اور یہ اثر دہلوی کے حلقے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے ممکن ہے خسرو کی یہ غزل انھیں کی ہو۔ ایک اور قدیم شہادت مُلّا وجہی کی 'سب رس' (۱۰۴۵ھ) سے ملتی ہے جہاں امیر خسرو کا ایک ہندی شعر نقل ہے[۵]

---

[۱] 'پنجاب میں اردو' از محمود شیرانی صفحہ ۱۷۵ تا ۱۹۴! [۲] 'تذکرہ میر' ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین فیض آباد میں لکھا گیا [۳] دُرانا: چھپانا۔ دُرائے نیناں: آنکھ چھپا کر [۴] بنائے بتیاں: باتیں بنا کر [۵] 'تاریخ زبانِ اردو' صفحہ ۱۲۷ از ڈاکٹر مسعود حسین خاں

منجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ — پنکھا ہو کریں ڈولے ساقی تیرے جاؤ

غرض امیر خسرو کے کلام کا کوئی بڑا مستند اور مفصل نمونہ موجود نہ ہونے کے باوجود اس میں شبہے کی گنجایش نہیں کہ انھوں نے ہندوی یا ہندی میں کلام کہا اور یہ سلسلہ شمالی ہند میں عہدِ اکبری تک پہنچا ہے۔ اکبر کے معاصرین میں ایک بزرگ سعدی تھے۔ جن کو بعض تذکرہ نگاروں نے سعدی شیرازی اور بعض نے سعدی دکھنی لکھا ہے۔ لیکن جو دراصل کاکوری کے رہنے والے تھے اور جن کی وفات ۱۰۰۲ھ میں ہوئی۔ ان کی بھی ایک نصف فارسی و نصف ہندی غزل تذکروں میں ملتی ہے لیکن اس غزل کا مقطع تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اب تک ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلے لفظ ریختہ بہ معنی اُردو غزل استعمال کیا گیا ہے[۵]

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ — شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

امیر خسرو سے سعدی تک کم و بیش چار سو سال کا زمانہ ہے۔ لیکن اس عرصے میں اس ریختہ یا ہندوی کے نمونے شمالی ہند میں بہت کم ملتے ہیں۔ اس کا اصلی اور بنیادی سبب یہ ہے کہ فارسی دفتری اور عدالتی زبان ہونے کے علاوہ علمی اور ادبی زبان اور تہذیب و معاشرت کی ترجمان سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی جو معاشرے میں کوئی امتیاز حاصل کرنا چاہتے تھے، فارسی اختیار کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند میں ایک عرصے تک اُردو صرف روزمرہ کاروبار میں عوام کی بولی کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی۔ ادبی تحریروں کا تو ذکر کیا لوگ روزانہ نجی مراسلات اور خط و کتابت میں بھی فارسی اختیار کرتے تھے۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ شمالی ہند میں امیر خسرو سے سعدی تک چار سو سال کی مدت میں ہمیں صرف دو نام ملتے ہیں لیکن یہ دونوں نمونے اس عہد کی ہندوی شاعری یا ریختہ

کے میلانات یا رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں اظہارِ عشق عورت کی زبان سے ہوا ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ اس میں تخیل کی بلند پروازی، نازک خیالی یا مضمون آفرینی جو فارسی غزل میں پیدا ہوچکی تھی، نہیں ملتی۔ یہ رجحان بھی کسی حد تک فارسی کے مقابلے میں اس نئی غزل کے مقبول نہ ہونے کا ذمہ دار ہے۔ کیوں کہ اگلے دَور میں جب اُردو غزل نے زور پکڑا تو وہی انداز اختیار کیا جو فارسی غزل کا مقبول انداز تھا۔ بلکہ فارسی سے مضامین لیے گئے اور وہی اندازِ بیان اختیار کیا گیا۔ اُردو شعراء اپنے کلام کا مقابلہ فارسی غزل گو شعرار سے کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فارسی شعر کی تنقید کا جو معیار ہوگا اُردو شعراء اپنی غزل اسی معیار پر لانا چاہتے ہوں گے۔ یہ جذبہ کم از کم ولی کے عہد تک بے حد نمایاں ہے۔ ولی کی جب شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ تم وہ مضامین جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں ریختہ میں منتقل کر ڈالو۔ کون تم سے محاسبہ کرے گا۔ تو ذہنی طور پر یقیناً سعد اللہ گلشن اور ولی یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس طرح ریختہ کا اعتبار قائم ہوجائے گا۔ اور لوگ اسے بھی فارسی غزل کی طرح درخور اعتنا سمجھنے لگیں گے۔

لیکن دکن میں حالات مختلف تھے۔ عجمیت کا جو اثر دلّی پر تھا اس سے دکن کسی قدر محفوظ تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب دکن کا دلّی سے فاصلہ تھا۔ ایرانی شعراء اور اربابِ فضل و کمال جو ایران سے تلاشِ معاش میں آتے بالعموم دہلی سے آگے نہ بڑھتے اور ان کی وجہ سے قدرتی طور پر فارسی شاعری، زبان اور ادب کو دہلی میں بڑا فروغ نصیب ہوا۔ ان میں سے بہت کم دکن پہنچے۔ پھر دکن صوبہ دہلی سے اس قدر دُور تھا کہ

انتظامی امور میں مرکز سے زیادہ مدد کی توقع نہ تھی۔ چناں چہ انھیں حالات اور تقاضوں نے محمد بن تغلق کو مجبور کیا کہ وہ ایک دار الخلافہ دولت آباد میں قائم کرے۔ اگرچہ محمد بن تغلق اپنے ارادوں میں کام یاب نہ ہوا لیکن اس کا یہ اثر ضرور ہوا کہ دکن میں ایک خود مختار ریاست قائم ہوگئی سلطنت بہمنیہ کا قیام مرکزی حکومت سے بغاوت کا نتیجہ تھا۔ اور قدرتی طور پر سلطنت کے قیام اور استحکام کے لیے مقامی امداد پر بھروسہ کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں فارسی کی جگہ مقامی زبان کو دفتری اور عدالتی زبان قرار دیا گیا۔ اس سے اس زبان کو جو ہندوی اور ہندی کے علاوہ دکھنی بھی کہلاتی ہے، فروغ کا موقع ملا اور جس وقت شمالی ہند میں فارسی کا غلغلہ بلند تھا دکن میں دکھنی شاعر نہایت فخر اور بلند آہنگی سے اپنی زبان میں اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ یہ اُردو شاعری کا دوسرا دَور ہے جسے دکن کا دَور کہا جاتا ہے۔

دکن میں اُردو کے دَور کا آغاز سلطنتِ بہمنیہ سے ہوتا ہے۔ بہمنی دَور ۷۴۸ھ سے ۹۳۲ھ تک قائم رہا۔ اگرچہ سیاسی اعتبار سے ۸۷۵ھ[1] کے بعد سلطنتِ بہمنیہ کی جگہ پانچ خود مختار حکومتیں گولکنڈہ، بیجاپور، برار، احمد نگر اور بیدر میں قائم ہوگئی تھیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ سلطنت بہمنیہ کی سرکاری زبان ہندی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حسن بہمن نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی جو دلّی کی مرکزی حکومت سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوگئی تھی۔ اور حسن بہمن کو ضرورت کے وقت مدد دینے کے لیے مقامی امداد پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔ اس لیے شمالی ہند کی سرکاری زبان فارسی کی جگہ اس نے دکنی ہندی کو عدالتی اور دفتری زبان قرار دیا۔ اس عہد میں جن مصنفین

---

[1] 'دکن میں اُردو'، صفحہ ۳۳ از نصیر الدین ہاشمی

کا پتہ چلتا ہی۔ ان میں شیخ عین الدین[۵۱] گنج العلم کا نام سب سے پہلے ہی۔ لیکن ان کی نظم یا نثر کا کوئی نمونہ اب موجود نہیں ہی۔ دوسرے بزرگ سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں جو ۸۱۵ھ[۵۲] میں فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ پہنچے اور وہیں ۸۲۵ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی تصانیف میں سے "معراج العاشقین" انجمن ترقی اردو نے شائع کر دی ہی۔ اگرچہ کتاب میں بندہ نواز کا نام کہیں نہیں آتا ہی۔ لیکن خارجی شہادتوں سے یہ کتاب انھیں کی تصنیف معلوم ہوتی ہی۔ اس کا موضوع تصوّف ہی اور عبارت کا نمونہ یہ ہی :-

"قال نبی علیہ السلام کہے انسان کے بوجنے کوں پانچہ تن ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس اس کا امارہ یعنی واجب کے آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو، حرص کے کان سوں غیر نہ سُنا سو۔ حسد تک سوں بدبوئی نہ لینا سو بعض کے زباں سوں بد بوئی نہ لینا سو۔ کینا کے شہوت کوں غیر جا کا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا۔ نبض پچھان کو دوا دینا ؎

طبیبِ عشق را دکاں کدام است   علاج جاں کند او را چہ نام است

اس کتاب کے علاوہ اور بھی کئی تصانیف نظم و نثر کی ہیں۔ مثلاً "ہدایت نامہ"، "رسالہ سہ پارہ"، "نشاط عشق" اور "چکی نامہ"[۵۳]۔ خواجہ صاحب کے پوتے عبداللہ حسینی احمد شاہ ثانی بہمنی (۸۳۸ھ تا ۸۶۲ھ) کے ہم عصر تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کی بھی ہندی تصانیف کا ذکر کیا ہی۔ ان صوفیاء کے علاوہ اس دور کے ایک شاعر نظامی کا پتہ چلا ہی۔ جو نصیر الدین ہاشمی

---

[۵۱] اردوئے قدیم، صفحہ ۳۹ شمس اللہ قادری مطبوعہ نول کشور [۵۲] معراج العاشقین صفحہ ۱۱ مرتبہ مولوی عبدالحق مطبوعہ تاج پریس [۵۳] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۱۶۸ از محی الدین قادری

کے قول کے مطابق سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ) کا ہم عصر تھا۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی 'رتن پدم کدم راؤ' کا مصنف ہے۔ یہ دکن کی پہلی عشقیہ مثنوی

ادبی حیثیت سے دکن کا عہدِ زرّیں سلطنتِ بہمنیہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے گول کنڈہ کے سلاطین قطب شاہیہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی حکومت ۹۱۶ھ سے ۱۰۹۸ھ تک قائم رہی۔ اس دور کے قدیم ترین نمونے ابراہیم قلی قطب شاہ ۹۵۷ تا ۹۸۸ھ کے عہد میں ملتے ہیں۔ اس زمانے میں فیروز محمود اور وجہی مشہور شاعر تھے۔ فیروز کا کلام اب مل گیا ہے۔ محمود کا ذکر بعد کے شعراء نے بار بار کیا ہے۔ اور ملّا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' جو محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ کے عہد میں لکھی گئی اور مشہور نثر تصنیف 'سب رس' جو عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ کے زمانے میں ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی شائع ہو چکی ہے۔ 'قطب مشتری' ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ جس میں شہزادہ قلی قطب شاہ اور بنگال کی شہزادی مشتری کی داستانِ عشق نظم کی گئی ہے۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس پردے میں وجہی نے قلی قطب شاہ اور اس کی تلنگن محبوبہ بھاگ متی کا عشقیہ قصہ لکھا ہے۔ 'سب رس' اردو نثر کا پہلا قصہ اور پہلا ادبی کارنامہ ہے۔ اگرچہ ملّا وجہی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ قصہ انھیں کی تصنیف ہے۔ لیکن دراصل اس کا ماخذ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کا فارسی قصہ حسن و دل ہے۔[1] 'سب رس' کی عبارت نہایت مرصّع اور مقفّیٰ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی تک اردو نثر ادبی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ مولانا آزاد 'فضلی کی دہ مجلس' ۱۱۴۵ھ کو اردو نثر کی پہلی تصنیف بتلاتے ہیں۔ 'سب رس' اس سے پورے سو سال پہلے لکھی گئی۔

اس عہد کا ایک نہایت اہم کارنامہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات

[1] مقدمہ 'سب رس' صفحہ ۱۷ از مولوی عبدالحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۲ء

ہے. جو اس کے بیٹے محمد قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۲۵ھ میں لکھی ہوئی دستیاب ہوئی۔ اُردو نظم کی یہ پہلی کلیات ہے جس میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ قلی قطب شاہ کی غزل فارسی اور ہندی خیالات کا بہترین مجموعہ ہے۔ اس نے سعدی، حافظ اور خیام کا رنگ بھی اختیار کیا ہے۔ اور ان کی غزلوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندی شاعری کے انداز پر عورت کی زبان سے اظہارِ عشق کرایا ہے۔ یہی حال تشبیہات اور استعارات کا ہے۔ کلیات کا ایک بڑا حصّہ چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل ہے جس میں مناظرِ فطرت مختلف تہواروں، تقریبوں، موسموں سبزیوں، پھلوں اور پھولوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ قلی قطب شاہ کے کلام کا یہ حصّہ طبع زاد ہے اور اس سے اس خیال کی تردید ہوجاتی ہے کہ اردو شاعری سراسر فارسی کی تقلید ہے۔ یہ عہد مثنوی گوئی کے لیے خاص طور سے سازگار معلوم ہوتا ہے۔ اس دور میں غواصی نے سیف الملوک و بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ طوطی نامہ ۱۰۴۹ھ، جنیدی نے ماہِ پیکر ۱۰۶۴ھ ابن نشاطی نے 'پھول بن' ۱۰۶۶ھ میں طبعیؔ نے قصہ 'بہرام و گل اندام' ۱۰۸۱ھ میں، فائز نے قصّہ رضوان شاہ و روح افزا ۱۰۹۴ھ میں لکھا۔

سلاطینِ گولکنڈہ شیعہ تھے۔ اس لیے انھوں نے خود بھی مرثیے لکھے اور ان کے درباری شعرا نے بھی۔ مثنوی 'مصیبتِ اہلِ بیت' مصنفہ احمد کے علاوہ غواصی، لطیف، انوری، کاظم، شاہی اور مرزا کے مرثیے موجود ہیں۔ یہ سب مرثیے بالعموم چومصرع ہیں اور ان میں سیدھے سادے انداز میں واقعاتِ کربلا پر اظہارِ غم کیا گیا ہے۔

دوسری مشہور سلطنت بیجاپور کی عادل شاہی کی جو ۸۹۵ھ سے ۱۰۹۷ھ

تک قائم رہی۔ اس دَور کے مشہور مصنّف یہ ہیں :-

	مصنّف	تصنیف	سن
۱-	ابراہیم	'نورس'	۱۰۰۵ھ
۲-	شاہی	'کلیات' و مثنوی 'بدیع الجمال'	
۳-	مقیمی	'چندر بدن و مہیار'	۱۰۵۰ھ
۴-	امین	قصّہ 'بہرام و حسن بانو'	
۵-	خوشنود	'ہشت بہشت' و 'یوسف زلیخا'	۱۰۵۶ھ
۶-	کمال خاں رستمی	'خاور نامہ'	۱۰۵۹ھ
۷-	ملک الشعراء نصرتی	(۱) 'گلشن عشق'	۱۰۶۸ھ
	" "	(۲) 'علی نامہ'	۱۰۷۶ھ
	" "	(۳) 'تاریخ سکندری'	۱۰۸۳ھ
۸-	ہاشمی	یوسف زلیخا	۱۰۹۹ھ

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دَور بھی بنیادی طور پر مثنوی گوئی کا دَور ہے۔ البتہ گول کنڈہ کی عشقیہ مثنویوں کے مقابلے میں بیجاپور کے شاعروں نے رزمیہ کی طرف بھی توجّہ دی ہے۔ اس سلسلے میں 'خاور نامہ' طویل ترین رزمیہ مثنوی ہے جو عہدِ قدیم میں لکھی گئی۔

قطب شاہیہ اور عادل شاہیہ عہد سے ولی کے زمانے تک دکنی نظم و نثر نے بڑی ترقی کی۔ زبان کے اعتبار سے فارسی کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور مضامین میں بھی فارسیت کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ولی کے عہد میں پہنچ کر ہم شاعری کا ایسا نمونہ پاتے ہیں جو قدیم اور جدید دَور میں عبوری حیثیت رکھتا ہے۔ ولی اُردو شاعری کے باوا آدم نہ سہی اور

نہ وہ اُردو کے پہلے صاحب کلیات شاعر ہیں۔ بہ ایں ہمہ ان کا کلام تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو دیکھ کر شمالی ہند کے شاعروں کو فارسی کے مقابلے میں ریختہ کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ولی کی غزلیں مضمون کے اعتبار سے فارسی شاعری کے عام مضامین سے قریب تر آجاتی ہیں اور ان کے یہاں وہ تمام صنائع اور بدائع بھی استعمال ہوتے ہیں جو فارسی شاعری میں عام ہیں ہندی الفاظ ان کے کلام میں آج کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں لیکن کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو اب بھی نہایت فصیح و بلیغ سمجھا جاسکتا ہے ولی کی شاعری کے دو دور ہیں۔ ایک عہدِ قدیم جس میں دکنی عناصر موجود ہیں۔ اور دوسرا شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے کے بعد کا کلام ، شاہ صاحب نے ولی کو مشورہ دیا تھا کہ فارسی کے مضامین اور اُردوئے معلیٰ کی زبان اختیار کرو۔ چناں چہ ولی نے اس مشورے پر عمل کیا اور ان کی کلیات میں جو صاف و سادہ کلام نظر آتا ہے وہ سفر دہلی کے بعد کا ہے؛

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا آغاز

اگرچہ یہ دعویٰ درست نہیں کہ اُردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی تاہم جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دکن میں اُردو شاعری نے شمالی ہند سے پہلے اور بہت زیادہ فروغ پایا۔ اس وقت شمالی ہند میں فارسی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ممکن ہے بعض شعراء نے اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ہو۔ لیکن ایسی کوششوں کو کوئی ادبی اعتبار حاصل نہ تھا اور ایسے اشعار لوگ بہ طور تفننِ طبع لکھتے اور سنتے تھے۔ بلکہ یہ کیفیت بہت بعد تک باقی رہی کہ ریختہ گوئی کو قابلِ فخر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی اُستاد

ایک دو شعر لکھتا تو ناقدین یہ کہتے کہ ریختہ کہنا ان کے مرتبے کے خلاف ہے لیکن دو چار شعر کہ کر اس فن کو اعتبار بخشتا ہے[1] اس کا ذہنی اثر نہایت دُور رس ثابت ہوا۔ اور جب اُردُو شاعری اپنے انتہائی کمال پر پہنچ چکی تھی اُس وقت بھی اُردُو شعرا اپنے اُردو کلام کو حقیر سمجھتے تھے۔ اور اپنے مرتبے کے تعین کے لیے بار بار اپنی فارسی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ میر اور مصحفی سے لے کر مرزا غالب تک ہمیں اس ذہنیت کے واضح نشانات ملتے ہیں[2] غرض ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ شمالی ہند میں اُردُو شاعری ایک عرصے تک بڑی کس مپرسی اور بے اعتنائی کے عالم میں پڑی رہی۔ شمالی ہند میں اُردُو شاعری کا اس وقت جو حال تھا اسے بیان کرتے ہوئے قائم لکھتے ہیں :۔

" باید دانست کہ چوں فن ریختہ دراں وقت از محل اعتبار ساقط بود بناءً علیہ ہیچ کس بر توغل آں اقدام نہ می نمود واں دو سہ چار بیت گزیدے کہ بہ نام اساتذۂ معتبر مرقوم است اغلب کہ منشاءِ تکلمش ہزلے بیش نباشد "

ولی کے دہلی کے سفر اور شمالی ہند میں ان کے کلام کی شہرت کو اُردُو شاعری کی تاریخ میں ایک بڑی حیثیت حاصل ہے۔ دہلی آنے اور شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات سے پہلے بھی ولی کی اُردُو شاعری خاصی پختہ ہو گئی تھی۔ کیوں کہ وجہی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ سے ولی تک برسوں کی شاعرانہ کاوشوں اور مشاہیر شعرا کی کوششوں سے دکھنی شاعری زبان و بیان اور مضامین دونوں کے اعتبار سے ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہو گی اور

---

[1] "مخزن نکات، صفحہ ۳ از قائم مطبوعہ انجمن اردو دکن)

[2] فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ بہ گزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ایسی بے اعتبار نہ رہی ہوگی کہ لوگ اسے فارسی شاعری کے مقابلے میں لاتے ہوئے جھجک محسوس کریں یا اُردو شعراء فارسی شعراء کے مقابلے میں حقیر سمجھے جاتے ہوں۔ مختصر یہ کہ ولیؔ کو شاعری اور بالخصوص غزل کی ایک پختہ روایت ورثے میں ملی۔ اُنھوں نے اس میں اپنی شخصیت اور شاعرانہ صلاحیتوں سے اضافہ کیا۔ شمالی ہند میں ان کا ریختہ پڑھا اور سُنا گیا ہوگا تو لوگوں کو اُردو کی صلاحیتوں کا احساس پیدا ہوا ہوگا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہوگی کہ دہلی میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ عجمی عناصر اور اثرات بھی زوال پذیر ہوئے ہوں گے اور فارسی بھی انھیں عناصر اور اثرات میں شامل تھی۔ دوسرے فارسی شاعری کا جو انداز اس وقت مقبول تھا وہ بیدلؔ[1]، صائبؔ[2] اور کلیمؔ[3] کا انداز تھا۔ اس میں جس قسم کی خیال بندی، تمثیل نگاری، مضمون آفرینی اور نکتہ سنجی کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا، اس نے شاعری کو صاف اور سادہ جذبات نگاری کی بجائے ایک دقیق اور مشکل فن بنا دیا تھا۔ شاعری کے صحرائے لق و دق میں مرزا غالبؔ کو بیدلؔ کے عصا کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہی ان کا خضرِ راہ ہے۔ لوگ ایسے سہاروں اور پابندیوں سے تھک گئے تھے۔ اور ولیؔ کی شاعری نے انھیں ایک نئی دنیا کی خبر دی اور ایک نئی راہ دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کے تھوڑے ہی عرصے بعد شمالی ہند میں ریختہ گو شعراء کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہوگیا۔ جو ولیؔ کو اپنا اُستاد جانتا تھا۔ ان میں اور لوگوں کے علاوہ حاتمؔ بھی تھے۔

لیکن شمالی ہند میں اُردو شاعری آزاد ہوتے ہی ایک اور مصیبت میں گرفتار ہوگئی اور وہ مشہور مثل کہ عرش سے اُترا ببولوں میں اُلجھا اس پر صادق آئی۔ یعنی اُردو شعراء ایہام گوئی میں مبتلا ہوگئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] شعر العجم، حصہ پنجم صفحہ ۷۶ ملاحظہ ہو [2] شعر العجم حصہ سوم صفحہ ۲۰۳ ملاحظہ ہو

[3] ،، ،، سوم ،، ۲۱۲، ۲۱۷، ۲۱۹ ملاحظہ ہو۔

قائم لکھتے ہیں

"برشناسائے اسلوب سخن مخفی و محتجب نیست کہ از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانہ بہادر شاہ کسلانے کہ شعرائے ریختہ اندنسق کلام ایں ہا بسیار مربوط معقول است ہر چند کہ اگر الفاظ غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشاں است لیکن چوں موافق زبان دکن است درست است پیش ہمہ کس راہ بدہ دار دونہ ایں ستم کہ شاعراں ابتدائی زمانہ محمد شاہ با اعتقاد خود تلاش الفاظ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بمعنی چہ رسد غرض ناگفتہ بہ مصرع

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

بہ ہر حال فقیر دواوین ایں اعزّہ فراہم آوردہ اشعار جستہ جستہ بسعی تمام موافق فہم ناقص خود بہ وضع انتخاب قلمے نمودہ حق تعالیٰ توفیق کرامت فرماید"[1]

اس دور میں آبرو، مضمون، شاکر ناجی، احسن، یکرنگ وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان سب کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ شاہ مبارک آبرو کو اس دور کا نمایندہ سمجھیے۔ ان کے یہاں کلام کا یہ رنگ ہے ؎

سجا ہے نرگسی بوٹے کا جامہ	کرے کیوں کر نہ مجھ سے چشم پوشی
رہے ہے تیس دن مژگاں کے سن کھ	کلیجا آہنی ہے آرسی کا
اس ناتواں کی حالت اس جا کہے ہے اڑکر	میرا یہ رنگ رو ہے گویا لکھی کبوتر
کنجی اس کی زبان شیریں ہے	دل مرا قفل ہے بتاشے کا
لب شیریں پہ سر حسن کے نہیں خط سیاہ[2]	ڈار ٹوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

---

[1] مخزن نکات، صفحہ ۱۳، ۱۴، از قائم مطبوعہ انجمن ترقی اردو [2] سخن

ان اشعار میں سوائے رعایت اور ایہام کے، مضمون کا کوئی لطف نہیں۔ نہ ان سے کسی جذبے یا حالت یا واقعے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس زمانے کے شعراء کا بیشتر کلام اسی رنگ میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اشعار میں رکاکت اور ابتذال بھی ہے۔ امرد پرستی کے مضامین بھی ہیں۔ اور محبت کا تصور بھی کچھ جنسی لگاؤ کی طرف مائل ہے۔ رقیبوں کی کثرت ہے۔ عاشق و معشوق اکیلی گلیوں میں اندھیری راتوں میں ملتے ہیں۔ غرض غزل میں ان تمام خرابیوں کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ جن کی انتہا آگے چل کر رنگین، انشا اور ان کے معاصرین میں ہونے والی تھی۔ آبرو کے یہ اشعار دیکھیے :ـــ

گلی اکیلی ہے اور یہ اندھیری راتیں ہیں — اگر ملو تو سجن سو طرح کی باتیں ہیں

بوسہ لبوں کا دینے کہا کہ کے پھر گیا — پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

مکھن میاں غضب ہیں فقیروں کے حال پر — آتا ہے ان کو جوش جمالی کمال پر

اور مضمون[1] فرماتے ہیں :ـــ

خط آگیا ہے اوس کے مری ہے سفید ریش — کرتا ہے اب تلک بھی وہ ملنے میں شام صبح

اور ناجی کا ایک شعر ہے[2] :ـــ

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا — چلی آتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس دور میں دہلی میں شعر و شاعری کا ذوق فارسی سے اردو کی طرف پورا منتقل ہونے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک رکا ہوا سیلاب تھا۔ جو بند کے ٹوٹتے ہی امنڈ پڑا۔ دہلی کی تاریخی اہمیت یہی ہے کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہنچ کر فارسی کے مقابلے میں اردو کا سکہ جما دیا۔ جس دور کا اوپر تذکرہ کیا گیا وہ چنداں فنی اعتبار سے بہت اہم نہیں ہے۔ اور اس میں تفریح طبع کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ایہام گوئی کا شوق کچھ تو مشکل پسندی کے

[1] مجموعۂ نغز، حصہ ۲ صفحہ ۱۹۷ [2] مجموعۂ نغز، جلد دوم صفحہ ۲۵۷

شوق سے پیدا ہوا تھا اور کچھ فارسی کی صنعت تعلیل کی تقلید میں جو صائب اور بیدل کی وجہ سے عام ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی میں ولی کے اثر کے بعد شعراء کا ایک گروہ ایسا تھا جو بنیادی طور پر فارسی میں شاعری کرتا تھا۔ ریختہ میں صرف بہ طور تفنن طبع یا بہ قول تذکرہ نگاراں اس فن سے اعتبار کو اعتبار بخشنے کے لیے چند اشعار کہہ لیتے تھے۔ اور اسی لیے ان کا کلام ریختہ بہت کم ملتا ہے۔ ان لوگوں میں[۵] خان آرزو، شمس الدین فقیر علی قلی خاں ندیم، عبدالغنی قبول، ٹیک چند بہار، آنند رام مخلص، مرتضیٰ قلی فراق وغیرہ شامل تھے۔ دوسرا دور ان ایہام گو شعراء کا تھا۔ جن کا ذکر اوپر ہوا۔ ایہام گوئی متاخرین شعرائے فارسی کے یہاں بھی پائی جاتی تھی چناں چہ نعمت خاں، امیر عبدالجلیل بلگرامی اس صنعت سے خاص دل چسپی رکھتے تھے۔[۶]

ایہام گوئی کے اس شوق کے باوجود یہ دور تاریخی اعتبار سے نہایت مختصر ثابت ہُوا۔ اور شمالی ہند کے شاعر ہی اس سے بیزار ہو گئے۔ چناں چہ شاہ حاتم جو اس دور میں اُستاد کی حیثیت رکھتے تھے اور جنھوں نے برسوں کی مشق کے بعد ایک دیوان بہم پہنچایا تھا، خود اپنے کلام سے بیزار ہو گئے اور اس دیوان کو نظر ثانی کے بعد 'دیوان زادہ' کی صورت میں مرتب کیا۔ پہلا دیوان اب کہیں نہیں ملتا جو حاتم کے قدیم رنگ کا پُورا اندازہ ہو سکے۔ آزاد لکھتے ہیں[۷]:-

"کلیات ان کا بہت بڑا ہے جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد اور رباعیات اور مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ ہائے قدیم لکھنؤ اور دہلی میں دیکھا وہ

---

[۵] 'دلی کا دبستان شاعری'، صفحہ ۵۷ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی [۶] 'انڈو مغل پرشین پوئٹری' از ڈاکٹر غنی ناگ پوری میں فارسی کی ایہام گوئی کا دور ملاحظہ ہو [۷] 'آب حیات' صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ مبارک علی سنہ ۱۹۵۰ء

شاہ آبرو اور ناجی کی طرز میں تھے"[۱]

"دیوان زادہ" کے شروع میں ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں ایہام گوئی کے ترک کرنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا اظہار اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ مثلاً ؎

حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ ۔۔۔ کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش

نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا ۔۔۔ ان دنوں سب کو ہوئی ہے صاف گوئی کی تلاش

آہستہ آہستہ ایہام گوئی جس قدر ناپسند ہوئی اس کا اظہار تذکرہ نگاروں نے بار بار کیا ہے[۱]

اس دور کا ذکر کرتے ہوئے قدرت اللہ قاسم، آبرو کے ذکر میں لکھتے ہیں[۲]

"در طرز گفتار حسب رواج آں وقت بیش تر بہ ایہام گوئی صرف ہمت می نمود وجود الفاظ منکرہ و عدم موالات تنگیٔ الفاظ و جواز قافیہ سین و صواد و امثال آں در کلامش و کذلک در اشعار ما اثر انش زیادہ بر آں است کہ بہ تحریر درآید اما در شاعری ایں بزرگاں علی تفاوت المراتب ہیچ شک و شبہ نیست رواج یافتن امرے در عہد کہ مرغوب الطبع اہل عہد دیگر نہ باشد امر دیگر است"

ایہام گوئی سے اپنی بیزاری کا اظہار جن لوگوں نے کیا ہے ان میں حاتم کے علاوہ سودا، میر اور ان کے معاصرین بھی ہیں۔ چناں چہ سودا کہتے ہیں ؎

مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ ۔۔۔ اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں ۔۔۔ یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی

۱؎ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۱، ۸۷ ۲؎ مجموعۂ نغز، حصہ اول صفحہ ۲۹ از محمود شیرانی مطبوعہ سنہ ۱۹۲۲ء

قائم کہتے ہیں :-

بہ طورِ ہزل ہی قائم یہ گفت گو ورنہ   تلاش ہی یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

میر تقی میر 'نکات الشعراء' میں احسن اللہ کے کلام پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"طبعش مائل بہ ایہام بود ازیں جہت شعرا و بے رتبہ ماند"۔

ایہام گوئی کے علاوہ اس دَور کی شاعری کی بعض اور خصوصیات قابلِ غور ہیں مثلاً ایہام گوئی کے نتیجے کے طور پر اشعار میں صفائی اور سادگی اور اثر بہت کم مِلتا ہی۔ شعراء کی زیادہ تر توجہ بجائے معنی آفرینی یا مضمون آفرینی کے ذومعنی الفاظ اور ایہام پر زیادہ ہی۔ یہ ایک طرح کی شاعرانہ صناعی ہی اور اس سے شاعری میں تکلف اور آورد پیدا ہو گئی ہی۔ دُوسری بات یہ ہی کہ یہ لوگ ردیف اور قافیہ میں زیادہ احتیاط نہیں برتتے تھے۔ بہ قول آزاد :-

"اخلاص[له] کو دسواس اور دھڑ کو سر کا قافیہ باندھ دیتے تھے۔ اور عیب نہ سمجھتے تھے۔ ردیف کی کوئی ضرورت نہ تھی ـــــ محاورے کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے"۔

اِس دَور کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہندی الفاظ کی کثرت ہی ہندی کے یہ الفاظ دراصل مختلف علاقائی پراکرتوں کے وہ الفاظ ہیں جن میں سے اکثر قدیم پنجابی، قدیم دہلوی اور دکنی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً نت بہ معنی ہمیشہ، سین (سے)، نپٹ (بہت)، سُبھ (خوب صورتی)، جگت (دنیا) منیں (میں)، بھونگ (سیاہی)، سجن (محبوب)، پیتا (پیارا)، چیتر کاری (نقش) تجنا (ترک کردینا)، جگ (دنیا)، بتیا (گزرا)، نین (آنکھ)، انجھو (آنسو) بھوَل (بھوں)، ٹک (ذرا)، درس (درشن)، سانورہ (سانولا رنگ)، موہن (محبوب)

له 'آب حیات' ذکر شاہ مبارک آبرو صفحہ ۹۰

یہ تمام الفاظ آبرو کی چند غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے معاصرین کی بھی یہی زبان ہوگی۔ اور اس اعتبار سے ان کا مطالعہ زبان کی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے شیخ چاند لکھتے ہیں:-

"اس دور کے اساتذہ کا کلام اٹھا کر دیکھیے تو شاعرانہ صناعی اور ہنرمندی پر حرف رکھنے کی جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کافور ہیں۔ الفاظ کا ذخیرہ بہ افراط موجود ہے۔ ان کے استعمال اور ساقی کے مختلف پہلو روشن ہیں"

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس دور کے لوگ الفاظ کی تلاش میں خاص کاوش کرتے تھے۔ مثلاً میر تقی میر بار بار اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں مضمون کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

"ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ"[1]

میر حسن شعرائے متوسطین کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"باید[2] دانست کہ سخن سنجاں آں زماں در پیِ صنعت ایہام بودند و تلاش لفظ تازہ می نمودند"

مضمون کے اعتبار سے ہندی اور فارسی کے اثرات ملے جلے نظر آتے ہیں۔ مثلاً فارسی کے اثرات:-

عارض کے آئینے پر تمنا کے سبز خط ہے — طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے (آبرو)

کیوں چھپا ظلمت میں گر اس لفظ سے شرمندہ نہ تھا — جان تجھ پانی مرے ہے چشمۂ حیوان کے بیچ (")

دو بھواں سے لگے ہیں جس کے نین — وہ کہاتا ہے حاجی الحرمین (آبرو)

ہم[3] نے کیا کیا نہ تیرے عشق میں محبوب کیا — صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا (مضمون)

---

[1] نکات الشعراء، میر تقی میر ص۱۶۱ مطبوعہ انجمن ترقی اردو

[2] تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن صفحہ ۲۴ مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں مطبوعہ مسلم یونی ورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ

[3] آزاد لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو فارسی میں مخلص کاشی نے اس طرح باندھا ہے:-

در فراق تو چہا او بت محبوب کنم — صبر ایوب کنم گریۂ یعقوب کنم (آب حیات صفحہ ۱۰۲ ذکر مضمون)

کرے ہی دار کو کامل بھی سر تاج   ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج (مضمون)

مو کدے میں گر سراپا فعل نامعقول ہی   مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہی
(مضمون)

زلف کے حلقے میں دیکھا جب سے دانہ خال کا   مرغ دل عاشق کا تب سے صید ہی اس جال کا
(شاکر ناجی)

اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو ای جان   شمشاد و سرو آ کے تیری چاکری کرے
(شاکر ناجی)

کنوئیں میں جا پڑا یعقوبؑ کا دل   چلا جب نالہ و افغاں سے یوسفؑ
زلیخا نے بہائے شیر کے نیل   جو رو یا درد کے انجھواں سے یوسفؑ (شاکر ناجی)

فارسی کا یہ اثر جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہی، مضامین میں بیش تر اور زبان میں کم تر نمایاں ہی۔ لیکن ہندی شاعری کے وہ اثرات جو دکنی دور میں زیادہ نمایاں تھے اور جس طرح اظہارِ عشق عورت کی زبان سے کیا جاتا تھا یا تشبیہات و استعارات سے ان میں مُلکی ماحول سے زیادہ کام لیا جاتا تھا وہ روش آہستہ آہستہ ترک ہونے لگی ؂

اُردُو غزل پر اعتراض کرتے وقت اکثر یہ کہا جاتا ہی کہ اس میں امرد پرستی کے مضامین کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگ اسے اس دَور کے خاص حالات کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں :—

"نشستِ[1] الفاظ اور ہندیت کے علاوہ مجازی عشق اور امرد پرستی اس دَور کی ایک خاص خصوصیت ہی۔ جس کے سرتاج آبرؔو ہیں"

لیکن ہمیں یہ ماننے میں تامّل ہی کہ یہ اِس دَور کی نمایاں خصوصیت ہی۔ یہ دَور

---

[1] "دلّی کا دبستانِ شاعری"، صفحہ ۷۵، ۷۶، انجمن ترقیٔ اردو کراچی ۱۹۴۹ء

دراصل غزل کا دور ہے۔ اگرچہ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ آبرو نے 'آرائشِ خوباں' کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ اور حاتم کی کلیات میں بھی حُقّے کی تعریف میں ایک مثنوی ہے۔ لیکن مثنوی گوئی کا جو دور دکنی دور میں نظر آتا ہے' یہاں آکر ٹوٹ گیا ہے۔ اور میر تقی میر سے پہلے قابلِ ذکر مثنوی نگار کوئی نظر نہیں آتا ہے یہی حال قصائد کا ہے۔ دیگر اصناف میں ایک مرثیہ ہے۔ جس کے متعلق شیخ چاند لکھتے ہیں:۔

"محمد شاہ سے پہلے شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کا باضابطہ آغاز نہیں ہوا تھا صرف دکنی مرثیوں نے شاعروں کے لیے ریختہ میں مرثیہ کہنے کا رستہ صاف کر دیا تھا"[1]

اِس عہد کے مرثیہ گویوں میں مسکین، حزین اور غمگین مشہور ہیں۔ یہ تینوں بھائی تھے۔ ان کے علاوہ مصطفیٰ خاں یک رنگ' سعادت علی خاں سعادت' برہان الدین قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حاتم اور آبرو کے ہم عصر تھے لیکن سودا سے پہلے شمالی ہند میں مرثیہ گوئی فنی حیثیت سے بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ غزل میں بھی وہ خصوصیات مثلاً اثر آفرینی، جذباتیت، داخلیت، سوز و گداز، سلاست و صفائی اور تصوّف کی چاشنی جس نے دہلی کی غزل کو اس کی امتیازی کیفیت بخشی ہے' اس دور میں مفقود ہے۔

۱۱۶۹ھ میں حاتم نے ایہام گوئی کے خلاف اپنا پہلا اعلان 'دیوان زادہ' کے انتخاب سے کیا۔ چناں چہ یہاں سے اِس دور کا آغاز ہوتا ہے جسے اُردو شاعری بالخصوص غزل کا عہدِ زرّیں کہا جا سکتا ہے۔ اپنی بزرگی کی بنا پر سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں کو اس دور کا نقیب کہا جاتا ہے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے ایہام گوئی کو ترک کیا

---

[1] سودا از شیخ چاند صفحہ ۲۸۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۶ء

وہ مرزا مظہر جان جاناں ہیں۔ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں:۔

"می گویند کہ اوّل کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمود و ریختہ را در زبان اُردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروّج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر"[51]

اسی طرح تذکرہ نگاروں نے خان آرزو کی تعریف کی ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں:۔

"خاں آرزو پہلے شخص ہیں جنھوں نے ریختہ کو ایہام کے خارزار سے پاک کیا"[52]

مظہر اور خان آرزو دونوں جامع کمالات تھے۔ اور ان کی فارسی تصانیف ان کی اُستادی کا ثبوت ہیں۔ اُردو میں ان لوگوں کا کلام بہت کم دستیاب ہوا ہے۔ لیکن تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو کے بیشتر شاعر ان کے شاگرد تھے۔ مثلاً مرزا مظہر جان جاناں کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، خواجہ احسن اللہ بیان، مصطفٰے خاں یک رنگ، بساون لال بیدار، محمد فقیہہ دردمند مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ خان آرزو کے شاگردوں میں میر سب سے مشہور ہیں۔ سودا، مظہر اور درد بھی ان کو یعنی خان آرزو کو اُستاد مانتے تھے۔ ان کے علاوہ (۱) رائے آنند رام (۲) میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک (۳) مرزا داؤد (۴) میاں حسن علی بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔ غرض ان لوگوں کی کوششوں سے اُردو شاعری کو اس قدر فروغ ہوا کہ شمالی ہند میں ولی کی آمد ۱۱۱۲ھ کے بعد ۱۱۶۰ھ میں میر نے تذکرۂ 'نکات الشعراء' لکھا تو بہ کثرت شاعر اس قابل نکل آئے

---

[51] طبقات الشعراء صفحہ ۲۲، ۲۳ از قدرت اللہ شوق مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ

[52] نکات الشعراء، از میر صفحات ۸، ۱۱۲، ۱۲۶ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

جنھیں اس تذکرے میں شامل کیا گیا۔ میرؔ کے بعد جو تذکرے لکھے گئے اُن میں یہ تعداد سال بہ سال نہایت تیزی سے بڑھتی نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ اسی دَور میں میرؔ اور مرزاؔ جیسے باکمال شاعر پیدا ہوئے ؛۔

اس دَور کی خصوصیات کا جائزہ لینا دراصل اردو شاعری کے عہدِ زریں کی تاریخ کو دُہرانا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایہام گوئی کے تصنّع سے آزاد ہوتے ہی اُردو شاعری نے فطری سادگی، اصلیت اور جوش کے عناصر کو قبول کرلیا۔ میر تقی میرؔ اس دَور کی روایات کے بھرپور ترجمان ہیں۔ ان کی غزل معاملاتِ عشق کے بیان پر حاوی ہے۔ عشق و عاشقی میں جتنی کیفیات گزر سکتی ہیں جو جو حالتیں ہجر و فراق کی پیش آسکتی ہیں وہ سب میرؔ کی غزلوں میں نہایت سادہ انداز میں موجود ہیں۔ میرؔ کے کلام میں شدید قسم کی داخلیت اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ اسی نے اُن کو اُردو شعراء کا سرتاج اور اُردو غزل کا ناخدا بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات بڑے لطیف کنایوں اور استعاروں میں ادا کیے ہیں۔ تشبیہات، استعارات اور دیگر صنائع و بدائع مثلاً تجنیس، ترصیع وغیرہ استعمال کیے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر اس دَور کے شعراء کی توجہ خیال اور مضمون کی صفائی پر ہے ؛۔

اس انداز کا خلاصہ میر تقی میرؔ اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"بداں[۵] کہ ریختہ بر چندیں قسم است۔ از آں جملہ آں چہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید۔ اوّل آں کہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چناں چہ قطعہ حضرت امیر علیہ الرحمۃ نوشتہ شد۔ دوم آں کہ نصف مصرعش ہندی و نصف

---

[۵] "نکات الشعراء" از میرؔ صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۷ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

فارسی چناں چہ شعر میر معز کہ نوشتہ آمد۔ سوم آں کہ حرف و فعل فارسی بہ کار می بند و ایں قبیح است۔ چہارم آں کہ ترکیبات فارسی می آمد۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائز است و ایں را فقیر شاعر نہ می داند۔ و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمیں است۔ اگر ترکیب فارسی موافق گفت گوئے ریختہ بود مضائقہ نہ دارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعرانِ سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار برجستگی بستہ بہ شود معنی ایہام ایں است کہ لفظے کہ بر او بنائے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد یکے قریب و یکے بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او ششم انداز است کہ اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعت ہا است، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفت گو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ ایں ہمہ در ضمن ہمیں است و فقیر ہم از ہمیں وطیرہ محفوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصے است ایں معنی را می فہمد۔ با عوام کار نہ دارم۔ ایں کہ نوشتہ ام برائے یاراں من پسند است نہ برائے ہر کس زیرا کہ عرصۂ سخن وسیع است و از تلوّن چمنستان ظہور آگہم۔ ع

ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است "

اِس دَور میں ایک اور اہم عنصر جو غزل میں داخل ہوا وہ تصوّف ہے۔ تصوّف کے مضامین فارسی شاعری میں پہلے بھی بہت اہم تھے۔ اور دکنی دَور میں بھی غزلوں اور مثنویوں میں یہ عناصر موجود ہیں۔ لیکن میرؔ اور دردؔ دلے متصوّفانہ

مضامین کو غزل کا ایک نہایت اہم موضوع بنا دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا ہے کہ عشقیہ مضامین بالخصوص عشق مجازی کے معاملات و واردات کے بیان سے غزل میں رکاکت یا ابتذال پیدا ہونے کا جو خطرہ رہتا ہے اس کا سدِ باب ہو گیا اور تصوّف نے عشقیہ شاعری کی پردہ داری کر لی۔ عشقیہ شاعری کی یہی دہلوی روایت میر اور درد سے ہوتی ہوئی مصحفی اور دَورِ حاضر میں حسرت موہانی اور اصغر گونڈوی تک پہنچی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ لکھنوی شعرا نے جب اس روایت کو ترک کیا اور محض عشق مجازی کے معاملات اور متعلقاتِ حُسن کے ذِکر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تو نہ صرف یہ کہ غزل اپنی اثر آفرینی سے محروم ہو گئی بلکہ اس میں رکاکت اور فحش نگاری بھی بڑھ گئی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دہلوی شاعری رکیک مضامین سے یک سر پاک ہے اور میر و سودا کے یہاں ایسے مضامین بالکل نہیں ملتے۔ میر کے متعلق یہ فقرہ بہت مشہور ہے :-

"کہ بلندش بسیار بلند و پستش بنہایت پست"

یہ پستیٔ مضمون و بیان دونوں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ بالخصوص امرد پرستی کے مضامین اور ہجو گوئی کے رجحانات نے جگہ جگہ نمایاں کر دیا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میر اور ان کے معاصرین کو اس دَور کے سیاسی، معاشرتی اور ذاتی بحران کی وجہ سے اپنے کلام کو منتخب کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس دَور میں اُردو غزل فارسی کے مقابلے میں پوری طرح سامنے آ گئی اور فارسی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے فارسی کا ہی حربہ استعمال کیا۔ زبان میں صفائی کی جو تحریک شروع ہوئی اس میں ہندی الفاظ آہستہ آہستہ

ترک ہونے لگے اور ان کی جگہ فارسی الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے معلوم ایسا ہوتا ہی کہ بعض لوگوں نے اس معاملے میں زیادہ شدت اختیار کی تھی۔ چناں چہ سودا مظہر کے ریختے کی ہجو کہتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مظہر کا شعر فارسی اور ریختے کے بیچ	سودا الیقین جان کہ روڑا ہی باٹ کا
آگاہِ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ	واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹھ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہی یہ	اور ریختہ بھی ہی تو فیروز شاہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہی جو بیچ کہوں	کتا ہی دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریختہ میں فارسی کے دخل کے لیے بعض حدود مقرر ہیں اور شاعری کا کمال یہ ہی کہ وہ ریختہ میں فارسی کے صرف وہ الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرے جو ریختہ کے مزاج کے مناسب ہوں۔ چناں چہ میر تقی میر کی بھی یہی رائے ہی ؛

الغرض ریختہ یا اُردو غزل اس زمانے میں ترقی کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی کہ میر و سودا کے کلام کا ایک حصہ آج بھی مضمون و بیان کے اعتبار سے بالکل تازہ معلوم ہوتا ہی۔ اور میر کی غزل آبرو یا مضمون کی غزل کے مقابلے میں بے حد ترقی یافتہ نظر آتی ہی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ غزل کی روایات اس دور میں پختہ ہوئیں اور رنگین نے غزل کو اس منزل پر پایا جہاں میر نے لاکر اسے کھڑا کر دیا تھا ؛

اس دور میں غزل کے ساتھ ساتھ قصیدے کو بھی بڑا فروغ ہوا۔ قصیدہ گوئی اُردو میں فارسی کے انداز پر شروع کی گئی۔ چناں چہ اُردو میں قصیدے کا ڈھانچہ بالکل ویسا ہی ہی جیسا فارسی میں نظر آتا ہی۔ تشبیب، گریز، مدح، دعائیہ اسی طرح اُردو قصیدے کے عناصر ہیں۔ جس طرح

اردو قصیدے کے عناصر ہیں جس طرح فارسی میں پائے جاتے ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی، مضمون آفرینی، مبالغہ، تشبیہات، استعارات، ندرت، ادا، الفاظ کی بلند آہنگی، پُرشکوہ تراکیب جس طرح فارسی میں قصیدے کے لوازم ہیں اُسی طرح یہ اُردو شعراء کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ اُردو قصیدے کی تاریخ دکنی دَور سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا قدرتی سبب یہ ہے کہ شعراء درباروں سے وابستہ تھے اور سلاطین و امراء کی تعریف میں قصیدے لکھتے تھے امراء اور سلاطین نے خود بھی قصائد لکھے ہیں لیکن یہ زیادہ تر مذہبی ہیں۔ کیوں کہ انھیں کسی دنیاوی حاکم کی تعریف کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اثر سے بعض درباری شاعروں نے بھی مذہبی قصیدے لکھے ہیں۔ اگرچہ دکن میں غزل اور مثنوی کو خاص طور پر بڑا فروغ حاصل ہوا، لیکن قصیدہ نگاری بھی بڑی ترقی کر گئی۔ دکن کے قصیدہ نگاروں میں ملک الشعراء نصرتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کے قصیدوں میں اعلیٰ درجے کے مضامین موجود ہیں۔ اس کے بارے میں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :-

"[1] لیکن علاوہ مثنوی کے قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے اور اس صنف میں قدیم اُردو کا کوئی شاعر اسے نہیں پہنچتا۔ شوکتِ لفظی علوِ مضامین اور زورِ بیان جو قصیدے کی خاص صفات ہیں۔ وہ نصرتی کے قصائد میں بہ خوبی پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ نصرتی درباری شاعر تھا لیکن اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں کی مدح و ثناء تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ اس نے جنگ کے واقعات اور مظاہرِ قدرت کے بیان میں بھی بڑے پُرزور قصائد لکھے ہیں"۔

---

[1] "نصرتی"، صفحہ ۲۷۳ از مولوی عبدالحق

شمالی ہند میں ایہام گوئی کے دَور میں جو قصیدے لکھے گئے وہ اب نہیں ملتے لیکن قصیدہ گوئی کے عام رواج سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ دَور قصیدہ گوئی کے لیے زیادہ سازگار نہ ہوگا۔ قصیدے کے لیے جیسی پختہ زبان اور منجھا ہوا انداز درکار ہوتا ہے وہ اس دَور کے ریختہ میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ سوداؔ سے پہلے شمالی ہند میں کوئی قابلِ ذکر قصیدہ نگار نظر نہیں آتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سودا کے سامنے رہنمائی کے لیے اردو قصیدہ نگاروں کی جگہ خاقانیؔ، عرفیؔ اور انوریؔ نے اس کی رہبری کی ہے۔ سوداؔ کے اکثر قصیدے ایسے ہیں جو انھیں بحروں میں ہیں جن میں ان مشہور قصیدہ نگاروں نے اپنے قصیدے لکھے ہیں۔ شیخ چاند لکھتے ہیں :۔

"عرفیؔ کا ذکر سوداؔ نے اپنے کلام میں دو ایک مقام پر اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قصائد ضرور اس کے مطالعے میں رہ چکے ہیں اور ان کا اثر اس کی طبیعت پر بہت کافی پڑا ہے"[1]

سوداؔ نے ہر طرح کے قصائد لکھے ہیں ان میں سے بعض بزرگانِ دین کی تعریف میں ہیں بعض میں اہلِ دول کی مدح کی گئی ہے۔ بعض قصائد اور ہجویات ایسے ہیں جن میں اس زمانے کے تاریخی اور معاشرتی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سوداؔ کی تمام تشبیہوں میں مضامین کا تنوع، حکیمانہ خیالات ذاتی واقعات و واردات اس طرح نظم کیے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے قصیدہ نگار کی تشبیہیں ان کے مقابلے میں لائی جا سکیں۔ مدح کا مضمون بہت عام ہوتا ہے۔ اور تمام قصیدہ نگار بعض مشترک لائق فخر اوصاف کو بیان کرتے ہیں[2]۔ اور ان اوصاف میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ شیخ چاند قصائد سودا

---

[1] سودا از شیخ چاند صفحہ ۱۸۱ [2] 'سودا' از شیخ چاند صفحہ ۲۱۴

پر تفصیلی بحث کے بعد مصحفی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اردو میں قصیدے کے نقاشِ اوّل سودا ہیں اور جو شخص ان کے بعد قصیدہ کہے گا، ان کا متبع ہوگا۔
میر تقی میر نے بھی بعض قصیدے لکھے ہیں لیکن وہ سودا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قصیدے کے لیے شگفتہ مزاجی، زندہ دلی، اطمینان، فارغ البالی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میر کی طبیعت میں درویشی، مسکینی، سوز و گداز، قناعت، توکّل کے ایسے عناصر تھے جنھوں نے انھیں غزل کے لیے موزوں شخصیت بنا دیا تھا۔ سودا کے قصیدوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین نے بھی اسی طرح کے قصیدے لکھے ہوں گے۔ چناں چہ یہ میدان بھی رنگین کو تیار ملا۔

اس دَور میں ایک اور صنفِ ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ یہ ہجونگاری ہے۔ ہجویات کی مثالیں اُردو اور فارسی میں پہلے بھی ملتی ہیں۔ لیکن سودا پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہجو کو بھی فنی طور پر اختیار کیا۔ سودا سے پہلے بعض شعراء نے زندہ دلی، شوخ طبعی اور ظرافت کی فطرت سے مجبور ہو کر ہزل گوئی اختیار کی تھی۔ چناں چہ علاوہ اور شعراء کے جعفر زٹلی کی ہزلیات اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سودا نے ہجو گوئی کے میدان کو بہت وسیع کر دیا۔ سودا کی ہجویات تین قسم کی ہیں اوّلاً سماج کی معاشرتی اور اخلاقی خرابیاں، دوسرے سیاسی اور حکومت کی بے عنوانیاں، تیسرے افراد و اشخاص کی ہجویات۔ ان میں سے اوّل الذکر دو قسم کی ہجویات میں سودا حق بہ جانب ہیں اور فنی اعتبار سے یہی اعلیٰ درجے کی ہجویں ہیں۔ اُن میں قصیدہ "تضحیکِ روزگار"، "مثنوی در ہجو شیدی کا فودی کوتوال" وغیرہ ایسی ہجویات ہیں جن سے اس عہد کی سماجی خرابیوں کا پتہ چلتا ہے۔

ان ہجویات میں فحش اشعار بھی کم ہیں لیکن جو ہجویات ذاتی قسم کی ہیں۔ ان میں سودا کی طبیعت کی شوخی فحش کی طرف مائل ہوگئی ہے۔ چناں چہ مولوی ساجد، ندرت کشمیری اور میر ضاحک کی ہجویات میں سودا نے ایسے فحش اشعار لکھے ہیں، جو قابلِ اشاعت نہیں اور یہ "کلیاتِ سودا" کے مطبوعہ نسخوں میں سے خارج کر دیئے گئے ہیں ؎

مثلاً ضاحک کی ایک ہجو جس میں سکندر کے نام سے ابتدا کی گئی ہے۔ جس کا مصرع یہ ہے۔ ؏

"یارب تو میری سُن لے یہ کہتا ہے سکندر"

اس میں میر ضاحک کے علاوہ ان کی بیوی کی بھی ہجو ہے۔ اور اس سے بڑھ کر وہ مخمّس ہے۔ جس کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے۔ ؏

"ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا"

اس طویل مخمس میں سوائے فحش نگاری کے کچھ اور نہیں۔ لیکن یہ مذاق سودا تک محدود نہیں تھا۔ سودا کے سکندر والے مخمّس کا جواب جو ضاحک نے دیا ہوگا وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ لیکن میر حسن نے اپنے باپ کی طرف سے اس کا جواب سودا کو دیا ہے۔ جو میر حسن کی قلمی کلیات میں موجود ہے۔ اور سودا کی فحش نگاری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعری میں فحش نگاری داخل ہوگئی تھی جس کی بدولت سودا اور میر حسن جیسے قادر الکلام شاعر اس حمام میں آکر بالکل ننگے ہو گئے تھے۔ جب ہم رنگین کا فحش کلام دیکھتے ہیں تو ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا۔ جس انداز کی ابتدا سودا نے کی تھی۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا، جو رنگین کے فحش کلام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ رنگین ہی سے مخصوص نہیں بلکہ انشاء جو ان کے ہم عصر تھے اگرچہ

وہ رنگین کی حد تک نہیں پہنچے لیکن ان کے کلام میں بھی فحش نگاری کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ سودا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں بعض روایات ایسی تھیں، جن سے زندگی اور ادب میں کچھ رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے لکھنؤ پہنچ کر بگڑے ہوئے مذاق کو سنوارنے کے بجائے اور بگڑنے کا سامان مہیا ہوا یہی وجہ ہے۔ کہ وہاں ریختی کو پنپنے کا موقع ملا۔ لکھنؤ کے خاص حالات نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگر لکھنؤ کی مذہبیت، مرثیہ نگاری اور نعتیہ شاعری کی صورت میں اس کی تلافی نہ کر دیتی تو شاید اخلاقی اعتبار سے ادبی تاریخ کا وہ تاریک ترین دور ہوتا۔

مثنوی گوئی جو دکن میں خاص ترقی کر چکی تھی شمالی ہند میں اس دور میں پروان چڑھی ہے۔ حالی کا یہ کہنا درست ہے کہ میر تقی میر پہلے شخص ہیں جنھوں نے شمالی ہند میں سب سے پہلے چند عشقیہ مثنویاں لکھیں[1]۔

میر کی مثنویاں موضوعات کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ ان میں سے بعض ذاتی اور وارداتی ہیں جن میں میر نے اپنے مکان کا نقشہ پالتو جانوروں کے حالات، معاصرین سے اپنی نوک جھونک لکھنؤ کے مرغ بازوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعض عشقیہ مثنویاں ہیں۔ ان میں سے بھی بعض میں ذاتی واردات بیان کی ہیں۔ مثلاً مثنوی 'خواب و خیال' از میر اثر دہلوی اور بعض میں اس عہد کے رومانی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً 'شعلۂ عشق' جس پر مصحفی کی 'شعلۂ عشق' کی بنیاد ہے۔ اور بعض رسمی قسم کی عشقیہ مثنویاں ہیں۔ مثلاً 'دریائے عشق'۔ ان تمام مثنویوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کو اس فن میں بھی بڑی قدرت حاصل تھی۔ سودا کی طبیعت قصیدہ گوئی کی طرف ایسی

---

[1] مقدمۂ شعر و شاعری صفحہ ۲۱۱ از حالی مطبوعہ حاجی فرمان علی، اردو بازار لاہور

مائل ہوئی کہ وہ اور کسی کام کے نہ رہے۔ انھوں نے بہت سی مثنویاں کہیں لیکن ان کی مثنوی کے متعلق مصطفٰے خاں شیفتہ کا یہ قول بہت مشہور ہی کہ "مرزا در مثنوی فکر معقول نہ داشت" لیکن سودا کے ناقد شیخ چاند اس سے اتفاق نہیں کرتے اِن کے پیشِ نظر سودا کی تمام مثنویات ہیں جن کی تعداد بیس ہی۔ انھیں اس بات کے تسلیم کرنے میں بھی تذبذب ہی کہ سودا نے پہلے مثنویاں لکھیں یا میر نے۔[1]

عشقیہ مثنویوں کے بارے میں شیخ چاند بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقت[2] یہ ہی کہ سودا کو عشقیہ مثنوی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس نے خود لکھ دیا ہی کہ مجھ سے قصہ کہانی کی توقع رکھنا خبط ہی"۔

شیخ چاند کے اس قول سے ہمیں بھی اتفاق ہی کہ مثنوی میں ہجو نگاری کا کمال جیسا سودا نے دکھایا ہی۔ ویسا کہیں اور مشکل سے ملے گا لیکن ان ہجویات میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہی فحش مضامین اس طرح غالب ہیں کہ ایسے مجموعۂ کلام کو شعر کہنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہی۔ رنگین کے مجموعۂ کلام میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ رنگین اس معاملے میں اس سلسلے کی ایک کڑی ہی جس کی ابتدا سودا نے کی تھی۔

لیکن مثنوی گوئی میر حسن کے یہاں معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ انھوں نے چھوٹی بڑی بہت سی مثنویاں لکھیں جن میں سے 'رموز العارفین' 'گلزارِ ارم' اور 'سحر البیان' شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں 'سحر البیان' کو ناقدین نے متفقہ طور پر اردو کی بہترین مثنوی قرار دیا ہی۔ اس میں محاکات اور تخیل کا توازن، عام بول چال کا محاورہ، اصلیت، واقعیت

---

[1] 'سودا' از شیخ چاند صفحہ ۲۲۰ [2] 'سودا' از شیخ چاند صفحہ ۲۳۱

اور جامعیت کا ایسا امتزاج ہی جو اور کہیں نہیں ملتا۔ اور بلاشبہ میر حسن اس فن کے امام ہیں۔ خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر نے بھی ایک مشہور مثنوی 'خواب و خیال' کے نام سے لکھی تھی جس میں محاکات کا کمال دکھایا تھا۔ مثنوی گوئی کے سلسلے میں مصحفی کا بھی نام لیا جاسکتا ہی۔ جو میر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ میر کی 'دریائے عشق' کو 'بحر المحبت' کے نام سے اور 'شعلۂ شوق' کو اسی نام سے دوبارہ نظم کیا ہی۔ کچھ مثنویاں ذاتی حالات و واردات پر لکھی ہیں۔ لیکن یہ مثنویاں میر حسن یا میر کی مثنویات کے ہم پلّہ نہیں۔ یہی حال رنگین کے ہم عصر انشاء اور جرأت کا ہی۔ انشا نے کچھ مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن وہ خود ان کی غزلوں اور قصیدوں کے سامنے کوئی مرتبہ نہیں رکھتیں ؛

غرض شعر و شاعری کا یہ ماحول تھا جو رنگین اور ان کے معاصرین کو ورثے میں ملا ؛

باب سوم

تصانیف و کلامِ رنگین

غزل گوئی، دیوانِ ریختہ و دیوانِ بیختہ

رنگین کی غزل گوئی

ایشیائی شاعری بالخصوص اُردو اور فارسی میں غزل گوئی کا رواج ایسا ہی کہ ان دونوں زبانوں کی شاعری کا بڑا سرمایہ غزل پر ہی منحصر ہے۔ اُردو میں خاص طور پر غزل گو شعرا کی تعداد اور ان کے کلام کی مقدار اس قدر ہے کہ تمام دیگر اصناف مل کر بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ مختلف شعرا نے اگرچہ بعض خاص اصناف میں کمال حاصل کیا ہے لیکن غزل گوئی سب نے کی ہے۔ سودا قصیدہ گو مشہور ہیں۔ اور دراصل وہی ان کا میدان ہے۔ لیکن وہ نہ صرف غزلیں ہی لکھتے ہیں بلکہ میر کا مقابلہ بھی کرتے ہیں ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میر سے اُستاد کی طرف

میر حسن مثنوی گو مشہور ہیں اور بلا شبہ 'سحرالبیان' کا مقابلہ ان کی کوئی دوسری مثنوی نہیں کرسکتی لیکن انھوں نے بھی بہ کثرت غزلیں کہی ہیں اور میر و مصحفی کے بعد اردو کے ممتاز غزل گو شاعروں میں ان کا شمار کرنا چاہیے۔ غرض اردو شاعری کی تاریخ میں غزل کی مقبولیت کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے اور حالی سے پہلے اردو کا قابلِ ذکر سرمایہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر غزل پر ہی محدود ہے۔ غزل کے لغوی معنی محبوب سے کلام کرنا ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شعر میں عاشقانہ شاعری جس میں ردیف اور قافیے کی پابندی کے ساتھ الگ الگ اشعار میں ایک ایک مضمون باندھا گیا ہو اور یہ مضمون مسلسل ہو یا متفرق غزل کہلاتا ہے۔ لیکن غزل میں عشقیہ شاعری کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کا مطلب عشقِ مجازی کے مضامین، واقعات، معاملات، وارداتِ محبوب اس کے لوازمات اور متعلقات، عشق میں پیش آنے والی مختلف کیفیات جذبات اور حالتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اس میں عشقِ مجازی کی ایک اعلیٰ سطح بھی مدِ نظر رکھی جاسکتی ہے۔ اور اسی کو اسفل کرکے ہوا و ہوس کے مضامین بھی باندھے جاسکتے ہیں۔ جس میں ہاتھا پائی تک کے مضامین آسکتے ہیں۔ پھر محبوب کی جنس پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ اگر ہندی کی طرح اظہارِ عشق عورت کی زبان سے کیا جائے اور مرد کو اس کا محبوب قرار دیا جائے تو مضامین کی جذباتی نوعیت اور اندازِ بیان کچھ اور ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اردو میں بھی دکنی دور میں عام طور پر اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات میں خاص طور پر موجود ہے۔ دوسری طرف عربی شاعری کے عام انداز پر مرد کی زبان سے عورت کے لیے اظہارِ عشق کا مضمون باندھا جاسکتا ہے۔ یہ عورت اگر عفت مآب اور پردہ نشین ہو تو مضامین کی

نوعیت مختلف ہوگی اور اگر محبوبہ کوئی بازاری عورت ہو تو قدرتی طور پر یہ نوعیت بدل جائے گی اور دونوں صورتوں کے علاوہ ایک اور شکل مرد سے مرد کی محبت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جسے عام طور پر امرد پرستی کے مضامین کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس میں مضامین کا انداز جذباتی سطح پر اسفل اور اخلاقی اعتبار سے بالکل مختلف ہوگا۔

ان تمام صورتوں کے علاوہ ایک حالت وہ ہے جسے صوفیوں اور صوفی شاعروں نے عشقِ حقیقی کا نام دیا ہے۔ اور اس کے پردے میں عارفانہ مضامین ادا کیے ہیں۔ یہاں حُسن سے مراد حسنِ مطلق، معشوق سے مراد شاہدِ حقیقی اور عاشق سے مراد مخلوق ہے۔ تصوّف کے جس قدر مضامین ہیں ان کی بنیاد اسی عشقِ حقیقی پر رکھی گئی ہے۔ دنیا کو ایک عالمِ شہود بتایا گیا ہے اور اس کی تخلیق کی بنا حُسن کی خود آرائی، خود بینی اور خود نمائی کا شوق ہے، حُسنِ ازل جو پردے میں چھپا تھا، باہر آنا چاہتا تھا۔ چناں چہ تخلیق کائنات ہوئی اور ہر ذرّے میں وہی حُسنِ ازل موجود ہے۔ میر تقی میرؔ لکھتے ہیں:

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

یہ دُنیا ایک آئینہ ہے جس میں شاہدِ مطلق کا عکس یا جھلک نظر آتی ہے۔ مخلوق کائنات اس جلوے کو دیکھنے والی ہے۔ لیکن تعیّنات کے پردے راستے میں حائل ہیں جو ان جلوؤں کا طالب ہے اسے پہلے تعیّنات کے یہ پردے اُٹھانا پڑیں گے۔ ان میں زمان و مکان اور ہست و بُود کے پردے بھی ہیں۔ جو محبوب کو پانا چاہتا ہے وہ پہلے خود کو کھو دے۔ جب تک دوئی کا پردہ درمیان میں حائل ہے اس حُسنِ مطلق تک رسائی نہیں ہو سکتی

اور اس کی ایک جھلک ان تمام پردوں کو چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔
اس صوفیانہ نقطۂ نظر سے بعض اور مضامین بھی پیدا ہوئے ہیں۔
خاص طور پر دُنیا کی بے ثباتی اور ناپلٹے داری کے مضامین جو انسان کو نفی ذات یا اپنے آپ کو مٹا دینے کی تعلیم دیتے ہیں مرزا غالب کا یہ شعر ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

صرف مرزا غالب ہی کا مسلک نہیں ایک خاص اندازِ فکر ہے۔ جو صوفیوں اور صوفی شاعروں کے یہاں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اور جس کے اظہار کے لیے اور اصناف کے علاوہ سب سے زیادہ غزل کا پیمانہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اور میر تقی میر جیسے باکمال غزل گو صوفی تھے۔ اور ان کی وجہ سے غزل میں تصوّف کی روایات جو فارسی غزل میں پہلے سے داخل تھیں اُردو میں بھی رائج ہو گئیں۔
لیکن غزل کے مضامین کا تنوّع اور اس کی وسعت یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ غزل دراصل ایک قسم کی جذباتی شاعری ہے۔ اور عشق و عاشقی کے علاوہ بھی جذباتِ انسانی میں سے کوئی شدید جذبہ یا حالت غزل کا موضوع بن سکتا ہے۔ اُردو غزل کا عہدِ زرّیں شمالی ہند میں سیاسی اعتبار سے بڑی افراتفری کا دور تھا۔ سیاسی کش مکش، خوں ریز لڑائیاں، انقلابات، لوٹ مار، قتل و غارت گری، ویرانی اور بے سروسامانی کے واقعات روزمرہ پیش آتے تھے۔ نادر گردی تو ایک اہم واقعہ ہے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات روز پیش آتے رہتے تھے۔ لوگوں کو ذہنی معاشی یا معاشرتی فارغ البالی نصیب نہ تھی۔ تلاشِ معاش میں سب سرگرداں

پھرتے تھے۔ ان حالات میں علوم و فنون، شاعری اور ادب کی کوئی قدر نہیں رہی تھی۔ شرافت اور نجابت کے پرانے تصوّرات اب تک قائم تھے لیکن اس دَور میں فلکِ سفلہ پرور نے جن لوگوں کو عروج نصیب کیا تھا وہ ان قدروں سے بیگانہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جذباتی قسم کے شاعروں کو ایک شدید قسم کے بُحران کا سامنا تھا۔ وہ اپنے دیس میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھتے تھے۔ مرزا غالب کہتے ہیں ؎

بیا در ید گر ایں جا بود زباں دانے　　غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

غالب کا یہ شعر صرف غالب کی ہی ذہنی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اس بے چینی، بے اطمینانی اور غریب الوطنی کا احساس دلاتا ہے جس میں اس دَور کے تمام شاعر، ادیب اور دیگر علوم و فنون کے ماہر مبتلا تھے۔ قدرتی طور پر غزلوں میں یہ تمام کیفیات، جذبات اور حالات نظم ہوئے ہیں۔ اُردو غزل پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں عشقیہ مضامین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور غزل کی شدید داخلیت میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کا خارجی ماحول کیا تھا۔ غزل کا مطالعہ خود اس اعتراض کی تردید کر دیتا ہے۔ غزل گو شاعروں کے کلام سے اس عہد کی ذہنی و نیز سماجی کیفیت کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ معاشرت میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور اخلاقی معیار جتنا پست ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ بھی غزل کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ غزل میں رکاکت یا ابتذال بہ راہِ راست اس عہد کی سوسائٹی میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس طرح سوسائٹی میں ایک تدریجی زوال دیکھتے ہیں۔ اسی طرح وَلی سے لے کر میر، جرأت اور رنگین کے عہد تک غزل میں آہستہ آہستہ

نئے مضامین کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ غرض غزل ہر دور میں اپنے خارجی ماحول کی پوری ترجمانی کرتی رہتی ہے۔

غزل کے اسلوب میں سب سے اہم اس کی رمزیت یا اشاریت ہے۔ غزل محبوب کی زبان ہے بات کا نام ہو یا نہ ہو استعارہ اور تشبیہ میں گفت گو کا نام ضرور ہے۔ غزل کے ان اشاروں میں ساقی، جام، بادہ اور مینا ایسی علامتیں ہیں جن کے پردے میں عجیب عجیب مضامین ادا کیے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفت گو — بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفت گو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالبؔ نے ان اشعار میں غزل کی رمزیت کی صحیح تعریف کر دی ہے اس نقطۂ نظر سے اگر ہم اشاروں کی کوئی فہرست مرتب کرنا چاہیں تو وہ خاصی طویل ہوگی۔ مثلاً بعض اشارے ایسے ہیں جو ساقی، ساغر، بادہ، جام، مے، مے کش، فصلِ بہار، مغ، مغبچہ، محتسب اور ان سے متعلق ہیں۔ اس طرح ایک اور سلسلہ گل و بلبل، بہار و خزاں، صید و صیاد، قفس و نشیمن برق و باراں، شاخ و آشیاں وغیرہ سے متعلق ہے۔ اور ان تمام سلسلوں میں یہ اشارے اور رموز ذاتی اور خارجی ماحول کی ترجمانی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ اور ان کی بدولت غزل میں نئے نئے مضامین پیدا ہوئے ہیں۔

غزل کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی اور پُرکاری ہے۔ غزل میں قصیدے کی طرح تخیل کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شوکت اور تراکیب کا شکوہ درکار نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ مضمون کی سادگی اور بیان کی صفائی مدِّنظر

مدِ نظر رہتی ہے۔ اُردو غزل کے سب سے بڑے باکمال میر تقی میر کا یہی انداز ہے۔ متاخرین میں البتہ جب تکلف اور تصنع نے زندگی میں دخل پالیا تھا اس وقت غزل میں بھی اس قسم کے پُر تکلف مضامین آنے لگے جن کی بنیاد بجائے جذبات کے محض خارجی متعلقات اور لوازمات پر تھی۔ متعلقاتِ حسن کا بیان محبوب کے خد و خال کا تذکرہ، اس کے ملبوسات اور سامانِ آرایش کا ذِکر مختلف اعضا کا تذکرہ اُردو غزل میں پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن اس کی حیثیت بنیادی نہیں تھی۔ متاخرین کے دَور میں جب جذبات نگاری کا زوال ہوا تو ان خارجی متعلقات اور لوازماتِ حُسن پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اور اس کی انتہا ان لکھنوی شعرا پر ہوئی، جنھوں نے اپنی غزلوں میں محبوب کے اعضائے جسمانی میں سے کوئی عضو، ملبوسات میں سے کوئی لباس اور زیورات میں سے کوئی زیور ایسا نہ چھوڑا جس کا ذِکر نہ کر دیا ہو ؎

غزل کا ایک اور مضمون ذِکرِ شراب ہے۔ اس میں بھی عشق و عاشقی کی طرح دو کیفیات بیان کی گئی ہیں۔ ایک مجازی جس میں شراب پینے پلانے اور اس کی مختلف کیفیات کا ذِکر ہے۔ دُوسرے جہاں شراب سے مراد شرابِ معرفت الٰہی ہے۔ اور معرفت کو نشے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جہاں بے ہوشی آگاہی کا نام اور آگاہی جہاں رہ بر ہونے کی بجائے رہ زن، جہاں عقل و خرد کے بجائے پیرِ مغاں کے اشاروں پر سجّادہ شراب سے رنگین کیا جاتا ہے۔ غرض بے شمار مضامین ہیں جو اس شرابِ معرفت سے پیدا ہوئے اور جو فارسی اور اُردو غزل کا مشترک سرمایہ ہیں۔ اس سے ایک نیا سلسلہ مضامین کا زاہد اور واعظ پر پھبتی اور طنز کا پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات

ان مضامین کے نظم کرنے میں طنز کی جگہ پھکڑ اور فحش نگاری تک پہنچ جاتی ہے
لیکن بنیادی طور پر ایسے اشعار کا مقصد ریاکاری اور ظاہر پرستی کی تنقید ہے۔
اور اس طرح ان لوگوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جن کا ظاہر و باطن
یکساں نہیں ہوتا۔ اگر یہ کوشش خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس کی افادیت
میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور اس میں شوخی کا اضافہ ہو جائے تو فنی اعتبار
سے اس مضمون کی لطافت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جس طرح عام طور پر طنز نگاری
میں ذاتی مخاصمت کا پہلو پیدا ہو جائے یا طنز نگار اعتدال سے بڑھ جائے
تو ہجو نگاری میں بے ہودہ گوئی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح زاہد اور
واعظ پر پھبتی کہتے کہتے ایسے مضامین پیدا کیے جائیں جن میں کفر کو اسلام
پر ترجیح دی جائے، مندر یا بت کدے کو مسجد سے اعلیٰ و ارفع سمجھا جائے
بت پرستوں کو مسلمانوں سے بہتر قرار دیا جائے اور آخر حد یہاں تک
پہنچے کہ خود خدا اور مذہب کے تصور کا مذاق اڑایا جائے تو بات حد سے
بڑھ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں قدیم شاعری میں بھی موجود ہیں لیکن متاخرین
کے یہاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ موجودہ دور میں اس ذہنیت کی نمایندگی جوشؔ
ملیح آبادی کرتے ہیں:۔

جس طرح غزل میں کسی مضمون کی قید نہیں، اشعار کی تعداد بھی مقرر
نہیں، کسی خاص ردیف یا بحر کی پابندی نہیں اسی طرح غزل کا کوئی مخصوص
اسٹائل یا اسلوب بھی نہیں ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف غزل گو شعراء نے
اپنی اپنی افتادِ طبع اور اپنی اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنا اپنا طرز پیدا
کیا ہے۔ مثلاً قلی قطب شاہ کا طرز الگ ہے جس میں مقامی اثرات زیادہ
جھلکتے ہیں۔ ہندی کی فطری سادگی اور فارسی کی شیرینی کا صحیح امتزاج ہے۔

اس کے بعد ولی کا طرز دیکھیے جہاں فارسی کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ سادگی کی جگہ فن کارانہ صناعی پھیلتی ہے۔ پھر میر کا انداز جس کے متعلق ذوق لکھتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر کے اس طرز کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سادگیٔ کلام ہے۔ اگر اردو غزل کی تاریخ میں کسی کا کلام واقعی سہل ممتنع ہے تو وہ میر کا کلام ہے۔ سودا کا طرز ان سے مختلف ہے جسے مختصر طور پر غزل قصیدہ طور کہہ سکتے ہیں۔ یعنی غزلوں میں قصیدوں کی سی شان و شوکت اور آہنگ موجود ہے۔ لیکن تاثیر وہ نہیں جو میر کی غزل میں ہے۔ ان کے بعد وہ دور آیا جس میں رنگین بھی ہیں۔ میر اور سودا اس وقت تک استاد تسلیم کیے جاتے تھے: مصحفی، انشاء، جرأت اور رنگین ان کی تقلید کرتے تھے اور اپنا بھی ایک خاص طرز پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ طرز کیا ہے، اس کا اندازہ رنگین کی غزلوں کے مطالعے سے ہی ہو سکتا ہے:

سب سے پہلے رنگین کی چند غزلیں دیکھیے ؎

جب جی سے ترے اتر گئے ہم بھر کر ایک آہ مر گئے ہم
دہشت نہیں دشمنوں کی ہم کو سر اپنے سے جب گزر گئے ہم
جا غیر کے گھر میں اس کو پایا قدموں کے جو کھوج پر گئے ہم
جز لاش نہ دیکھی ہر قدم پر کوچے میں ترے جدھر گئے ہم

دریا بھی بجھا سکا نہ رنگیں
جلتا جو لیے جگر گئے ہم

بتوں کی طرح جہاں آشنائیاں دیکھیں پھر ایک بات میں ان میں جدائیاں دیکھیں
جنھوں سے ہم نے بھلائی کری زمانے میں عوض میں اس کے پھر ان سے برائیاں دیکھیں

دوچند ظلم کیا تب سے دردمندوں پر
فلک نے جب سے تری کج ادائیاں دیکھیں

رہا نہ ہاتھ میں دل ہم نے اُس کی چلون سے
وہ گول گول جو باہر کلائیاں دیکھیں

بُتاں کے عشق میں اس بختِ بد نے ای رنگیں
مشقتیں مجھے جو جو دکھائیاں دیکھیں

ہی کون میرے دل میں تیری چاہ کے سوا
ہم دم نہیں ہی کوئی مرا آہ کے سوا

قابو میں جب ہوئے تو دل کیا کرے بھلا
چاہے یہ کس کو اس بتِ گمراہ کے سوا

نوکر ہوں ایک بوسے کا دلوائیے طلب
بندہ تو مانگتا نہیں تنخواہ کے سوا

لگ چل کے اس سے مجھ کو دلاتا ہی گالیاں
دشمن ہی کون اس دلِ بدخواہ کے سوا

کیا بے کسی کا وقت ہی عشقِ بُتاں میں آج
رنگیں نہیں ترا کوئی اللہ کے سوا

تا حشر رہے یہ داغ دل کا
یارب نہ بجھے چراغ دِل کا

ہم سے بھی تنک مزاج ہی یہ
پاتے ہی نہیں دماغ دِل کا

یہاں آتشِ عشق سے شب و روز
دہکے ہی پڑا اوجاغ دل کا

اس رشکِ چمن کی یاد میں ہی
شاداب ہمیشہ باغ دل کا

جینے کا مزا اسی کو ہی بس
جس شخص کو ہو فراغ دل کا

ہی بادۂ غم سے تیرے دن رات
لبریز یہاں ایاغ دل کا

معلوم نہیں کسی کو رنگیں
دے کون ہمیں سُراغ دل کا

۱؎ چلمن ۲؎ دیوان ریختہ، ورق ۱۸ ب ۳؎ دیوانِ ریختہ، ورق ۱۸ ب
۴؎ چولھا ۵؎ شراب پینے کا پیالہ

خاک[1] کو باغ میں چھانے گی صبا میرے بعد
پر کھلیں گے نہ ترے بندِ قبا میرے بعد

غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ
کون اُٹھاوے گا ترے جور و جفا میرے بعد

گو جفا پیشہ تھا بھر عمر وہ روتا ہی رہا
جس نے احوال مرا تیرا سُنا میرے بعد

میں تو ناکام گیا پر یہ دُعا ہے میری
دے محبت کو نہ تاثیر خدا میرے بعد

تو نے پامال جو رنگیںؔ کو کیا اُس نے کہا
رنگ ایسا نہیں دینے کی حنا میرے بعد

اب[2] ہوئی ہم کو سخت حیرانی   چاہ چتون سے اس نے پہچانی
نہ رہا میرے پاس پر نہ رہا   دل کی ہر چند کی نگہ بانی
جی کی بات اپنے رہ گئی جی ہیں   لو یہاں سے چلے ہم اے جانی
دیکھیے پھر خدا ملاوے کب   ہم کو اس سوچ نے کیا فانی

جی میں انصاف کیجیے اپنے
تم نے رنگیںؔ کی قدر کیا جانی

میر[3] مجلس ہے تو ہی اور تو ہی صاحبِ خانہ ہے
تجھ سے ہی رونق ہے سب تو شمع ہر کاشانہ ہے

تو ہی کر انصاف دل میں زلف کے کوچوں سے یار
مو بہ مو واقف مرا دل ہے کہ تیرا شانہ ہے

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۲۱ ب [2] دیوان ریختہ، ورق ۹۸ ب [3] دیوان ریختہ، ورق ۳ ب

تم جو کہتے ہو کہ میرے گھر میں کیوں آتا ہے تو
کیوں نہ آؤں آپ کا گھر میرا دولت خانہ ہے

صیدِ دل کیوں کر بچے صیاد تیرے پیچ سے
زلف مثلِ دام ہے اور خال مثلِ دانہ ہے

گل اگر مکھڑا ہے تیرا تو ہے رنگینؔ عندلیب
شعلہ ہے عارض ترا تو دل مرا پروانہ ہے

دم[1] آیا ناک میں اس گریہ و زاری کے جینے سے
طبیبو موت ہی بہتر ہے بیماری کے جینے سے

نہ وصل اس سے ہوئے ہم اور نہ نکلا کام دل کوئی
ہوا کیا فائدہ دنیاں میں ناداری کے جینے سے

نہیں مصرف کا باغ دہر میں جوں چوب[2] شاریدہ
خجالت ہے مجھے اس اپنے بیکاری کے جینے سے

خدا کے وہ جو طالب ہیں انھیں نام و نشاں سے کیا
مدام ان کو ہے چڑ اس گرم بازاری کے جینے سے

پھنسا ہے ہاتھ جن کا عشق کے پتھر تلے رنگینؔ
وہ ہیں ناچار اپنی اپنی ناچاری کے جینے سے

رنگینؔ کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے۔ کہ ان کا محبوب کون ہے۔ اور اس کی وضع قطع کس طرح کی ہے۔ اس سلسلے میں رنگینؔ کے اس قسم کے اشعار پیشِ نظر رکھنے چاہییں ؎

چہرے[3] کی دمک اک قہر بلا زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہے
مستی کی جماوٹ کیا سو کہوں دانتوں کی چمک پھر ویسی ہے

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۱۰۴ [2] جبانی کی کھائی ہوئی لکڑی [3] دیوان ریختہ، ورق ۱۲۵ قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری

اس وحشی کو پھسلاتا ہوں اور دام میں جوں توں لاتا ہوں
نزدیک جب اس کے جاتا ہوں ہے مجھ سے جھجک پھر ویسی ہے

دانت اس کے گہر اور منھ ہے صدف رفتار پہ کبک کی اس کو شرف
چلنے کی نزاکت ایک طرف ٹھوکر کی لچک پھر ویسی ہے

ہر بات میں ہونا مجھ سے خفا اور ہر دم کرنا جور و جفا
باتوں کی عجائب ایک ادا ابرو کی مٹک پھر ویسی ہے

رنگین کو ساقی اب تو پلا شیشے میں باقی جو ہے رہا
دارو تو غضب دیتی ہے مزا ہے ساتھ گزک پھر ویسی ہے

ہے آنکھ لڑانا ایک ستم ہر ایک ادا پھر ویسی ہے
دستار نہیں بانکوں سے کم اور تنگ قبا پھر ویسی ہے

جس یو کا ہوں مشتاق نپٹ جا جلدی آ جا چل کے جھپٹ
لا اس کے عرق کی ایک لپٹ اے بادِ صبا پھر ویسی ہے

سانچے میں ڈھلی ہے یہ تیری نور کی گردن[1]
گردن کو تیری پہنچے ہے کب حور کی گردن

رہا نہ ہاتھ میں دل ہم نے اس کی چلون سے
وہ گول گول جو باہر کلائیاں دیکھیں

اے پری شاید اپنے دانتوں کو تو نے آپ گہر سے ہے مانجھا

کہاں ہے مہ کو ترے رخ کی تاب سے نسبت[2]
کہیں بھی ذرّے کو ہے آفتاب سے نسبت

نہ دوں چمن میں تیرے قد کو سرو سے تشبیہ
نہ دوں عرق کو ترے میں گلاب سے نسبت

[1] دیوان ریختہ ورق ۳۰ب [2] دیوان ریختہ، ورق ۴۲ب

بانکا ہی اس قدر وہ نکلتا ہی گھر سے کب
جب تک کہ اس کے ہاتھ میں تیغ و سپر نہ ہو

کیوں کر تیرے مکھڑے سے میں چاند کو نسبت دوں پیارے
صاف ہی مکھڑا تیرا تو اور چاند کے منھ پر چھائی ہی

باتوں[1] کا تری کیوں نہ ہو مشتاق ہر کوئی
ہر بات تیری میٹھی ہی پیارے نبات سے

گل اگر مکھڑا ہی تیرا، تو ہی رنگیں عندلیب
شعلہ ہی عارض ترا، تو دل میرا پروانہ ہی

گلے[2] میں لال کا تکمہ ہی اس کے گریباں گیر یا رنگیں کا خون ہی

گر[3] برقع اپنے منھ سے وہ بے حجاب اُلٹے
تو سمتِ شرق وہیں پھر آفتاب اُلٹے

زلف اس کی لے کے دل کو پھر یوں ہوئی ہی برہم
ڈس کر کسی کو جیسے ناگن شتاب اُلٹے

ناک میں دم ہی یہاں آگے ہی اجی نتھنوں کو نہ پھڑکاؤ جی
گل سے روئے نگار بہتر ہی سرو سے قد یار بہتر ہی

ٹپکی پڑتی ہی اس سے نکھراہٹ ہی یہ عالم تری جوانی کا
آنکھوں[4] کا دہیں اس کی دوبالا ہوا عالم

اک سُلفے کا دم اس نے جو تھی بنگ پہ کھینچا
میرے چہرے کا رنگ ہی ہمسر اس کی دستار زعفرانی کا

---

[1] دیوان ریختہ ورق ۷۵ ب

[2] دیوان ریختہ، ورق ۶۵ ب

[3] دیوان ریختہ، ورق ۷۷ ب

[4] دیوان ریختہ،

چاہنے والوں نے اس پر منہ کیے لڑ لڑ کے لال
تو نے جو کھایا تھا جادو تھا کہ پیارے پان تھا

حسرتِ بوسہ نکالی تو نے حقہ اپنا دے
ایک مدت سے ہمارے جی میں یہ ارمان تھا

پری ہونا تو آساں اور پری سے حور ہو جانا
ولے مشکل ہے تجھ سا او بتِ مغرور ہو جانا

پھر مجھے یاد آئے اس کے بال وہ بکھرے ہوئے
پھر ہر اک مو سے میں اپنے دل کو اُلجھانے لگا

پھر لگا آنے مجھے دھیان اس کی چشمِ مست کا
پھر میں بے خود ہو کے صحرا کی طرف جانے لگا

رخسار[1] پر نمود ہوا خط خبر بھی ہے — یعنی کمر کسی ہے خزاں نے بہار پر
دو چار دن کے بعد کہاں لطف ان دنوں — احسان کیجیے نہ کسی دوست دار پر

آثار[2] مے کشی کے ظاہر ہیں اس کی وضع سے
چلتا ہے لڑکھڑاتا وہ نوجواں زمیں پر

دستار لٹ[3] پٹی ہے چولی مسک رہی ہے
گر گر پڑے ہے ہر سو ہر ہر زماں زمیں پر

پیدا کرے نرالی وہ جس سے صنم تراش
حجام ایسے ڈھب سے کچھ اُس کی قلم تراش

---

[1] ' دیوان ریختہ ' ورق ۲۹ ا   [2] ' دیوان ریختہ ' ورق ۲۹ ب
[3] دستار آشفتہ و پیچ در پیچ و رنگارنگ ۔ کج رو ا کج دستار سے
ہو گیا آشفتہ سر ہر اک اس کو دیکھ کر — باندھ کر نکلا نہ کر یہ لٹ پٹی دستار تو (میر سوز)

یہ[1] جو بالی میں ہیں اس آفت کے پرکالے کے پھول
سحر ہے ان میں نہ سونگھوں میں یہ بنگالے کے پھول

یہ[2] ہوا ظاہر کرن پھولوں کو تیرے دیکھ کر
موتیا کے پھول آگے ان کے ہیں گالے کے پھول

پھینک دے بے رحم تو اب کان کے بالے کے پھول
آج سنتے ہیں ترے ہیں چاہنے والے کے پھول

زلف یوں کھیلتی ہے کان کے موتی سے ترے
سانپ خوش ہوتا ہے جوں دیکھ کے مَن کا عالم

بال اُن کے کھولتا تھا میں کہ برہم ہو گئے
وہ جو اُلجھے مجھ سے مشکل مجھ کو سلجھانے ہوئے

یہ[3] خال اس کے یوں رخسار پر ہے کان کے آگے
ملنگ اُڑ جائے ہے جیسے کسی دوکان کے آگے

تیری محراب ابرو میں مژہ یوں زیب دیتی ہے
سیہ مخمل کا جیسے سائباں دالان کے آگے

گُلِ خورشید جوں خور تکے عارض کی جانب کو
کرن پھول اس روش ہے یہ تیرے کان کے آگے

گھر سے اب باندھ کے گاتی تو دوپٹے[4] کی نکل
لوٹ جاوے نہ کہیں دیکھ تری گات[5] کوئی

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۷۶/ب [2] دیوان ریختہ، ورق ۱۴/ب [3] دیوان ریختہ، ورق ۴۸/ب
[4] گاتی باندھنا، دوپٹے کو سینے اور کمر سے کسی کام کے واسطے باندھنا۔ [5] سینہ عورت کا پنڈا
جس نے باندھے ہوئے گاتی تجھے دیکھا ہوگا دل ربا شے تھی مری جان تری گات نہ تھی (آتش)

ہوا ہی مشکل اس کو اُٹھ کے چلنا بار ہیکل سے
کمر لچکی ہی پڑتی ہی یہ حالت ہی نزاکت کی

مذکورہ بالا اشعار میں بعض محض رسمی ہیں اور بعض ضمنی طور پر رنگینؔ کے محبوب کی ذات کا تعیّن کرتے ہیں۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہی کہ رنگینؔ کا محبوب گوشت و پوست کا ایک پیکر ہی۔ وہ اس کے اعضا کی تعریف کرتے ہیں اور خاص طور پر ان حصّوں کو مزہ لے لے کر بیان کرتے ہیں جن سے جنسی آسودگی حاصل ہو سکتی ہی۔ وہ بعض زیورات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ایسے اشعار بھی لکھتے ہیں جن سے خطِ رخسار وغیرہ کی تعریف ظاہر ہوتی ہی۔ اِس سے محبوب کی جنس کا تعیّن مشکل ہو جاتا ہی۔ لیکن داخلی اور خارجی شہادتوں سے پتہ چلتا ہی کہ رنگینؔ مختلف طوائفوں کی محبت میں گرفتار رہے تھے۔ اس لیے ایسے اشعار جن میں مردانہ حُسن کی تعریف پائی جاتی ہی محض رسمی معلوم ہوتے ہیں۔ نسوانی حُسن کی تعریف میں بھی رنگینؔ نے سراپے کی ایسی تفصیلات نہیں پیش کی ہیں جیسی جراءت کے یہاں ملتی ہیں۔ اور مجموعی طور پر متعلّقات و لوازماتِ حسن کے مضامین ان کے یہاں کم ہیں۔ البتہ ایسے اشعار بہ کثرت ہیں جن میں محبوب کی شوخی و شرارت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہی۔ "دیوان ریختہ" اور "دیوان بیختہ" دونوں میں اس قسم کے اشعار بہ کثرت ہیں۔ مثلاً[1]

کچھ آج ہی گالی نہیں دیتا ہی مجھے یار
اس کی تو ہمیشہ یہی گفتار ہی رنگیں

---

[1] دیوان بیختہ، ورق 45/ب

وہ بھی تو دن تھے کہ تم رہتے تھے ہم سائے میں
اب تو بدک جاتے ہو دیکھ کے پرچھائیاں

گزرے مرے دھیان میں لاکھوں طرح کے خیال
تم نے کیاں دن رات کو مجھ سے جو چتراٗیاں

جو ہی مری آرزو جانتے ہو اُس کو تم
کیوں یہ سمجھ بوجھ کر کرتے ہو مچلائیاں

مَیں نے کہا کہ ہجر کی طاقت نہیں مجھے
گھر چلیے میرے اب جو میرے دوست دار ہو

ہنس ہنس کے دیکھ دیکھ کے میری طرف کہا
یہ بات جا کے اس سے کہو جس کے یار ہو

کیا غضب ہی دیکھیو جھنجھلا کے ماری اس نے لات
بیٹھ کر مَیں شب لگا جب پاؤں اس کے داپنے

پیارے[۱] کبھی بوسے کی عنایات کی ٹھیرے
یاروں سے بھی اتنی تو مدارات کی ٹھیرے

دل ترسے ہی ملنے کو تمھارے اجی صاحب
بارے کبھو یاں بھی تو کسی رات کی ٹھیرے

قطعہ

دیکھ[۲] ایک پری کو یہ کہا دل نے کہ رنگیںؔ
کیا خوب ہو گر اس سے اشارات کی ٹھیرے

---

[۱] دیوان ریختہ، ورق ۶۱/ب [۲] دیوان ریختہ، ورق ۶۱/ب

نوبت جو اشارات ملک پہنچی تو وہ کھی
اس نے یہ کہا حرف و حکایات کی ٹھہرے

جب حرف و حکایات بہم ہونے لگے خوب
تب بولا کہ کسی طرح ملاقات کی ٹھہرے

مدت میں ملاقات میسر جو ہوئی ہے
اب دل یہی کہتا ہے کہ اس بات کی ٹھہرے

باتیں[1] جو اس سے کرنے لگا میں مساس کی
وہ بے قرار ہو کے گلے سے لپٹ گئی

پھر مچ مچا کے چھٹا تو کہنے لگی وہ یوں
چل دور ہو کہ طبع مری تجھ سے ہٹ گئی

کہا[2] میں نے مجھ کو غلامی میں لو تم تمھیں میرے ہونے سے آرام ہوگا
وہ جھنجھلا کے بولے نہ یک آن دو ہی ابے چل میرا تجھ سے کیا کام ہوگا

آپ[3] پھر کل لگے بتانے آج ہوشے کافر جو کل کو مانے آج
جھوٹا وعدہ ہمیشہ کرتے ہو سچے ہو جائیے تو جانیں آج
ہم نے چٹکی جو لی تو ہو کے خفا بولے آئے ہو کیوں ستانے آج
روز تم نچلے بیٹھے رہتے تھے کیا ہوا ہے تمھیں نہ جانے آج
بولے گھر جائیں گے کہا میں نے چپ رہو مت کرو بہانے آج
کل تلک ہوشیار کہتے تھے مجھ کو بالا[4] لگے بتانے آج

کی ہم نے اشارت تو وہ یوں بولے کہ رنگیں
ہوتا ہے مزاج اپنا اشارات سے برہم

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۲۹/و [2] دیوان ریختہ، ورق ۹/ب [3] دیوان ریختہ، ورق ۲۷/و
[4] بالا بتانا، ٹالنا، فریب دینا۔

آتا ہی[1] جب کبھی وہ نشے کی ترنگ میں
دیتا ہی گالیاں ہمیں کیا کیا اُمنگ میں

ہی وہ[2] ناداں جو تری گالی سے ہوتا ہی خفا
جی ہی جلنے ہی جو لذت ہی ترے دشنام میں

اوروں کو تو پیار کرے اور مجھ کو گالی دے دے جائے
ایسی کیا اب مَیں نے قاضی کی گدھی چُرائی ہی

اظہارِ مدعا کو مرے سُن کے یوں کہا
آتی ہی بوئے خوں مجھے تیری بات سے

کھیل[3] میں شطرنج کے ہونے لگا جو اختلاط
ہو گئی بازی ہماری مات ہنستے بولتے

گئے[4] زانوں پہ میرے وہ جو سو تو یہ بولے چونک کے دور ہو
کروں صدقے میں ایسے تکیے کو مری گردن اس سے اکڑ گئی

غضب[5] ہی یہ کہ وہ مجھ سے کبھی دن کو نہیں ملتا
بھلا شب کو کروں مَیں ساتھ کیا تدبیر سونے کی

شب[6] بہانہ کرکے اپنے پاس سے وہ اُٹھ گیا
وصل کی بات اس سے ہم یارو جملتے رہ گئے

جھنجھلائے[7] بہت مَیں نے جو لی ران میں چُٹکی
بل کھائے بہت مَیں نے جو لی ران میں چُٹکی

---

[1] دیوان ریختہ ورق ۱۱۴ [2] دیوان ریختہ ورق ۱۲۴ حکیم مومن خاں مومن نے بھی اس خیال کو بڑی نزاکت سے اس طرح نظم کیا ہی کہ ابتذال کا شائبہ نہیں پایا جاتا ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
ای ہم نشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

مرزا غالب نے بھی اسی خیال کو دوسرے انداز سے باندھا ہی

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

[3] دیوان ریختہ ورق ۱۴۹ [4] دیوان ریختہ ورق ۱۲۶ [5] دیوان ریختہ ورق ۱۴۴ [6] دیوان ریختہ ورق ۱۶۶ [7] دیوان ریختہ

اب کے گر وصلِ یار کی ٹھیرے پھر کے قول و قرار کی ٹھیرے
دیکھتے ہی گلے لگا لیجے خوب بوسہ و کنار کی ٹھیرے

نہ آئی نیند مجھ کو شام سے تا صبح پھر مطلق[1]
چھپر کھٹ میں لپٹ کر جب سُلانا تیرا یاد آیا

چلائیں سر کے بل کوچے کی جانب تیرے اے محبوب
جب آدھی رات کو گھر میں بُلانا تیرا یاد آیا

میرے منھ پاس منھ لایا تو ہوتا نہ دیتا بوسہ بہکایا تو ہوتا
نکلتا صبح گھر سے غیر کے تھا نہ دیکھا مجھ سے شرمایا تو ہوتا

میں جو لپٹا تو وہ گھبرا کے یہ بولے کہ سرک
چھوڑ دے مجھ کو کسی اور سے یہ پیار نکال

شرم ہے ان کو بہت ہر دم چمٹنے سے میرے
وہ تڑپتے ہیں بہت پر غل مچا سکتے نہیں

ہاتھ میں ہے ہاتھ اور کوئی نہیں ہے آس پاس
وہ تو ہیں قابو میں پر ہم جی چلا سکتے نہیں

جو اس کو غیر کے میں سامنے بُلاتا ہوں
تو چتونوں میں یہ کہتا ہے وہ کہ آتا ہوں

جو چھیڑتا ہوں کبھی پا کے اس کو میں تنہا
تو یوں کہے ہے سرک ورنہ غل مچاتا ہوں

چھپا دُمت کہے دیتا ہے سب چہرے کا اترا پن
کہیں تو رات کو جاگے ہیں صاحب کیوں مُکرتے ہیں

[1] دیوان ریختہ، ورق ۴۵ ب

مجھ سے وہ پردہ نشیں کہتی ہے نادان نہ ہو
تیرے یاں آنے سے مجھ پر کہیں طوفان نہ ہو

میں نے جو کہا ان سے تم رات کو آؤ گے
کچھ سوچ کے وہ جی میں بولے کہ خدا جانے

غیر کے گھر سے نکلتے دیکھا نہیں ہنگام صبح
سامنے سے میں کھنکارا تو شرمانے لگے

وہ چھپ کے آویں یہاں جاؤں میں بھی پوشیدہ
باہم یہ عہد ہوا ہے کئی مہینے سے

سنا کر ہم کو وہ کہتے ہیں آدے جس کا جی چاہے
ہمارے منھ سے اپنا منھ ملادے جس کا جی چاہے

یہ اشعار جو 'دیوانِ ریختہ' اور 'دیوانِ بیختہ' سے منتخب کیے گئے ہیں، غزل گوئی کے اس انداز کی ترجمانی کرتے ہیں، جسے معاملہ گوئی یا معاملہ بندی کا نام دیا گیا ہے اور جس فن کے امام جرأت بتائے جاتے ہیں۔ یہ البتہ درست ہے کہ جرأت کے ہاں ایسے مضامین کی کثرت ہے اور اس کی ایک بنا یہ ہے کہ اپنے اندھے ہونے کی وجہ سے جرأت نے ایسے معاملات میں لطف لینا شروع کیا جن کا تعلق محسوس ہونے والی لذت سے تھا۔ لیکن جرأت کے دیگر معاصرین کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار بہ کثرت موجود ہیں۔ اگرچہ متقدمین کے کلام میں بھی ایسے اشعار کہیں کہیں نکل آئیں گے لیکن اس دور کی اخلاقی پستی، ذہنی انتشار، سیاسی بدحالی نے جذباتی سطح کو اتنا پست کر دیا تھا کہ اعلیٰ جذبات کی جھلک صرف کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ورنہ بالعموم اس

دَور کی شاعری پست جذبات اور پست خیالات کی ترجمان ہے۔ یہ اشعار نہ صرف اپنے مضمون کے اعتبار سے پست اور ادنیٰ درجے کے ہیں بلکہ ان کا اندازِ بیان اور لہجہ بھی عامیانہ ہے۔ گالی گلوچ کا بار بار ذکر ہے، لفظ "لبے" کا استعمال جو صرف اوباشوں کی زبان سے تعلق رکھتا ہے، بے تکلف کیا گیا ہے اور شاعروں نے فخریہ اپنے محبوب کی زبان سے اسے ادا کرایا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محبوب کا تعلق کس قماش کے لوگوں سے تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عاشقوں کی اپنی پستی کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں عشق صرف ہوس پرستی کا نام رہ گیا ہے۔ اور اس کا اظہار بھی نہایت بھونڈے پن سے کیا گیا ہے۔ جذبات کی گہرائی یا شدت جس سے اثر پیدا ہوتا ہے قدرتی طور پر ان اشعار میں نہیں پائی جاتی بلکہ ایک ایسی سوسائٹی سامنے آتی ہے جہاں اعلیٰ جذبات تقریباً مٹ چکے ہوں۔ لوگ ہوس پرستی میں مبتلا ہوں اور مزہ لے لے کر اپنی سیاہ کاریوں کو بیان کرتے ہوں۔ اپنے بعض اشعار میں رنگینؔ بہت کھل گئے ہیں اور چند اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں آج نقل کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات اگر رنگینؔ کی صرف غزلوں تک ہی محدود ہوتی تو شاید ہم صنفِ غزل کی اس بنیادی کمزوری سے اسے وابستہ کر دیتے۔ لیکن رنگینؔ کے بقیہ کلام میں بھی یہ رجحانات اتنے شدید اور واضح ملتے ہیں کہ کسی دُوسری تاویل کی گنجایش باقی نہیں رہتی اور ہم اسے براہِ راست اس عہد کی معاشرت کی پستی کا ترجمان سمجھنے پر مجبور ہیں :

اس کا یہ مطلب نہیں کہ رنگینؔ کی تمام غزلیں اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ 'دیوان ریختہ' اور 'دیوان بیختہ' میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں

جہاں جذبات کی چنگاریاں بھڑک اٹھی ہیں۔ مثلاً ؎

جب[1] جی سے ترے اتر گئے ہم بھر کر اک آہ مر گئے ہم

جز لاش نہ دیکھی ہر قدم پر کوچے میں ترے جدھر گئے ہم

بتوں[2] کی طرح جہاں آشنائیاں دیکھیں

پھر ایک بات میں ان میں جدائیاں دیکھیں

جنھوں سے ہم نے بھلائی کری زمانے میں

عوض میں اس کے پھر ان سے بُرائیاں دیکھیں

دو چند ظلم کیا تیرے دردمندوں پر

فلک نے جب سے تری کج ادائیاں دیکھیں

خاک[3] کو باغ میں چھلنے کی صبا میرے بعد

پر کھلیں گے نہ ترے بندِ قبا میرے بعد

غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ

کون اٹھا دے گا ترے جور و جفا میرے بعد

گو جفا پیشہ تھا بھر عمر وہ روتا ہی رہا

جس نے احوال مرا تیرا آشنا میرے بعد

میں تو ناکام گیا پر یہ دعا ہے میری

دے محبت کو نہ تاثیر خدا میرے بعد

تو نے پامال جو رنگیں کو کیا اس نے کہا

رنگ ایسا نہیں دینے کی حنا میرے بعد

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۳۶ ب [2] دیوان ریختہ، ورق ۷۸ ب [3] دیوان ریختہ، ورق ۶۹ ب

ہوئے[1] بے بال و پر کنجِ قفس میں چھوڑتا ہے تب
پہنچنا باغ تک ہم کو بہت اب دُور ہے ظالم

دریا[2] رواں بہ سوئے عدم دیکھتے ہیں ہم
مثلِ حباب ہیں کوئی دم دیکھتے ہیں ہم

سخت مشکل ہے چاہ کر دیکھو ہو سکے تو نباہ کر دیکھو
ثانی اس سبز قد کے کوئی نہیں خوش قدوں میں نگاہ کر دیکھو

گو فصلِ بہار آوے رہائی کے لیے ہم
ہرگز نہ کبھی منتِ صیّاد کریں گے

اب ہوئی ہم کو سخت حیرانی چاہ چتون سے اس نے پہچانی
نہ رہا میرے پاس پر نہ رہا دل کی ہر چند کی نگہ بانی
جی کی بات اپنے رہ گئی جی میں لو یہاں سے چلے ہم ای جانی
دیکھیے پھر خدا ملادے کب ہم کو اس سوچ نے کیا فانی
جی میں انصاف کیجیے اپنے
تم نے رنگیںؔ کی قدر کیا جانی

ہم رہے کنجِ قفس میں فصلِ گل جاتی رہی اب کہو چشمِ رہائی کیا رکھیں صیّاد سے
جو کوئی آکے باغِ جہاں کی بہار میں اک دم ہی مثلِ بادِ صبا کے گزر کرے
رنگیںؔ بہ قولِ حضرتِ سوداؔ خزاں سے وہ آخر بہ رنگِ گل ہو پریشاں سفر کرے
ہجر کے غم سے ہے مشکل زندگی دل سے اس غم کو بھلائے ہی بنے
دل کو کوئی کس طرح سنبھالے یاں جان کے پڑ رہے ہیں لالے
پھر[3] بہار آئی میرے صیّاد کو پروا نہیں اُڑ کے پہنچوں باغ میں پر کیا کروں پر وا نہیں

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۶۷ب [2] دیوان ریختہ، ورق ۶۷ب [3] دیوان ریختہ، ورق ۶۸ب

اس طرف جو کہ جا نکلتا ہے — وہ سزا واں سے پا نکلتا ہے
بحرِ دنیا میں یوں ہے اپنی نمود — جس طرح بُلبُلا نکلتا ہے

صیاد پہنچوں کیوں کہ چمن تک کہ تو نے آہ
چھوڑا قفس سے توڑ کے ہے بال و پر مجھے

اس قسم کے اشعار "دیوان ریختہ" میں بیش تر اور "دیوان بیختہ" میں کم تر ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "دیوان بیختہ" میں دو غزلیں ایک ہی ردیف اور قافیے میں شروع سے آخر تک کہنے کا التزام کیا گیا ہے جس سے قدرتی طور پر مضامین میں تکلف اور تصنع پیدا ہو گیا ہے اور جذبات کی صفائی میں فرق آ گیا ہے۔ معاملہ بندی کے اشعار بھی "دیوان بیختہ" میں زیادہ ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "دیوان ریختہ" پہلے کی تصنیف ہے اور "دیوان بیختہ" بعد میں لکھا گیا۔ چناں چہ "دیوان بیختہ" کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں :-

"حق سبحانہ تعالیٰ نے دو جہاں کو پیدا کیا اور انسان کو اشرف المخلوقات کا خطاب دے کر چراغ خرد دیا تاکہ نیکی اور بدی کو پہچان سکے چناں چہ میرے دل میں ایک دن یہ خیال آیا کہ اکثر الفاظ معیوب تکیہ کلام کے طور سے ٹھیر جاتے ہیں اور ہر وقت شعر میں آتے ہیں اور فصاحت کے مزے کو کھوتے ہیں بس ان کو موقوف کر کے شعر کہا کروں تاکہ زمانے کے باریک بین کا مورد تحسین و آفرین بنوں۔

اسی وجہ سے دیوانِ اوّل یعنی "دیوانِ ریختہ" کو قلم بند کیا اور ۱۲۱۵ھ میں یہ دوسرا دیوان جو "دیوان بیختہ" کے نام سے مشہور ہے شروع کیا اور اس میں قید دوہری غزل لکھنے کی اختیار کی لیکن اکثر یہی

خیال رہا کہ غزل اوّل سے غزل دویم میں کچھ نہ کچھ صنعت زیادہ چاہیے
یعنی دوہری غزل جو مرقوم ہو تو پہلی بیٹھن اور دوسری جنس معلوم ہو
سو خدا نے اس قید کو نباہ دیا اور ۱۲۲۰ھ تک اس دیوان کو
مَیں نے مرتّب کیا۔ اس سال مَیں اور میرا افضل علی خاں نیاز
سفرِ کلکتہ میں ایک جا رہا کرتے تھے۔ وہ اکثر تفنّنِ طبع کے لیے
غزل ہزل کہا کرتے تھے جس کی مشق قدماء نے بھی کی ہے۔ ان
کی پاسِ خاطر سے مَیں نے بھی ہزل کی مشق شروع کر دی اور
تھوڑے سے دنوں میں تیسرا دیوان کہ مشہور بہ 'دیوان آمیختہ'
ہے تیار کیا۔ بعد چند روز کے مشق ریختی کہ ایجاد فقیر ہے اور مسودے
اس کے قدیم تحریر کیے ہوئے پڑے تھے۔ انھیں جمع کر کے
اور حال میں اور غزلیات وغیرہ سے اسے بھر کر چوتھا دیوان
کہ جسے 'دیوان انگیختہ' اور 'دیوان ریختی' بھی کہتے ہیں بنایا اور
چاروں کا 'چار عنصرِ رنگین' نام رکھا۔ پھر ۱۲۲۰ھ میں جو
دیوان پارسی کہ مشہور بہ دیوان 'حدیقۂ رنگین' ہے تصنیف
کرنا شروع کیا۔ مَیں نے اس دیوان کلّیات کو 'پنجۂ رنگین'
خطاب دیا۔ بعد ۱۲۳۵ھ میں ایک ہزار دو سو پینتیس اور پانچ
میں جو دیوان 'مجموعۂ رنگین'، کہ جو سترہ زبان میں نظم ہوا ہے
اور 'اخبار رنگین'، اور 'مجالس رنگین'، نے جو اختتام پایا تو مَیں
نے آٹھوں کا 'ہشت بہشت رنگین'، نام رکھا اور پھر ۱۲۳۶ھ
میں ایک نسخہ کہ جس کا نام 'امتحانِ رنگین' ہے نثر میں ہے۔ اسے مرقوم
کیا تو دیوان کو بہ خطابِ 'نورتن رنگین'، موسوم کیا اور آگے قلم بند کر دیا

اور اس کی یہی تاریخ تصنیف قرار پائی "قلم بند شد نورتن"
۱۲۳۶ھ

امید دار ہوں کہ جو سخن فہم اس واہیات کو دیکھے اپنی استعداد
کے مطابق اصلاح کرے اور اگر اصلاح نہ کرے تو نام بھی نہ دھرے"

نوٹ :۔ ایک دیوان بخیتہ ' مصنف کا خود نوشتہ ہے اور دوسرا طالب علم محمد ولی کا۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے ؛

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے غزل کا ایک اور مضمون عارفانہ مضمون ہے جس کو تصوف کا نام دیا گیا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں غزل ، مثنوی اور رباعی کو خاص طور پر متصوفانہ مضامین کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اور ان میں بھی غزل کو خاص طور پر اس لیے کہ غزل کی بنیاد عشق و عاشقی پر ہے اور تصوف کی بنیاد بھی عشقِ الٰہی پر رکھی گئی ہے عشق کے مختلف مضامین چاہے وہ حقیقی ہوں یا مجازی غزل میں بڑی آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ غزل کی زبان میں ایسی علامتیں اور اشارے بہ کثرت موجود ہیں جن کا تعلق مضامینِ عشقیہ کے بیان سے ہے لیکن تصوف کا موضوع صرف عشق ہی نہیں ہے تخلیقِ کائنات اور اس کا مقصد حقیقتِ ذاتِ الٰہی خالق اور مخلوق کا تعلق کائنات کی حقیقت ، روح کی حقیقت ' انسان کی حقیقت ، انسان اور خدا کا تعلق ، مجاہدہ ، معرفتِ الٰہی بہ کثرت ایسے مضامین ہیں جو تصوف میں شامل ہیں اور جن پر صوفیہ اور فلسفیوں نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ عربی ، فارسی اور اردو میں ان تصانیف کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ ہندوستان میں تصوف صرف نظریاتی یا علمی حیثیت سے ہی رائج نہ تھا بلکہ یہاں بہ کثرت ایسے صوفیہ ہوئے ہیں جن کے روحانی سلسلے برِ اعظم

میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں علی الہجویری جیسے صاحبِ تصنیف شامل ہیں۔ جن کی 'کشف المحجوب' تصوّف کی تاریخ میں اس سرزمین کی لکھی ہوئی ایک نہایت اہم اور مستند تاریخ ہے۔ ان کے علاوہ خواجہ معین الدین، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، خواجہ فریدالدین اور نصیرالدین چراغ دہلوی سے لے کر مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ تک اس تحریک کے کسی نہ کسی طرح ترجمان رہے ہیں۔ صوفیوں کی بدولت اور فارسی شاعری کے اثر سے تصوّف کے مضامین بھی اُردو شاعری اور ادب میں عام طور پر راہ پا گئے تھے۔ میر تقی میر، خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد بریلوی اور مصحفی سے لے کر اصغر گونڈوی اور حسرت موہانی تک سلسلہ قائم رہتا ہے۔

اگرچہ تصوّف کی بنیادی روایات طبیعت کا سوز و گداز، نفس کی مسکینی، مجاہدہ، ضبط و تحمل، مراقبہ، تزکیۂ نفس وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے علمی طور پر رنگین کو اپنی زندگی میں کوئی تعلق نہ تھا لیکن غزل کی روایات کا اتنا اثر انھوں نے بھی قبول کیا تھا کہ تصوّف کے بعض مضامین ان کے کلام میں بھی راہ پا گئے تھے۔ مثلاً ؎

نہ اپنے میں نہ بیگانے میں دیکھا[1] | جو رشتہ شمع پروانے میں دیکھا
نہ مسجد میں نہ بُت خانے میں دیکھا | جو جلوہ دل کے کاشانے میں دیکھا

ہو جلوہ گر کہیں سے تو اے نورِ عشقِ یار | خواہی حرم سے خواہ در سومنات سے

کام دن رات جیسے جام سے ہو | وہی کہ خسرو و سام[2] و جم ہے
ایک دم مرگ سے غافل مت ہو | عرصۂ زیست نہایت کم ہے

میرِ مجلس ہے تو ہی اور تو ہی صاحب خانہ ہے
تجھ سے ہی رونق ہے سب تو شمع ہر کاشانہ ہے

---

[1] 'دیوان ریختہ' ورق ۱۲ب [2] نام رستم پہلوان کے دادا کا

نہیں مصرف کا باغِ دہر میں جوں چوبِ شاریدہ
خجالت ہے مجھے اس اپنی بیکاری کے جینے سے

عاشق و معشوق دونوں لازم و ملزوم ہیں
ایک تو طالب ہے ان میں دوسرا مطلوب ہے

عشق سے عالم عالم ہو جو صحرا صحرا وحشت ہو
ہاموں ہاموں الفت ہو تو دریا دریا رقت ہو

عشق کو رنگیں نے یوں چھوڑا بہ قولِ ایک شخص کے
جوں وطن کو چھوڑ دے سوداگر خسارہ کھینچ کر

کیا[1] ہوا دیر میں تو قیصر و فغفور ہوا   آخرش طعمۂ مار و خورشِ مور ہوا

جہاں تک دسترس تیری ہے تو سب سے بھلائی کر
بھلائی کا بُرا ہرگز ثمر ہووے تو میں جانوں

تھا[2] جہاں مے خانہ برپا اُس جگہ مسجد بنی
ٹوٹ کر مسجد کو پھر دیکھا تو بُت خانے ہوئے

ہے یہ دنیا جائے عبرت خاک سے انساں کی بھی
بن گئے کتنے سبو اور کتنے پیمانے ہوئے

دریائے[3] بقا کا وہ شناور ہے   جو مثلِ حباب اپنی ہستی کو فنا جانے

دعوائے انا الحق تھا اسے تو ہی عجب کیا   جو خم ہوئی دار پہ منصور کی گردن

بلبلہ پانی کا ہے اپنے کو یوں پہچان تو   سوچ لے جی میں کوئی دم کا ہے بس مہمان تو

اِن اشعار میں وحدتِ[4] وجود اور وحدتِ شہود دونوں کا سلسلہ موجود ہے۔ فنا اور بقا کا مسئلہ بھی ہے۔ کائنات اور انسان کی حقیقت کا بھی ذکر ہے

---

[1] دیوان بجنتہ، ورق ۳۱/۱۳ [2] دیوان بجنتہ، ورق ۶۴/ب [3] دیوان بجنتہ، ورق ۶۴/۳

[4] صوفیوں کی اصطلاح میں کُل موجودات کو ایک وجود حق تعالیٰ کا جاننا اور وجود ماسوا کو محض اعتباری سمجھنا۔

لیکن اس قسم کے یہ اشعار تعداد میں اتنے کم ہیں کہ ان سے رنگین کے مسلک کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ؛

عشق اور محبت کے ساتھ شراب کا مضمون بھی غزل کے عام مضامین میں داخل ہے لیکن اس کے نمونے رنگین کے کلام میں بہت کم ملتے ہیں البتہ شیخ اور زاہد پر پھبتی کی بہت سی مثالیں ہیں ؛ ـــه

شیخ جی نے کیا خضاب اس طرح سونتے جوں ہیں ڈور پہ مانجھا

کہیے ہے شیخ کی یوں اہلیہ بلائیں ہوں

ہوئی ہے جب سے مری اس جناب سے نسبت

ریش سفید شیخ کے پیچھے عصائے سرخ

یوں ہے کہ جیسے ہوئے لہو آؤں کے تلے

سایۂ طوبیٰ میں جا کر بیٹھیو تم شیخ جی

یار تو اب اینڈتے ہیں تاک کے سائے تلے

یہ زاہد کی ناک پر گھٹا یا یہ گھٹا ہے ناسدانی کا

ای شیخ تری میں تو بندگی کا ہوں قائل شہتیر تری چھوٹی سی مسواک سے کم ہے

رنگین کی غزل کے اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس میں فنی اعتبار سے کوئی خاص اضافہ نہیں کیا اور نہ غزل میں ان کا کوئی ایسا منفرد رنگ ہے جو انھیں غزل کے اساتذہ سے ممتاز کر سکے۔ اگرچہ اپنے اشعار میں وہ جا بہ جا میر و سودا کا ذکر کرتے ہیں اور اکثر اپنے کلام کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ غزل کے میدان میں وہ میر و مصحفی سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کے یہاں نہ ویسی جذبات کی شدت

ـــه دیوان ریختہ ـــه دیوان ریختہ، ورق ۲۴۳/ب

بیان کی سادگی، زبان کی صفائی اور محاورے کی گھلاوٹ ہی جیسی میر کے کلام میں ملتی ہی اور نہ ویسا سوز وگداز اور حسرت و یاس کا غلبہ ہی۔ اس کی وجہ صاف ہی۔ غزل گوئی کے لیے خاص قسم کے مزاج کی ضرورت ہوتی ہی جسے میر کی زبان میں طبیعت کی دردمندی کہہ سکتے ہیں۔ رنگین اپنی رنگین زندگی میں اس دردمندی سے محروم تھے۔ اور یہ ایسی چیز ہی جس کی تلافی اکتساب سے نہیں کی جا سکتی۔ ہو سکتا تھا کہ حقیقت و معرفت شناسی خواجہ میر درد کی طرح ان کے کلام میں بھی ایک ایسا رنگ پیدا کر دیتی جو میر کے انداز سے مختلف ہونے کے باوجود غزل کے مزاج سے مناسبت رکھتا۔ لیکن جس قسم کی عیاشانہ زندگی رنگین گزار رہے تھے اس میں فقر و توکل، استغنا اور تزکیۂ نفس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رنگین کی طبیعت ایجاد کی طرف مائل تھی۔ اور اس کا ثبوت انھوں نے اپنی تصانیف میں جا بہ جا دیا ہی۔ غزل ایک روایتی صنف تھی جس میں علامات اور اشارات تک معین و مقرر ہو چکے تھے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کو بھی انھیں علامتوں اور اشاروں کے ذریعے سے پیش کیا جاتا تھا۔ رنگین ہر بات میں اپنا راستہ الگ نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن غزل جس بلندی پر پہنچ چکی تھی اس سے تجاوز کرنا تو درکنار اس کے قریب تک پہنچنا رنگین کے لیے دشوار تھا۔ رنگین کی غزل اردو غزل کی تاریخ میں اس عبوری دَور کا دوسرے درجے کا نمونہ ہی جس میں لکھنوی شعرا کی طرح محض خارجی متعلقات اور لوازمات کا ذکر نہ سہی اعلیٰ درجے کے جذباتی اشعار بھی صرف کہیں کہیں ملتے ہیں۔ البتہ اخلاقی پستی جو بعد میں لکھنؤ کے شعر و ادب میں ایک غالب عنصر بن گئی ان کے کلام میں بھی آہستہ آہستہ

راہ پاگئی ہی۔ اس کی ایک وجہ ان کی افتادِ طبع' پھر خاص قسم کے لوگوں سے ان کی صحبت اور زندگی کی بداعتدالیاں وغیرہ ذمہ دار ہیں۔ لکھنؤ کی خاص فضا نے اس سلگتی ہوئی آگ کو اور بھڑکا دیا[1]۔ لیکن غزل کی روایت پھر بھی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہی کہ رنگینؔ کی بعض مثنویاں اور ان کا ایک فحش ایوان جس رنگ کی ترجمانی کرتا ہی وہ 'دیوان ریختہ' یا 'دیوان بیختہ' میں نہیں پایا جاتا ؞

---

[1] لیکن یہ دَور لکھنؤ کی شاعری کا ہی جس میں رنگینؔ صرف ایک مختصر قیام کے گنہ گار ہیں۔

باب چہارم

مثنوی گوئی

رنگین کی مثنوی گوئی

اُردو میں مثنوی فارسی سے آئی اور یہی ایک ایسی صنف ہے جس کے لیے
ایرانی شاعر عربی شاعری کے مرہون منت نہیں ہیں۔ فارسی میں بے شمار
مثنویاں لکھی گئی ہیں جو رزمیہ، بزمیہ، اخلاقی، حکیمانہ، تاریخی وغیرہ مختلف
اصناف پر حاوی ہیں۔ فردوسی کا 'شاہنامہ'، نظامی کا 'خمسہ' اور سب
سے بڑھ کر مولانا روم کی مثنوی یہ سب فارسی میں مثنوی کے ارتقا کو ظاہر
کرتی ہیں۔ 'مثنوی مولانا روم' کا فارسی شاعری کی تاریخ میں جو پایہ ہے وہ
اس سے ظاہر ہے کہ اسے قرآن در زبان پہلوی کہا گیا ہے۔

فنی اعتبار سے مثنوی میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ غزل یا قصیدے کی
طرح اس میں شروع سے آخر تک ایک ہی ردیف و قافیہ کی پابندی نہیں ہے نہ
اس کے اشعار کی تعداد معین و مقرر ہے۔ ہر شعر ہم قافیہ ہوتا ہے اور شاعر
آزاد رہتا ہے کہ دوسرے شعر میں کوئی اور قافیہ اختیار کرے۔ اس لیے
مسلسل واقعات کے بیان کے لیے مثنوی سے بہتر کوئی اور صنف شاعری
کی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مثنویوں میں شعرا نے اپنے ذاتی حالات و معاملات،
تاریخی واقعات، عشقیہ کہانیاں، جنگوں کے حالات وغیرہ بیان کیے ہیں۔

اُردو میں مثنوی فارسی کے اثر سے شروع ہوئی۔ اس کا سب سے
بڑا ثبوت یہ ہے کہ عشقیہ یا تاریخی مثنویاں ہیں جو تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ
اور فنی اعتبار سے نہایت اہم ہیں مثنوی کا وہی ڈھانچہ ہے جو فارسی میں بنا ہے۔
عام طور پر مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ حمد کے بعد نعت اور منقبت کے اشعار

ہوتے ہیں۔ پھر بادشاہِ وقت کی مدح اور شاعر کے ممدوح کی تعریف میں چند اشعار ہوتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد مثنوی کا اصل قصہ شروع ہوتا ہے چناں چہ دکنی دَور سے لے کر میر و مرزا تک کے عہد میں بلکہ اس کے بعد تک یہی انداز قائم رہا۔

مضمون کے اعتبار سے مثنوی کے کئی حصے ہوتے ہیں عشقیہ یا تاریخی مثنوی میں سب سے پہلے قصہ آتا ہے۔ دکنی دَور کی اکثر مثنویاں فارسی سے ماخوذ ہیں۔ فارسی شعراء میں نظامی[2] اور امیر خسرو کی مثنویاں دکنی شاعروں کو خاص طور پر مرغوب نظر آتی ہیں۔ "طوطا[1] کہانی" کے نام سے جو مثنویاں دکن میں لکھی گئی ہیں ان کا اصلی ماخذ سنسکرت ہے لیکن دکنی شاعروں اور نثر نگاروں نے سنسکرت کے فارسی ترجموں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایسی مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں ملکی قصے کہانیاں بیان کیے گئے ہیں مثلاً 'رتن پدم' 'کدم راؤ' 'چندر بدن مہیار' وغیرہ۔ عام طور پر عشقیہ مثنویوں کی بنیاد فرضی قصوں پر ہوئی ہے لیکن ایسی مثنویاں بھی موجود ہیں جن کی بنیاد حقیقی واقعات پر رکھی گئی۔ چناں چہ مُلّا وجہی کی قطب مشتری میں شہزادہ قلی قطب شاہ کی داستانِ معاشقہ اس کے تحت میں آتی ہے۔

دکن کا دَورِ شاعری دراصل بنیادی طور پر مثنوی گوئی کا دَور ہے چناں چہ مُلّا وجہی سے لے کر ولی تک ہر قابلِ ذکر شاعر نے مثنوی پر طبع آزمائی کی ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں سب سے پہلی اہم مثنوی وجہی کی "قطب مشتری" ہے جس کی بنیاد شہزادہ قلی قطب شاہ اور اس کی تلنگن محبوبہ بھاگ متی کی داستانِ عشق پر رکھی گئی ہے۔ مثنوی کا قصہ طبع زاد ہے لیکن مثنوی کا پورا ڈھانچہ

---

[1] طوطی نامہ از غواصی جس کا ماخذ ضیاء الدین بخشی بدایونی کا طوطی نامہ ہے جو خود سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ [2] از نظامی شاعر خاندان بہمنی۔

فارسی مثنوی کے انداز پر قائم ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے کوئی طویل مثنوی نہیں لکھی ہے لیکن مختلف موسموں، تہواروں اور تقریبوں پر اس کی مختصر مثنویاں موجود ہیں۔ دکن میں مثنوی گوئی کا کمال نصرتی کی "گلشنِ عشق"، فائز کی "رضوان شاہ روح افزا"، ابن نشاطی کی "پھول بن" وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ اس دور میں رزمیہ مثنویاں لکھنے کا بھی رواج ہوا اور کمال خاں نے "خاور نامہ"[1] کے نام سے فارسی "خاور نامہ" کو سامنے رکھ کر "شاہ نامہ" کے انداز میں حضرت علیؓ کے کارناموں کو رزمیہ مثنوی کی شکل میں لکھا۔ غرض یہ سلسلہ ولی تک پہنچا ہے جن کی کلیات میں سورت کی تعریف میں ایک مثنوی موجود ہے۔

دکنی مثنویوں میں مثنوی گوئی کے فنی لوازم کا پورا خیال رکھا گیا ہے ان میں مناظر بھی ہیں اور جذبات نگاری بھی ہے۔ روزمرّہ بول چال اور مکالمے بھی ہیں۔ میدانِ جنگ کے نقشے بھی ہیں اور آرائشِ خوباں کا ذکر بھی۔ زبان چونکہ ابتدائی ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اس لیے وہ صفائی تو نہیں جو بعد میں میر حسن وغیرہ کے یہاں ملتی ہے لیکن اور سب حیثیتوں سے دکنی مثنویاں فنی اعتبار سے فارسی کی مثنویات کی ہم پایہ وہم پلّہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

شمالی ہند میں رنگین سے پہلے میر، سودا، قائم اور میر حسن وغیرہ مثنویاں لکھ چکے تھے۔ ان میں بھی بعض میں فرضی قصّے کہانیاں ہیں اور بعض کی بنیاد واقعات پر رکھی گئی ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے مثنوی کو جانچتے وقت کئی باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ قصّے کہانی کے سلسلے میں یہ بات دیکھنا چاہیے کہ شاعر نے

---

[1] ابن حسام کے خاور نامہ کا ترجمہ ہے جو خدیجہ بانو ملکہ محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ۱۰۵۹ھ میں ہوا۔

اپنے عہد کے مذاق کو پیش نظر رکھا ہے یا نہیں۔ مثلاً جس زمانے میں عام طور پر جنوں اور پریوں کی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں اور لوگ ان کے وجود پر کسی قدر یقین رکھتے ہوں اس زمانے میں مثنوی گو بھی ان واقعات کو ضرور نظم کرے گا۔ اگر کسی زمانے میں یہ واقعات خلاف عقل قرار پائیں تو کسی قدیم مثنوی کو اس نئے معیار پر نہیں جانچا جا سکتا۔

قصے کے ضمن میں طرح طرح کے حالات و واقعات پیش آتے ہیں۔ مختلف مناظر، موسم، تقریبات وغیرہ کے بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ مختلف عمروں، درجوں اور ریتوں کے عورتوں اور مردوں کے جذبات و کیفیات بیان کرنے کا موقع بھی آتا ہے اس طرح قصے کے بعد منظر نگاری اور جذبات نگاری پر زور دیا جاتا ہے اور مثنوی کی خوبی کا انحصار اس پر بھی سمجھا جاتا ہے کہ مثنوی میں مناظر اور جذبات کس قدر اصلیت اور جامعیت کے ساتھ ادا ہوئے۔

مثنوی بیانیہ قسم کی نظم ہوتی ہے اس لیے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بیانیہ انداز کیسا ہے۔ ہر شخص کی گفتگو اس کے کردار کو ظاہر کرتی ہے اور ہر کردار کی گفتگو کا الگ الگ انداز ہوتا ہے اس اعتبار سے مثنویوں میں ڈرامائی مکالموں کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ قدیم اردو ادب میں ڈراموں کی کمی کو یہی چیز پورا کرتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مثنوی نگار مختلف موقعوں، عمروں، درجوں کی مناسبت سے زبان اختیار کر لینے پر قدرت رکھتا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ زبان میں بلند آہنگی، الفاظ میں شان و شکوہ اور تشبیہات و استعارات کی کثرت ہو۔ بلکہ اس کے برعکس مثنوی کے لیے نہایت آسان، صاف اور سادہ زبان اور برجستہ انداز بیان درکار ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سودا جو

قصیدہ نگاری کی مشق کی بدولت نہایت مرصّع زبان استعمال کرنے کے عادی ہو چکے تھے مثنوی گوئی میں میرؔ سے بازی نہ لے جا سکے۔ اُردو کے تمام بہترین مثنوی گو جن میں میرؔ حسنؔ اور شوقؔ بھی شامل ہیں اس خیال کی تائید کرتے ہیں، اور ان کی مثنویاں زبان وبیان کے اعتبار سے سہل ممتنع ہیں۔

مثنوی نگار کو مناسبت کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مناسبت کا مطلب یہ ہے کہ کہانی کے اجزا ایک خاص تناسب رکھتے ہوں ان میں نہ بے حد طول ہو اور نہ بے جا اختصار۔ پھر جو بات کہی جائے مثنوی کے کسی دوسرے حصے سے اس کی تردید یا تکذیب نہ ہو جائے۔ اس نقطۂ نظر سے مثنوی گوئی خاصہ مشکل فن ہے اور اگرچہ بے شمار مثنویاں اردو میں لکھی گئی ہیں لیکن شہرت اور قبولِ عام کے اعتبار سے میرؔ حسنؔ کی مثنویاں "سحر البیان" اور "گلزار ارم" ایک اکیلا نمونہ ہیں۔ ان کے بعد نواب مرزا شوقؔ لکھنوی نے کچھ بلند پایہ مثنویاں لکھیں۔ بعض ناقدین شاید دیا شنکر نسیمؔ کی "گلزارِ نسیم" کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیں لیکن اس کی ساری خوبی صرف اس کی زبان وبیان پر منحصر ہے اور یہ زبان وبیان بھی لکھنؤ کے پُر تکلف تمدّن اور پُر تکلف معاشرت کی مرہونِ منّت ہے ان کے علاوہ جو مثنویاں لکھی گئی ہیں وہ دُوسرے درجہ کی ہیں۔ ایسی مثنویاں انشاؔ جراؔت، مصحفیؔ سے لے کر قلقؔ اور امیرؔ و داغؔ تک نے لکھی ہیں انیسویں صدی کے نصف آخر میں آزادؔ اور حالیؔ کی کوششوں سے نظم جدید کا جو انداز مقبول ہوا اس نے مثنوی گوئی کو فنی حیثیت سے ختم کر دیا چنانچہ دورِ حاضر میں حفیظؔ کے "شاہ نامہ" کے علاوہ مثنوی کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ نہیں ملتا۔

یہ بات عجیب نظر آتی ہے کہ میر کی چند مثنویوں کو چھوڑ کر شمالی ہند میں اردو کی بہترین مثنویاں لکھنؤ میں لکھی گئیں اس کی بنا غالباً لکھنؤ کا وہ بزمیہ انداز تھا جو دکنی دور کی طرح مثنوی گوئی کے لیے خاص طور پر سازگار ثابت ہوا۔

رنگین کی عشقیہ مثنویوں میں مثنوی "مہ جبین و نازنین" جو مثنوی "دل پذیر" کے نام سے بھی مشہور ہے سب سے پہلے قابلِ ذکر ہے مثنوی میں تاریخِ تصنیف نہیں ہے لیکن اس میں نواب وزیر علی کی تعریف کی گئی ہے جو آصف الدولہ کے بعد تقریباً پانچ ماہ کے لیے لکھنؤ کے تخت پر بیٹھے تھے اور ۲۱۔ جنوری ۱۷۹۸ء کو تخت سے اُتار دیے گئے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مثنوی وفات آصف الدولہ یعنی ۲۱۔ ستمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۲۸۔ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ وزیر علی کی تخت سے محرومی یعنی ۲۱۔ جنوری ۱۷۹۸ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔ لیکن اس مثنوی "مہ جبین" کی تاریخ لالہ مان سنگھ نے کہی ہے جس سے کتاب کی تصنیف کا سنہ ۱۲۱۳ھ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے:[1]

قصّۂ دل فریب رنگیں گفت	کہ از اں تازہ شد دماغ بہار
پئے تاریخ آں نمودم فکر	تا بیابم از اں سراغ بہار
از سرِ بام باغ ہاتف گفت	نظم ایں مثنوی ست باغ بہار

(۱۲۱۳ھ)

یہ تاریخ مثنوی مہ جبین کے آخر میں ہے جو پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

مثنوی میں اشعار کی کُل تعداد ۱۸۶۵ ہے مثنوی دل پذیر ایک عشقیہ قصّہ ہے جس میں مہ جبین و نازنین کی محبت کا حال نظم کیا گیا ہے قصّے کا خلاصہ یہ ہے:

"بلغار میں ایک بادشاہ خاور شاہ تھا جو باوجود دولت و سلطنت کے

---

[1] قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری نمبر 5 VII ۱۸۰۱ ورق ۹۲ ب

فرزند سے محروم تھا اس کو نجومیوں نے بتایا کہ اس کے ایک لڑکا تولد ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی ماں پری ہو اور جب تک وہ چودہ برس کا نہ ہو جائے کوئی تصویر نہ دیکھے اور اس کے پاس کاغذ تک بھی نہ آنے پائے۔ پڑھنا تو درکنار۔ وزیر روشن رائے نے کہا کہ جس کے پاس خاتم سلیمان ہو اس کے قبضے میں جن و پری ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ پری حاصل کرنے کے لیے پریشان ہُوا تو وزیر روشن رائے نے کہا کہ بلغار سے چند کوس کے فاصلے پر ایک پہاڑ ہے وہاں حق شناس نامی زاہد رہتا ہے اس کی عمر دو سو سال کی ہے۔ خاور شاہ وزیر کے ساتھ زاہد کے پاس پہنچا۔ زاہد نے خاطر تواضع کے بعد کہا کہ خاتم سلیمانی تو قلزم میں ہے تجھے نہ مِل سکے گی۔ البتہ ہاروت اور ماروت کی کتابوں میں جادو ہے اور یہ کتابیں کوہ قاف میں ایک سحر کے حصار میں ہیں اگر تو حصار کو قبضہ میں کرلے تو مطلب حل ہو جائے گا۔ ترکیب یہ ہے کہ حصار کے پاس جاکر معتکف ہو جا اور اپنے چاروں طرف ایک خط کھینچ کر یا اسم اعظم پڑھ اور زن جادوگر کو تسخیر کر۔ حق شناس زاہد نے بادشاہ کو اسم اعظم سکھایا بادشاہ نے عاقل وزیر کو اپنی جگہ چھوڑا۔ حق شناس، خاور شاہ اور روشن رائے وزیر دویم روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک پہاڑ کے پاس آئے جو کوہ قاف کے برابر تھا اور جس میں ہر قسم کے درخت کثرت سے تھے۔ اس پہاڑ پر ایک شاندار گنبد بھی تھا۔ یہ لوگ گنبد کی سیر کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں قفل پڑا ہُوا تھا۔ بادشاہ نے اسم اعظم پڑھا تو قفل کھُل گیا اور تینوں کے تینوں گنبد میں داخل ہو گئے۔ اس گنبد میں ایک قفس آہنی آویزاں دیکھا جس میں ایک قمری محبوس تھی۔ قمری کو مصیبت میں دیکھ کر شاہ نے ایک ساعت تک جو اسم اعظم پڑھا تو طلسم ٹوٹ گیا۔ قمری نے بادشاہ کو دعا دی اور پرواز کر گئی۔ موکل

دیوِ قمری کے آزاد ہوتے ہی زنِ جادو کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ تین آدم زاد آئے ہیں انھوں نے قفلِ جادو توڑ دیا ہے۔ دیو مقابلے کے لیے آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پر دھواں چھایا ہوا ہو۔ اس حصار کے چاروں طرف توپیں چُنی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور چاروں ہی طرف گہری خندق بھی جس کے سامنے قلزم بھی شرماتا تھا۔ حصار میں ایک چشمہ تھا جس کے کنارے تک حق شناس آیا۔ بادشاہ وغیرہ نے حصار پہ قبضہ کرنے کے لیے ایک خط اپنے چاروں طرف کھینچ کر اسم اعظم پڑھنا شروع کیا تو دیو حصار سے باہر مختلف صورتوں میں نکلے کوئی شیر کی شکل میں کوئی کچھو وغیرہ کی۔ یہ دیو بادشاہ اور وزیر کو ڈراتے تھے لیکن حق شناس دانا آدمی تھا اس نے کہا کہ ہرگز نہ ڈرنا۔ خط کے نزدیک کوئی دیو نہ آتا تھا پوری ایک رات گزرنے کے بعد سب کے سب دیو حصار میں واپس ہوگئے۔

جادو کے زور سے انگارے اس طرح برس رہے تھے جیسے نوارے چھوٹ رہے ہوں یہ سب کچھ خط کے باہر ہی باہر ہو رہا تھا۔ رات ختم ہونے کے بعد اسم اعظم کی بدولت حصار کا ایک برج گرا۔ زنِ جادو نے جب یہ دیکھا تو کہا کہ میں اژدہا بن کر ان تینوں کو کھالوں لیکن جب کچھ بس نہ چلا تو زنِ جادو نے مردِ نابینا کا بھیس بھرا اس طرح کہ گردن میں کاٹھ کی تسبیح اور ہاتھ میں ایک عصا لے کر کہا کہ میرا کوئی مددگار ہے تو میری مدد کرے کہ مجھے زنِ جادو نے اندھا کر دیا ہے۔ بادشاہ اس بوڑھے نابینا کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن حق شناس نے روک دیا۔ زنِ جادو اسم اعظم کے زور سے مسخر ہوگئی اور بادشاہ سے کہا کہ میری جان بخشی ہو میں آپ کے

کام آؤں گی۔ بادشاہ نے پری کا مطالبہ کیا تو زنِ جادو نے کنکریوں پر جادو پڑھ کر چاروں طرف پھینکیں۔ پری جو قمری بنی ہوئی تھی اور جس کو قفس سے بادشاہ نے نکالا تھا آموجود ہوئی۔ اس پری کا نام ماہ لقا تھا۔ بادشاہ پری کو لے کر وطن روانہ ہوا۔ رستے ہی میں لڑکا تولد ہوا جس کا نام مہ جبین رکھا گیا۔ حق شناس بادشاہ کے محل میں کئی روز رہ کر واپس چلا گیا۔ جب مہ جبین چار برس کا ہوا تو بادشاہ کو مکتب بھیجنے کا خیال آیا لیکن لڑکے کو پڑھانے کی پہلے ہی ممانعت کر دی گئی تھی اس لیے بادشاہ اپنے ارادے سے باز رہا جب چودہ برس کا ہوا تو بادشاہ نے اپنا ولی عہد بنا دیا۔ دانش ور جو عاقل وزیر کا بیٹا تھا مہ جبین کا مشیر اور وزیر بنایا گیا۔ مہ جبین نے ایک روز تمام شاہی سامان دیکھنے کے لیے منگایا اور خاص طور سے کتب۔ ان کتابوں میں سے اس نے ایک مرقع اٹھا کر ایک تصویر دیکھی جو بہترین تھی۔ اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا کسی نے صندل سنگھایا کسی نے بید مشک پلایا جب ہوش آیا تو دانش ور کے علاوہ سب کو دیوانِ خاص سے علحدہ کر دیا۔ غم کی وجہ سے مہ جبین کے منھ پر جھائیاں پڑ گئیں تھیں۔ دانش ور نے کہا کہ مہ جبین یہ بات ٹھیک نہیں آپ غم نہ کریں یہ بتائیں یہ شبیہ ہے کس کی تاکہ میں آپ کا کچھ علاج کر سکوں۔ مہ جبین نے کہا مجھے معلوم نہیں یہ کس کی تصویر ہے لیکن میرے دل پر اس کا اثر بہت ہی ہوا ہے یہ تو کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے یا تو اسے حاصل کر دو یا مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ دانش ور نے دو گھوڑے منگائے اور جواہرات لے کر دونوں کے دونوں وطن سے سدھارے۔

دو برس تک مارے مارے پھرے اور شہزادی کا کچھ پتہ نہ چلا۔
صفاہانؔ[1] اور فرنگ وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ یہ دونوں ایسے جنگل میں جا پھنسے جہاں پانی تک بھی میسر نہ آیا۔ آخر کار تھکے ماندے ایک کوہ کے پاس پہنچے جہاں نہر بھی تھی اور سایہ دار درخت بھی۔ بھوک لگتی تو پھل کھا لیتے۔ اس پہاڑ سے آگے بڑھ کر ایک میدان میں قیام پزیر ہوئے تو لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور وہاں کی رانی کو خبر دی کہ ایک خوش شمائل انسان یہاں مقیم ہے۔ دانش ور اور مہ جبین عمدہ عمدہ کپڑے پہن کر رانی کے دربار میں پہنچے رانی نے مہ جبین سے محبت آمیز باتیں کیں اور اپنا مکان رہنے کے لیے دیا جہاں مہ جبیں اور دانش ور پہنچے تھے۔ یہ جادو کا میدان تھا جو بھی رانی کا کہا نہ مانتا اس کو بیل یا شیر بنا دیتی اور ان میں اکثر شاہزادے اور تاجر ہی ہوتے تھے۔ مہ جبین نے رانی کی فرستادہ دائی سے کہا کہ میرا دل تو دوسرے کی طرف لگا ہوا ہے میں اس رانی سے کیسے التفات کر سکتا ہوں۔ دائی نے مہ جبین سے کہا کہ تمھیں راضی ہو جانا چاہیے لیکن وہ نہ مانا تو دائی نے رانی سے اس کی نارضامندی کا اظہار کیا چناں چہ رانی نے کچھ پڑھا اور مہ جبین مینڈھا بن گیا اور خصلت بھی مینڈھے ہی کی سی ہو گئی۔

میخ کے گرد طوف کرنے لگا   متوحش ہو خوف کرنے لگا
ہو گئی اس کی قلب ماہیت   نہ رہی شکل وہ نہ وہ صورت

یہ تمام باتیں دیکھ کر دانش ور رونے لگا ؎

رات کو دائی روز آتی تھی   پانی دانہ وہ ڈال جاتی تھی

مہ جبین کو بغیر کھائے پیے کتنے ہی دن گزر گئے وہ وزیر سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کر سکتا تھا۔ رات کو جب دائی دانہ پانی لے کر آئی تو

---

[1] اصفہان

دانش ور نے اس کے قدموں پر گر کر کہا کہ ہمیں رہائی دلاؤ۔ اس نے رہائی کے بارے میں تسلی دلائی۔ دائی نے آدھی رات کے وقت یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک ہوا آئی۔ وہ ایک سحر تھا۔ جب دائی نے کچھ پڑھا تو وہ درخت آگے نہ بڑھا اور اس سے ایک پری غضب میں بھری ہوئی اُتری اور دائی پر بہت ہی خفا ہوئی۔ اس پری کا نام مہارانی تھا اور سراندیپ کی مالک تھی۔ مہارانی نے دائی سے پوچھا کہ مہ جبین کا کیا قصور تھا کہ اسے مینڈھا بنایا گیا۔ دائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ رانی اس پر عاشق ہے آپ اگر اس کی جان بچائیں تو اچھا ہو۔
مہارانی نے ماش کے کئی دانے پڑھ کر اس کے ماتھے پر مارے تو مہ جبین انسان بن گیا۔ مہارانی نے مہ جبین کو بھی اپنے ساتھ ہی اپنے جادو کے درخت پر بٹھا لیا۔ مہارانی سے جب مہ جبین نے پوچھا کہ تم کہاں جاؤگی تو اس نے یہ کہا۔

سات سو کوس یہاں سے ہے اجین   خلق کرتی ہے ساری واں کی چین

اس کے بعد کہا کہ وہاں کا راجہ بنسی دھر[۵] ہے اس کے بیٹے پرتھی راج پہ میں عاشق ہوں اور وہاں ہر رات جاتی ہوں۔ مہارانی نے کہا کہ ہم اور تم بھائی بہن ہو گئے اور جس چیز کی تمھیں ضرورت ہو مجھ سے کہو۔ مہ جبین نے کہا کہ میری تصویریں پہ میں مفتون تھا وہیں رہ گئی جہاں سے ہم آرہے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں اجین آگیا اور درخت نیچے اُترا۔ مہ جبین سے مہارانی نے کہا کہ تم رات بھر یہیں بیٹھے رہو ؎

دیکھیو راہ میری بیٹھے یہیں   مجھے بیٹو جو اُٹھ کے جاؤ کہیں

---

[۵] پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک میں راجہ کا نام بنسی دھر ہے اور دوسرے میں جیت سنگھ ؎

واں کے راجہ کا جیت سنگھ ہے نام   اس کا پرجا کو پالنا ہے کام

صبح ہوتے مہارانی نے آکر کہا کہ بھائی مہ جبین اب تو میرے گھر چل صرف دو گھڑی کا رستہ ہے۔ مہ جبین راضی نہ ہوا پھر مہارانی نے ایک منتر بتایا اور کہا کہ اسے دو سال تک پڑھتے رہنا۔ اس کے ذریعے جہاں چاہے گا چلا جایا کرے گا یہ دو سال کی مدت اس منتر کی زکوٰۃ ہے ؎

پڑھیو تو دو برس تلک دن رات پوری ہو جائے تاکہ اس کی زکات[1]

پھر یہ دونوں مہارانی کا دیا ہوا زیور بیچ کر اور کچھ دن اوجین میں قیام کر کے اجمیر گئے اور وہاں سے بیکانیر۔ اوجین میں انھوں نے جو سامان اور گھوڑے وغیرہ خریدے تھے دام نہ ہونے کی وجہ سے انھیں بیچنا پڑا۔ سب جگہ گھوم گھام کے بنارس پہنچے اور وہاں سوداگری شروع کر دی۔ چوراہے پر ایک دوکان لی اور یہ تصویر بھی دوکان میں لگا دی اس خیال سے کہ شاید گاہکوں میں سے کسی سے اس کا پتہ چلے کہ یہ کس کی ہے۔ چناں چہ ایک گاہک نے اس تصویر کو پہچان کر کہا ؎

وہ تو رانی سری نگر کی ہے شاہ زادی وہ اپنے گھر کی ہے

اس رانی کا نام نازنیں بتایا ہے اور عمر پندرہ سال۔

اس مرد نے یہ بھی کہا کہ نازنیں مردوں سے نفرت کرتی ہے اور مارتی بھی ہے۔ مہ جبین نے کہا کہ تم یہ تو بتاؤ کہ اس کی پسندِ خاطر کیا چیز ہے۔ مرد نے جواب دیا کہ اس کو راگ اور نَے یعنی بانسری سے خاص رغبت ہے۔ مہ جبین اور دانش ور دونوں کے دونوں ہی ان چیزوں میں طاق تھے۔ دانش ور اور مہ جبین سری نگر میں پہنچ کر نازنین کے باغ میں پہنچے۔ باغ اور اس کی چہار دیواری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آگے آئے گا (ملاحظہ ہو ۱۵؎)

---

[1] ق۔ ن زکات، اعمال و وظائف کی زکوٰۃ

مہ جبین اور دانش در باغ کی خوب سیر کرکے اپنے مقام پر آکر کہا کرتے کہ یہ تو بہشت ہے۔ ایک دن صبح کو نماز کے بعد دونوں بانسری بجانے لگے اور باری باری سے گانے لگے۔ جو خادمائیں پھول توڑتے آئی تھیں وہ سب کی سب گانا سُن کر پھول توڑنے بھول گئیں اور دوپہر ہوگیا۔ پھول بھی گرمی سے مُرجھا گئے۔ لڑکیوں کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑا۔ نازنین ان پر بہت ناراض ہوئی تو انھوں نے کہا ؎

ایک دو شخص گاتیاں تہن وہاں ۔۔۔ اور نی کو بجاتیاں تہن وہاں

نازنین نے ان دونوں کو بلوایا۔ مہ جبین و دانش ور زنانہ لباس میں محل میں چھ گھڑی دن سے پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ ہولی کا شور و غل ہے ؎

اور اُڑتا ہے وہاں عبیر و گلال ۔۔۔ کہ زمین و زماں ہیں دونوں لال

اس کے بعد نازنین نے دریا کے کنارے شام کے وقت روشنی اور آتش بازی کے انتظام کرنے کا حکم دیا ؎

لبِ دریا پہ بلّیوں کو گاڑ ۔۔۔ باندھے ٹھاٹھر انھوں نے جیسے پہاڑ

آگے آتش بازی کے چھوٹنے کا نقشہ کھینچا ہے۔ غرض رات کو مہ جبین اور دانش وَر بھی نازنین کے ساتھ یہ تماشا دیکھنے آئے۔ نازنین کے چہرے پر گلال پڑا ہوا ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے چاند شفق میں نظر آتا ہے ؎

تو یہ عالم ہے اس کے چہرے پر ۔۔۔ چاند جیسے شفق میں آئے نظر

نازنین کی وزیر بہرہ ور نے ہولی کا انتظام اس طرح کیا کہ تین چار ہزار ہاتھی منگا کر رنڈیوں کو سوار کیا اور سب کے ہاتھوں میں پچکاریاں دے کر نازنین کے پاس لائی اور وہ سب رنگین کی یہ غزل گاتی ہوئی آئیں: ؎

ہے جی میں منائیے ہولی ۔۔۔ اور وہ اس کو سنائیے ہولی
پاس اس کے اور بجا کر دف ۔۔۔ اب کے ہولی میں گائیے ہولی

---
[1] تھیں

نازنین کوٹھے پر تھی اور بہرہ دریچے۔ دونوں کی طرف سے خوب پچکاریاں چل رہی تھیں۔ ہولی کھیلنے کے بعد مہ جبین اور دانش ور بھی مجرے کے لیے آئے جب ادب سے مجرئی کر لیا تو نازنین نے مہ جبین سے نام پوچھا۔ اس نے کہا میرا نام نور بائی ڈومنی ہے۔ دانش وَر سے بھی نام پوچھا تو اس نے کہاے

یہ "تفضیلت" ہے نور بائی کی ہے یہ ہندی دوانہ دائی کی

مہ جبین باقاعدہ زیور پہنے ہوا تھا لیکن دانش وَر بغیر گہنے ہی کے تھا۔ دو گھڑی شب رہے نازنین کوٹھے سے اُتر کر اپنی خواب گاہ کی طرف آئیے

ساتھ تھے مہ جبین و دانش وَر آئے کوٹھے سے وہ بھی دونوں اُتر

جب ان دونوں نے خواب گاہ کو دیکھا تو باغ کو بھول گئے۔ اس مکان کے رنگ بھی مختلف تھے۔ آئینہ کوئی بھی دس گز سے کم کا نہ تھا۔ جب نازنین اپنا دوسرا لباس اور زیور بدل کر خواب گاہ سے باہر آئی تو مہ جبین اسے دیکھ کر مرہی تو گیا اور مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر نازنین نے اوروں کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا اور نور بائی سے گانے کے لیے کہا تو دونوں نے مل کر گانا شروع کیا ے

تال اور سُر سے گٹھ کے وہ لیں بھیر دیں پھونکنے لگے نے ہیں
یہ گانا بجانا سُن کر خواصوں کے بھی ہوش اُڑ گئے ے

نازنیں کا بھی تھا عجب عالم کہ وہ مارے مزے کے تھی بے دم

کبھی روتی کبھی زانو پر ہاتھ مارتی۔ مہ جبین زیادہ سے زیادہ اچھا گانے کی کوشش کرتا تھا۔ مزے میں آکر نازنیں نے کہا ے

مجھ کو سوگند ہے بھوانی کی اور قسم ہے مجھے جوانی کی
مانگے اس وقت تو کچھ مجھ سے نہ رکھوں وہ دریغ میں تجھ سے

۱ے ستیو بی کی استری۔

مہ جبین نے کہا کہ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں تنہائی ہوئی تو مہ جبیں نے کہا تمھیں مرد سے نفرت کیوں ہے۔ نازنیں کو یہ سُن کر غصّہ آیا لیکن پھر قسم کا خیال آگیا اور اپنی سرگزشت سُنائی کہ مَیں پچھلے جنم میں فاختہ تھی میرا نر میری محبّت کا دعویٰ بہت کیا کرتا تھا۔ ایک جنگل میں ایک درخت پر ہمارا گھونسلا تھا۔ مَیں نے انڈے دیے اور دس دن کے بعد ان سے بچّے نکلے اتّفاق سے اس جنگل میں دَوں[1] لگ گئی۔

کہ لگی دَوں تمام جنگل میں نہ رہا خس کا نام جنگل میں

یہ آگ میرے درخت تک بھی آپہنچی میرا نر وہاں سے اُڑ بھاگا۔ مَیں نے بتیرا ہی کہا کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جا لیکن اس نے ایک نہ سُنی مَیں اپنے بچوں سمیت جل کر خاک ہوگئی ؎

دے کے "جوتی سروپ" نے پھر جان اب جو پیدا کیا مجھے انسان
اور اس سرزمیں کا سونپا راج خلق کو کر دیا میرا محتاج
تو یہ مَیں نے کیا جی میں قرار کہ نہ مَیں چھوڑوں مرد کو زنہار
مُلک ہے بس جہاں تلک میرا حکم ہے یہ وہاں تلک میرا
کہ سُنیں جس جگہ میں مرد کا نام کریں بِن پوچھے اس کا کام تمام

سب کچھ کہنے کے بعد مہ جبین سے کہا کہ یہ راز افشا نہ ہو جائے ؎

تجھ سے گر بات کُھل یہ جائے گی تو سزا اپنی بس تو پائے گی

بہرہ در کو حکم ہُوا کہ مہ جبیں کو زر و جواہر خوب دو۔ اس نے نازنیں کے کہنے سے بھی زیادہ دیا۔ پھر یہ دونوں روزانہ دربار جا کر گاتے بجاتے اور نازنیں کو رجھاتے۔ جب ہولی کا زمانہ ختم ہُوا تو یہ دونوں وہاں سے بھاگے کئی دن تک رات دن چلتے ہی رہے۔ نہ کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ بنارس

---

[1] آگ

پہنچ کر پانچ سو جوان پندرہ پندرہ سال کی عمر کے ملازم رکھے اور یہ یہ ہتھیار ان کے لیے خریدے ؎

چار آئینہ - چلتہ[1] و بکتر[2] زرہ و خود و بلم و خنجر
پیش قبض و کٹار و تیغ و سپر بٹہ و بیچک[3] و کمان و تبر
خنٹت فولاد و تیر و ساز تفنگ جو کچھ آتا ہے کام روز جنگ

نازنیں کی سرحد پر پہنچ کر مہ جبیں نے ان سے کہا ؎

اور تم کر لو سب زنانہ بھیس کوئی لو چادر اوڑھ کوئی کھیس

پھر یہ سب کے سب رنڈیوں کا بھیس بھر دو دو چار چار ہو کر سری نگر میں داخل ہو گئے - مہ جبیں اپنے ساتھ پچاس جوانوں کو بھیس بدلا کر لے چلا - رستے میں لوگ پوچھتے تو کہتے کہ منت مانی تھی اس لیے بنارس سے آرہے ہیں اور جوالا کو جا رہے ہیں -

سری نگر میں یہ سب جمع ہو کر نازنیں کے باغ کی طرف گئے - دروازہ بند پا کر مہ جبیں نے کمند لگائی اور چڑھ کر دروازہ کھولا - سپاہیوں کو دروازے پر بٹھا کر کہا کہ صبح کو جو یہاں آئے بچ کر نہ جائے - رات کو جتنی چوکیدار تھیں سب کو مار ڈالا - صبح کو مالنیں آئیں دروازہ دیکھ کر گھبرائیں - سپاہیوں نے انھیں بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا - کوئی ایک آدھ بچی تو اس نے جا کر نازنیں سے یہ ماجرا بیان کیا - نازنیں نے بہرہ ور کو حکم دیا کہ رنڈیوں کی فوج لے کر باغ کی طرف جاؤ - عورتوں کو مردہ پا کر افسوس کیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ ان میں سے کوئی زندہ جانے نہ پائے لیکن ہوا اس کے برعکس کہ کوئی عورت بھی زندہ نہ بچی سوائے ایک کے تب تو بہرہ ور نے مہ جبیں کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا کیوں کہ

---

[1] چلتہ :- مضبوط اور نرم کپڑے یا چمڑے کا لباس جسے زرہ یا بکتر کے نیچے پہنتے تھے تا کہ سپاہی کا جسم محفوظ رہے۔ [2] زرہ [3] پیچ دار نال کا تپنچہ

مہ جبیں اب مردانہ لباس میں تھا اس لیے بہرہ ور اسے پہچان نہ سکی اور کہا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ دانش ور نے کہا کہ ہم صرف رانی ہی سے بات چیت کریں گے۔ بہرہ ور نے رانی سے ساری باتیں کہہ سنائیں اور کہا کہ دشمن توی ہے ہم اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ نازنیں مجبور ہو کر باغ کی طرف آئی تو مہ جبیں کا حکم یہ ہوا کہ صرف نازنیں اور بہرہ ور ہی آئیں جب دانش ور نازنیں کو اندر لے کر گیا تو نازنیں نے مہ جبیں کو اس حالت میں دیکھا ؎

سر سے پا تک ہے اُدیچی[1] میں جڑا   منھ کے آگے ہے پر نقاب پڑا

نازنیں نے دانش ور سے کہا کہ ان سے یہ تو پوچھو کہ منھ پر نقاب کیوں ہے اور انھوں نے اتنی رنڈیوں پر ظلم کیوں کیا ہے۔ دانش ور نے کہا کہ اس کا جواب میں دیے دیتا ہوں لیکن نازنیں نے مہ جبیں سے مخاطب ہو کر کہا ؎

کہ اجی لو تمھیں سناؤ جی   ہم کو اب سچ ہی سچ بتاؤ جی

مہ جبیں نے کہا کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں خدا سے عہد کیا ہے کہ جہاں کہیں بھی رنڈیوں کی خبر سنوں جب تک انھیں مار نہ ڈالوں، تب تک کھانا حرام ہے۔ نقاب اس لیے ڈالا ہے کہ کسی عورت پر بُری نظر نہ پڑے۔ نازنیں نے کہا رنڈیوں سے اتنی نفرت کیوں ہے مہ جبیں نے نقاب اُلٹ کر نازنیں سے کہا ؎

قصّہ یہ سخت درد و غم کا ہے   ماجرا کچھ یہ اس جنم کا ہے

نقاب اُٹھنے کے بعد نازنیں کی جو نظر پڑی تو مفتون اور شیدا ہو گئی۔ بہرہ ور تاڑ گئی کہ یہ مہ جبین پر مفتون ہو گئی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر مہ جبیں سے کہا کہ وہ قصّہ تو سناؤ ؎

---

[1] مُسلّح، لیکن یہاں شاعر نے "اودیچی" ہتھیاروں یا زرہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تھی حقیقت جو فاختہ کی یاد　　سب وہ بس مہ جبیں نے کی ارشاد
بالکل نازنیں ہی کی طرح کا قصہ سُنا دیا ؎
یعنی اُڑ کر چلی گئی مادہ　　چلا بچّوں پہ بس یہ دل دادہ
یہاں جب اس نے سخن کو پہنچایا　　تب وہیں نازنیں نے فرمایا
ہو تمھیں چور اور تمھیں ہو چتر　　اپنی خفّت رکھو ہو کیوں مجھ پر
ایک تو رشتۂ محبّت توڑ　　اُڑ گئے آگ میں مجھے تم چھوڑ
دُوسرے اب یہ نام دھرتے ہو　　مجھ کو مطعونِ خلق کرتے ہو
گئے تم صاف وہاں سے نکل　　رہی بچّوں سمیت مَیں وہاں جل
مہ جبیں نے کہا مجھ سے جھوٹ نہ بول ذرا شرم کر۔ دونوں کی باتیں سُن کر بہرہ ور نے جھک کر سلام کیا اور کہا کہ تم پہلے جنم میں جوڑا تھے۔ قدرت نے علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ پچھلی باتوں کو چھوڑو اور جورو خصم بن کے رہو۔ نازنیں نے کہا کہ بہرہ ور تو ایسی باتیں نہ کر۔ دانش ور نے کہا کہ مہ جبیں میرے کہنے سے باہر نہیں۔ بہرہ ور تم نازنیں کو تیار کرلو۔ بہرہ ور نے دانش ور سے کہا ؎
ہم ہیں جاں ایک اور قالب دو　　کیا خبر ہی بسنت کی تم کو
پوچھنا مجھ کو بھی نہیں درکار　　کروں جو چاہوں مَیں بھی ہوں مختار
کوئی تاریخ اچھّی ٹھیراؤ　　شوق سے بیاہنے کو پھر آؤ
یہ سُن کر مہ جبیں نے فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں بہ شرطے کہ نازنیں مسلمان ہو جائے۔ بہرہ ور نے کہا کہ جو تمھاری مرضی۔ مہ جبیں نے کلمہ پڑھا دیا اور بہرہ ور نے نجومیوں کو بُلا کر شادی کا دن مقرّر کر دیا۔
بہرہ ور نے کہا کہ شادی دھوم دھام سے ہوگی آپ کسی میدان کو پسند

کرلیں جہاں ڈیرے تنبو لگوا دیے جائیں۔ مہ جبین نے تین چار کوس کے فاصلے پر ایک جگہ پسند کرلی وہاں شادی کی رسم ادا ہوئی اور اس کے بعد بہرہ ور کی شادی دانش ور سے ہوئی۔ مہ جبین و نازنین تو جادو کے درخت پر سوار ہوکر شہر یلغار کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ سحر مہارانی سراندیپ کا بتایا ہُوا تھا۔ دانش ور اور بہرہ ور سری نگر میں ہی سلطنت کرتے رہے۔

مثنوی کا آغاز حسب دستور حمد سے ہوا ہے ؎

حمد کا ہو سکے ہے کس سے بیاں قاصر اس جا ہے انبیاء کی زباں
کیوں کہ بے چوں و بے چگوں ہے وہ اور بے شبہ بے نموں ہے وہ
عقل گو پَر لگا کے اُڑ جاوے کُنہ کو اس کی پر یہ کب پاوے

حمد کے اڑتالیس[۴۸] اشعار کے بعد چھبیس[۲۶] اشعار نعت کے اور اکیس[۲۱] اشعار حضرت علیؑ کی منقبت میں ہیں۔

مناجات کے پندرہ اشعار میں بارہ باتوں کے لیے خدا سے اس طرح دعا مانگتے ہیں :؎

ایک یہ جب تلک جہاں میں رہوں کچھ اذیت جہاں کی میں نہ سہوں
دوسرے مال و جاہ دے مجھ کو پر رکھوں اس میں یاد میں تجھ کو
تیسرے والدین میرے مدام مجھ سے راضی رہیں بہ حقِ کلام
چوتھے بھائی جو ہیں میرے دو چار یہ سلامت رہیں بہ عزّ و وقار
پانچویں میری آل[۱] اور اولاد رہے دائم جہاں میں خرّم و شاد
اور چھٹے ہو یہ مثنوی مشہور اس گنہ گار کو ہے یہ منظور
ساتویں یہ ہے جب کہ مرنے لگوں ثابت ایمان لے جہاں سے اُٹھوں
آٹھویں کچھ عذاب قبر نہ ہو کہ بہت اس سے خوف ہے مجھ کو

---

[۱] اولاد، نسل، خاندان، نواسا نواسی وغیرہ

ہے نویں یہ (صراط) پر سے ادھر گزروں اور کچھ نہ آئے مجھ کو خطر
دسویں یہ ہے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ہی لوں میں سنبھال
گیارھویں یہ دعا ہے روزِ جزا ہوئیں حامی مرے رسولِ خدا
بارھویں دیکھوں وہاں ترا دیدار اور کچھ اس سوا نہیں درکار

ان اشعار سے رنگین کی طبیعت کی سلامتی کا شبہ ہوتا ہے۔ خدا کی یاد، ایمان کا ثابت رہنا، عذابِ قبر سے بچنے کی دعا، رسولِ خدا کو حامی بنانا اور خدا کے دیدار کی خواہش ایسی چیزیں ہیں جو رنگین کے فحش کلام اور اس کی خوش باش زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ اشعار محض رسمی ہیں اس کے بعد شاہ عالم کی تعریف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سیاسی فضا سے طبیعتوں میں جو افسردگی پیدا ہوئی تھی اور جو شاعروں کے کلام میں عام طور پر جھلکتی ہے اس سے رنگین بھی متاثر تھے۔ مناجات میں یہ تین شعر خاص طور پر قابلِ غور ہیں: ؎

(۱) ہے ہمیشہ سے اور رہے گا مدام ہیں یہ نیرنگیاں بس اس کی تمام
(۲) چاہے عبرت کی خاطر عالم میں شاہ کو وہ گدا کرے دم میں
(۳) تخت چاہے کرے گدا کے نصیب نہیں کچھ دور اس سے سب ہے قریب

دلّی میں اورنگ زیب کی وفات سے رنگین کے زمانے تک پے در پے جتنے سلاطین حکمران رہے تھے اور جن میں سے بعض نے صرف چند ماہ یا چند دن حکومت کی تھی اور جن کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا تھا ان سے اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا کوئی تعجب نہیں ہے۔ مثنوی میں رسمی طور پر شاہ عالم کی مدح بھی ہے۔ یہ مدح صرف چار اشعار پر مشتمل ہے اور پہلا ہی نقرہ شاہ عالم

---

[1] مثنوی دلپذیر ناز"، قلمی نسخہ ورق ۱۳ ب، ۱۳۱۲ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

پر ایک طنز معلوم ہوتا ہے :[1]

(۱) شاہ عالم جو شاہ عالم ہے　　حق ہے یوں یہ پناہ عالم ہے
(۲) سب جو کہتے ہیں اس کو ظل اللہ　　تو اسے اپنے نام کا ہے نباہ
(۳) رات دن اب جناب میں تیری　　عرض ہے اے کریم یہ میری
(۴) کہ اسے تن درست دائم رکھ　　اس کی اولاد کو بھی قائم رکھ

شاہ عالم جن کی حکومت صرف لال قلعہ تک محدود تھی اور جو ۱۷۶۵ کے بعد سے انگریزوں کو بنگال کی دیوانی دے کر چھبیس لاکھ سالانہ کی پنشن پا رہا تھا اور جو ۱۷۷۸ء تک انگریزوں کی حفاظت میں الہ آباد میں رہا اور ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے جس کی آنکھیں نکال ڈالی تھیں صرف ایسی حیثیت رکھتا تھا کہ اس کے لیے تعریف کے چار رسمی اشعار کافی سمجھے گئے۔ اس کے بعد سلیمان شکوہ کی تعریف میں پانچ شعر ہیں۔ پھر نواب وزیر علی کی تعریف میں پچاس اشعار ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مثنوی کے ذریعے سے وہ وزیر علی کے دربار میں رسائی پیدا کرنا چاہتے تھے جسے تخت نشین ہوئے چند مہینے گزرے ہوں گے۔ وزیر علی کی سخاوت، عشق و عاشقی، سخن شناسی اور سخن فہمی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کو وزیر علی کی خدمت میں بطور نذر پیش کرنا چاہتے تھے تعریف کے چند اشعار یہ ہیں :[2]

(۱) بس کہ ہے عشق سے نہایت ذوق　　تو بہت سا ہے شعر کا بھی شوق
(۲) واقعی شعر ہے عجب ہے چیز　　آدمی اس سے سیکھتا ہے تمیز
(۳) ہو سخن سے بس اس کسی کو کام　　جس کو منظور ہو جہاں میں نام

---

[1] مثنوی مہ جبیں و ناز نین قلمی نسخہ ورق ۶/ب سنہ ۱۲۱۳ھ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری
[2] 〃 〃 〃 〃 ۹/ا 〃 〃 〃 〃

(۴) ہر سخن یادگار عالم ہیں — ہر سخن پائے دار عالم ہیں
(۵) ہر سخن کا بہت بڑا درجہ — سمجھے کوئی سخن کا کیا درجہ
(۶) اور ہیں قدرداں سخن کے جو — قدر ہر یک سخن کی ہر اُن کو
(۷) سیرِوں دیتے ہیں وہ جواہر تول — اور لیتے ہیں وہ سخن کو مول

وزیر علی کی تلوار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں : ؎

(۱) ماہ[1] تو یہ نہیں ہر گردوں پر — اصفہانی ہر اس کی آتی نظر
(۲) آفتابی[2] سپر ہر اس کی یہ خور[3] — کہ نہایت ہر نور سے وہ پُر
(۳) اور کماں بھی ہر یہ عیاں اس کی — ہر یہ قوسِ قزح کماں اس کی
(۴) ہیں یہ تیرِ شہاب اس کے تیر — نہیں خصم آنکتے[4] ہیں کرتے دیر
(۵) کیجیو یہ یقیں کہ روزِ جنگ — ہر یہ رعد اس کی ایک صدائے تفنگ

منظر نگاری اردو مثنویوں میں منظر نگاری کے ماہر کمال میر حسن سمجھے جاتے ہیں انھوں نے قدرتی مناظر، عمارتوں، محفلوں اور مجلسوں تقریبوں، شادی بیاہ کی رسموں کا اس طرح منظر کھینچا ہر کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جاتی ہر۔ اس منظر نگاری میں جزئیات نگاری سے خاص طور پر کام لیا گیا ہر۔ معلوم ہوتا ہر کہ اس فن میں رنگین نے میر حسن کی مثنوی سے ضرور استفادہ کیا ہر۔ چناں چہ دونوں کی منظر نگاری کے مقابلے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہر۔ مثلاً باغ کا منظر رنگین نے اس طرح کھینچا ہر ؎

جب[5] وہ پہنچے سری نگر میں آ — باغ میں نازنیں کے اُترے جا
تھا ولیکن وہ باغ ایسا باغ — سیر سے جس کی ہو شگفتہ دماغ
تھی جو گرد اس کے چار دیواری — کی تھی اس طرح اس کی تیاری

---

[1] ورق ۹ ب [2] آفتاب [3] شناخت، اندازہ [4] ورق ۱۴ ب

لاکھ ہا من کرنڈ پسوا کر | کیوڑے سے پھر اس کو گندھوا کر
اس کی اینٹیں غرض بنھائی تھیں | صرف صندل ہی میں پکائی تھیں
عود میں موتیوں کو تھا بھونا | پھر ان کا پکایا تھا چونا
سُرخ یاقوت پیس کر باریک | کی تھی سرخی یہ اس کی خاطر ٹھیک
سَن کے بدلے ملایا تھا ریشم | تا نہ ہو اس کی آب داری کم
مصری گوڑ[1] کے عوض ملائی تھی | گچ غرض اس طرح بنائی تھی
گھس کے اینٹیں لگائی تھیں یعنی | درز ہوئے کہیں یہ کیا معنی
لگا اس کی چنائی میں سارا | تھا عبیر اور گلاب کا گارا
اس کے تر پو لیا تھا در کے قریب | تھا بنا وہ بہت عجیب و غریب
بیچ کے در کے تھی مقابل نہر | کم نہ تھی نربدا سے اس کی لہر
صُفّہ[2] سے لے کے وہاں تلک سارے | پڑے چھٹے تھے اس میں فوارے
کیا خزانے کا ان کے کیجے بیاں | گنج قارونی تھا وہاں حیراں
یوں جھڑی لگ رہی تھی ان سے جوں | برسیں دن رات ساون اور بھادوں
پانی مینھ ان کے آگے بھرتا تھا | سامنے آتے ابر ڈرتا تھا
دو طرف تھا روش پہ جو چھپّا[3] | تو بیاں اس کا ہو کسی سے کیا
صندل اور آب نوس منگوا کر | ان کو کاری گروں سے چِروا کر
چھتے چوبے بنائے تھے ایسے | ہیں وہ کابل کے چوک میں جیسے
تاک[4] ان پر چڑھائے تھے سارے | تا کسی کا نہ دھوپ جی مارے
پانی دونوں طرف سے تھا جاری | اس روش[5] تھی روش کی تیاری
پھول وہ جن کی ہو جہاں میں نمود | سو وہ اس باغ میں تھے سب موجود

---

[1] گُڑ [2] دیوان خانہ، دالان جس کی چھت پٹی ہوئی ہو [3] چھپّا: پٹا ہوا راستہ [4] انگور کی بیل [5] طور۔ باغ کی پٹڑی۔

تھا چمن کوئی نسترن سے بھرا | اور تھا کوئی یاسمن سے بھرا
موتیا رائی بیل و داؤدے | بے شمار اس کے ہر چمن میں تھے
گل عباس اور گل شبو | ڈھڈھاتے[1] تھے کھل کے راتوں کو
تھے کروروں ہی سیوتی کے درخت | تھے ہزاروں ہی کیتکی کے درخت
لالے سے تو دہک رہا تھا باغ | کیوڑے سے مہک رہا تھا باغ
جعفری و چنبیلی و گیندا | گل نسریں و نرگس و چنپا
سوسن و ارغوان و ہارسنگار | اپنی اپنی دکھا رہے تھے بہار
تھے مدن[2] بان و موگرے کے جھاڑ | تھے نہ وہ جھاڑ لیک تھے وہ پہاڑ
اور تختے جو وہاں گلاب کے تھے | تو وہ ایسے ہی آب وتاب کے تھے
کہ اگر ان کی کیجیے تقریر | تو خجل بھی بہت سا ہو کشمیر
ایک سمت آبشار کا تھا شور | ایک رُخ کو لگے تھے ابریں مور
نعرے بھرتی تھی ایک طرف بلبل | ایک سو کر رہی تھی قمری غل
وہ عمارت جو رُو بہ رُو کی تھی | باغ تھا جسم اس کا وہ جی تھی
بنی بلور کی وہ ساری تھی | اس میں نیلم کی پچی کاری تھی
تھیں زمرد کی پتیاں بالکل | اور تھے لعل کے بناٹے گل
تھے وہ الماس کے تراشے پھل | غم دل جن کو دیکھ جائے بہل
الغرض کرکے دست چالاکی | کی تھی حکاک[3] نے یہ حکاکی
کہ جہاں تک تھے وہاں در و دیوار | نظر آتے تھے سب وہ آئینہ دار
بیل بوٹے بنے جو تھے تصویر | گرد ان کے طلائی تھی تحریر
میں تو غش اس شعور پر ہوں گا | کہ بہت سا تراش کر ہو گا

---

[1] ڈھڈھانا:۔ کھلنا، پھولنا، شاداب ہونا [2] ایک پھول کا نام جو بیلے کی قسم سے ہے۔
[3] نگینہ ساز:۔ کسی چیز کا چھیلنے والا۔

جو کھٹیں اس میں جو لگائی تھیں | تو وہ مونگے ہی کی بنائی تھیں
تھے جو دُرِّ نجف کے اس میں کواڑ | تو بس الماس کے سے تھے وہ پہاڑ
سردلیں[1] تھیں تمام سونے کی | تھیں چھتیں لاکلام سونے کی
اوپر ان کے لگا جو چھجا تھا | تو وہ تھا بس فقط صدف ہی کا
توڑے[2] جو اس تلے لگائے تھے | تو کسوٹی کے وہ بنائے تھے
پھر جو نیچے رہے تھے اس کے دب | سنگِ موسیٰ کے تھے وہ دلے[3] سب
چاندی سونے کی چلونیں تھیں تمام | چھُٹی رہتی تھیں ان دروں میں مدام
یہ بنیں تھیں مہین و یک سر | کہ گزرتی تھی چھن کے ان سے نظر
کر کے اطلس کے سائبان درست | باندھے سب میں تھے تان تان[4] چست
کھنچے رہتے تھے رات دن وہ مدام | تھا انھوں پر بھی ٹاٹ[4] بانی کام
تھے جڑاؤ انھوں کے استادے | اور سونے کے تھے بہت سادے
ڈوریاں تھیں کلابتونی سب | تھی تمامی[5] کی جھالر اور غضب
تھا ایک اس پر اور تھا جھلکا | فرش تھا اس میں صرف مخمل کا
کی تھی پر اس پر آڑے تار کی بیل | تا وہ دیوار و در کا ہووے میل
اس پہ زربفت کی جو مسند تھی | سُنیے مجھ سے بیان اس کا بھی
کسی اُستاد نے بنا کر زور[6] | ٹانک دی تھی فرنگی اس پر فور[7]

---

[1] سہادلی پیشانی، دھرن، چوکھٹ کے اترنگے کے اوپر والی دہلیز کی جوابی لکڑی یا پتھر کی پٹی جو بطور پٹاؤ کے رکھی جاتی ہے اس میں کواڑ کی اوپر کی چول کے سوراخ ہوتے ہیں۔ [2] توڑا: مندل، گھوڑیا۔ چھجے کی چھادن کو سہارنے یا اٹھائے رکھنے والا مثلثی شکل کا بنا ہوا پتھر۔ سب ضرورت منقش، سادہ، چھوٹا اور بڑا ہر قسم کا بنایا جاتا ہے [3] بنیاد یا دیوار کی چنائی کے ختم پر آثار کو بھر پور ڈھکنے والا سنگین پٹاؤ یا داب، چوکھٹ کا حصہ، دہ کرڑی کا ٹکڑا یا لمبی سل جسے دیوار پر رکھ کر اوپر سے کڑیاں ڈالتے ہیں۔ [4] صحیح تار بانی، کامدار، کلابتو کا کام [5] ایک قسم کا ریشمی کپڑا جو زری یا روپہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے [6] عمدہ، چمک دار [7] فیتہ جو کپڑوں کے حاشیہ پر لگاتے ہیں از قسم جھالر۔

تکیے اس کے ہی میل کے لاکر رکھ دیے تھے وہاں قرینے پر
اس سوا اور جو عمارت تھی کیا کہوں وہ بھی ایک قیامت تھی
وہ بھی تھی ایسی ریختے[1] کی بلند کہ جہاں آہ کی نہ پہنچے کمند
اور چھت اس میں جو لگائی تھی تھی وہ رنگین یا طلائی تھی
فرش ہر ایک میں نرالا تھا نقشہ سانچے میں سب کا ڈھالا تھا

اس کا مقابلہ مثنوی "سحر البیان" میں اس طرح کے منظر سے کیا جا سکتا ہے

مئے[2] ارغوانی پلا ساقیا کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا
دیا شہ نے ترتیب ایک خانہ باغ ہوا رشک سے جس کے لالے کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

میر حسن کی تصویر اور رنگین کے بیان میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ رنگین کی تصویر سے جان ٹھیری ہوئی اور مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ میر حسن کی تصویر میں حرکت پائی جاتی ہے اور یہی حرکت ایک ساکت و جامد منظر کو جاندار بنا کر پیش کرتی ہے۔ میر حسن نے بھی مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن یہ مبالغہ حد سے زیادہ نہیں بڑھا۔ رنگین کے یہاں یہ مبالغہ پڑھنے والے کو بھی مبالغہ معلوم ہوتا ہے مثلاً "چہار دیواری کے لیے کیوڑے سے گارا تیار کرانا۔ صندل کی لکڑی میں اس کی اینٹوں کو پکانا عود میں موتیوں کو بھون کر چونا بنانا، سرخ یاقوت کو پیس کر سرخی کے بجائے کام میں لانا، چنائی میں گارے کی جگہ عنبر اور گلاب کا استعمال ایسا ہے جو

---

[1] ریختہ، پختہ عمارت ہے
یہ ریختہ وہ ہے کہ کوئی ڈھا نہیں سکتا عارف کہیں دیکھی ہے یہ تعمیر کسی نے
[2] "سحر البیان" صفحہ ۲۷ مطبعہ نول کشور پریس ۱۹۴۵ء

پڑھنے والے کو سری نگر کا "باغ دل کشا" کے بجائے جس کا نقشہ رنگین کھینچنا چاہتے ہیں، پڑھنے والے کا ذہن پرستان کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ رنگین کا بیان میر حسن سے طویل تر ہے اس طوالت میں اپنی معلومات، جدت، تخیل اور زبان کی روانی کا رنگین نے طلسم باندھا ہے۔ مگر باغ کے بیان میں میر حسن کے ان اشعار کا جواب کہیں نہیں ملتا ؎

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پہ — نشہ کا سا عالم گلستان پر
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

رنگین کے یہاں اس قسم کے مناظر میر حسن کے مقابلے میں زیادہ ہیں مثلاً پہاڑ کا منظر ؎

ایک[1] دن ایک کوہ پاس آئے — تھکے ماندے بہت ہی گھبرائے
تھا ولیکن وہ کوہ ایسا کوہ — جس کی تھی قاف سے زیادہ شکوہ
رفعت اس کی اگر بیاں کیجے — تو عیاں ہجو آسماں کیجے
اس سے گرتی تھی ایک چادرِ آب — چشم عاشق کی جس سے ہو سیراب
نرگستاں تھا ایک طرف خودرو — ایک طرف تھا شگوفۂ آلو
کیتکی کا ہی تھا ادھر جنگل — اور کوسوں میں تھا اُدھر صندل
تھے اس طرح کے بہت اشجار — جائے پھل، لونگ اور ہارسنگار
کیوڑا، سرو صندل و شمشاد — اُن میں کرتے تھے جانور فریاد
سینکڑوں طرح کے چرند و پرند — شاد و فرحاں تھے اور تھے خورسند
چرتے پھرتے تھے ہر طرف آہو — قمریاں کر رہی تھیں واں کوکو

---

[1] مہ جبیں و نازنیں، قلمی نسخہ ورق ۱۰ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری

نیچے ہر یک درخت کے اینڈتے — تھے ہزاروں ہی اژدر اور گینڈے

سحر و طلسم کے مناظر

پہنچے[1] باہر حصار کے دیواں — نکلے ہر یک بہ شکلِ جانوراں

خرس و میمون، شیر و پیل و پلنگ — کژدم و کرگ[2] و اژدہا و نہنگ

گاہ وہ کرگ شیر ہو جاتا — شکل چوہے کی پھیر ہو جاتا

گاہ میمون بن کے ہاتھی مست — جانتا سب سے خود کو بالا دست

گہ پلنگ آپ کو بنا کژدم — سب سے چیتا الگ اٹھا کر دم

پیل گاہ لوٹ اژدہا بنتا — اژدہا گاہ گرگ ہو تنتا

زہر آلودہ تھے ہزاروں ناگ — مُنھ سے وہ سب نکالتے تھے آگ

دیو بعضے تھے آ کے چلّاتے — اور بعضے تھے منھ چڑا جاتے

بعضے اپنے بجاتے تھے جونڑ — بعضے پتھر تھے چابتے کڑ کڑ

کوئی دیتا تھا سینگ خاک میں گاڑ — کوئی لیتا درخت کو تھا اکھاڑ

کوئی آ پھینکتا تھا انگارے — کہ مریں ڈر سے سب وہ بیچارے

نازنیں کا دریا کے کنارے قدیم دستور کے مطابق روشنی اور آتش بازی کا شام کے وقت انتظام کرنے کا حکم دینا —

روشنی کی تیاری

قصّہ کوتہ لگی جو ہونے شام — تو ہوا نازنیں کا یہ احکام

یعنی ہو ٹھاٹھر دں کی تیاری — ان میں ہو روشنی کی گل کاری

یہ سن اس کام کی جو تھیں اُستاد — دوڑیں وہ کرنے روشنی ایجاد

لبِ دریا پہ بلّیوں کو گاڑ — باندھے ٹھاٹھر انھوں نے جیسے پہاڑ

---

[1] مہ جبیں و نازنیں قلمی نسخہ ورق ۱۵ب پنجاب یونی ورسٹی لائبریری [2] کرگ: گینڈا، ہرن

[3] ” ” ” ورق ۱۵ب تا ۱۵ الف ” ”

بانس ان میں کروڑہا ہی لگائے — بنگلے پھر ان میں لاکھ ہا ہی بنائے
سینکڑوں برج ہی اُٹھا ڈالے — کتنے ترپولیے[1] بنا ڈالے
بارہ دریاں بنائیں اس میں ہزار — اور ہنڈولے بہت کیے تیار
تھے جو خانوں میں ٹھاٹھروں کے چراغ — نظر آتے تھے بس وہ باغ کے باغ
میں تو ہوں اتنی عمدگی کا غلام — کہ وہ سونے کے تھے چراغ تمام
تھا اُنھوں میں نہ تیل نیلی کا — تیل ان سب میں تھا چنبیلی کا
روئی نرمے[2] کی سُتھری منگوا کر — اس کو کھترانیوں سے پنوا کر
بتیاں اس کی سب بناتی تھیں — اُن چراغوں میں وہ جلاتی تھیں
پار بھی روشنی تھی بس اس طرح — وار کی کہہ چکا ہوں میں جس طرح
نظر آتی تھی روشنی کی جھلک — لہریں وار پار کوسوں تلک
چاند ہو کیوں نہ ان کے آگے ماند — لوٹتے تھے کروڑوں اس میں چاند
یوں وہ دریا پہ روشنی جو ہوئی — تو اسے دیکھ خلق کہنے لگی
روشنی یہ نہیں ہے یہ بھی تاڑ — کچے سونے کا یہ کھڑا ہی پہاڑ
کوئی کہتا تھا کوٹ لنکا کا — یاں رکھا ہی کسی نے سحر سے لا
گرچہ اس کی بہت ہی چوڑائی — پر یہ دریا اسی کی ہی کھائی
اور ریتی جو بیچ میں تھی پڑی — تھی بہت عرض و طول میں وہ بڑی
گنج[3] اس میں دیے تھے لاکھوں گاڑ — لیکن ایسے کہ ایک ایک پہاڑ

---

[1] ترپولیا: (سنسکرت) تری گوپرا: تین دروازوں کا گھر، تین درہ پھاٹک، تین بڑے در جو بازار کے شروع میں بناتے ہیں تاکہ ہر در سے جلوس اور جلوس کے ہاتھی آسانی سے نکل سکیں۔ [2] نرما یا نرمہ: ایک قسم کا روئی کا درخت جس کا سرخ پھول ہوتا ہی اور اس میں سے نہایت نرم روئی نکلتی ہی۔

[3] ڈھیر۔ بہت سے پراقوں کو ایک جگہ رکھ کر چھوڑتے ہیں ؎

اُڑتے ہر آہ میں شرارے ہیں — چھوٹتے گنج کے ستارے ہیں (رند)

تھے بھرے ان میں اس قدر تارے — آسماں پر ہیں جس قدر تارے
چھوٹتے تھے کروڑہا مہتاب — کس کو معلوم تھا انھوں کا حساب
تھے پٹاخوں کے ایسے جھاڑ کھڑے — کہ درختوں سے سب جہاں کے بڑے
آگ جس وقت ان میں دکھلاتے تھے — لوگ سب دور بھاگ جاتے تھے
چادریں کھلتیاں تھیں چھوٹ کے جب — سیر ہوتی تھی روشنی میں تب
خانے ہر ہر طرح کے بوقلموں — نظر آتے تھے سب درون و بروں
چھوٹتی تھی جو پھر ہوائی توپ — اس کو کہتے تھے سب خدائی توپ
گولہ جاتا تھا اس کا کوسوں تک — الغرض جا کے وہ قریب فلک
پھوٹتا تھا پھر اس صدا[1] سے وہاں — کہ لرزتے تھے سب زمین و زماں
ساتھ اس پھوٹنے کے بس فی الفور — نظر آتی تھی ایک سیر یہ اور
کہ نکلتے تھے اس میں سے لوٹے — پر بڑے خوب اور بہت موٹے
جب وہ چھٹ چمکتے سارے ان میں سے — تھے نکلتے ستارے ان میں سے
متصل آسماں کے کوسوں تک — نظر آتی تھی بس انھیں کی جھلک
تھے جو ستھرے بڑے بڑے وہ انار — لاکھ ہا تھے چھٹے قطار قطار
ان کو دیتے تھے جب برابر داغ — خلق کہتی تھی ہے یہ لکھی باغ
پھرکیاں کر رہی تھیں ایک رخ زد — چرخیوں[2] کا بھی ایک سو تھا شور
برج کاغذ کے جو اڑاتے تھے — تو وہ اس طرح سے بناتے تھے
ڈھانچ قندیل کی طرح بنوا — ان کو پھری سے خوب سا بندھوا
مڑھ کے کاغذ سے کرتے تھے تیار — ایک دو تین کیا ہزار ہزار
لکڑیاں اندر اس کے کر کے کھڑی — ان میں رکھتے تھے ایک ناند بڑی

---

[1] ق۔ن ، سدا [2] چرخیوں :۔ ایک قسم کی آتش بازی۔

اس میں بھرتے تھے دھان کے بھوسے
لیک وہ جو مہین تھے موٹے سے[1]

آگ سے پھر اسے جلاتے تھے
دھواں اس میں سے وہ اٹھاتے تھے

جب دھواں خوب سا سماتا تھا
تب وہ برج آسماں کو جاتا تھا

کہیں لڑتے تھے ہاتھیوں کے جوڑ
کہیں کرتے تھے گینڈے ان کا توڑ

کہیں ہرنوں نے سینگ جوڑے تھے
کہیں ارنوں[2] نے پیٹ پھوڑے تھے

کہیں آپس میں دیو تھے لڑتے
عضو عضوان کے جل کے تھے جھڑتے

قیاس ہے کہ یہ اشعار بھی رنگین نے میر حسن سے متاثر ہو کر لکھے ہیں کیوں کہ میر نے آصف الدولہ کی شادی کے سلسلے میں اس قسم کی روشنی بندی کا ایک منظر نظم کیا ہے ؎

اس روش روشن تھا واں ہر اک چراغ
عرش پر جس کا لٹکتا تھا دماغ

نیچے اوپر جوں جوں جلتے تھے چراغ
تھا عدو کو داغ بر بالائے داغ

دود اس کا ہوتا تھا جوں جوں بلند
آتش صورت پہ تھا دشمن پسند

اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور
موج زن ریتی میں تھا دریائے نور

دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول
جل گئے پانی میں غیرت سے کنول

آتش بازی کے چھٹنے کا حال اس طرح بیان کیا ہے :؎

ہاتھی آتش بازی کے چھٹتے تھے جب
نور کوہ طور تھا نظروں میں تب

مور اس کے اس میں چھوٹے اس نمط
چھوٹتی ہے جس طرح دریا میں بط

جس کو گھنچکر[3] کہیں ہیں وہ نہ تھا
وجد میں آتش کا دل تھا برملا

---

[1] بال [2] ارنا بھینسا : جنگلی بھینسا [3] آتش بازی کا چکر جو آگ دینے سے خوب گردش کرتا ہے۔

بس کہ چھٹتے تھے ستارے[1] بے شمار — آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، ہتھ پھول[2]، گل ریز اور انار — کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار
تھیں نہ روشن مورنوں کی ٹٹیاں — مردم ناری بھی تھے جلوہ کناں
متصل چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی — نور کی بارش تھی واں گویا جھڑی
جس طرف جاتی تھی واں حدِ نگاہ[3] — جوشِ گل ناری سے باقی تھی نہ راہ

اس موقع پر البتہ رنگین نے میر حسن سے زیادہ تفصیل اور جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور پورا منظر زندگی اور حرکت سے معمور ہے۔

انھی مناظر میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں کے لباس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ میر حسن نے "بدر منیر" کا سراپا بیان کرتے ہوئے یہ اشعار لکھے ہیں[4] :

عجب طرح کا حسن تھا جاں فزا — کہ مہ روبرو جس کے تھا تھک رہا
کروں اس کی پوشاک کا کیا بیاں — فقط ایک پشواز آبِ رواں
زبس موتیوں کی تھی سنجاف[5] کل — کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تل
اور اک اوڑھنی جوں ہوا یا حباب — جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب

رنگین نے بھی اس مثنوی میں جا بجا ایسے مناظر پیش کیے ہیں مثلاً "مہ جبین و دانش ور کا بھیس بدلنا" :

کرکے[6] سادہ بناؤ اپنا خوب — ہوئے تیار دونوں وہ محبوب
رکھ کے گینہ دل کو چھاتیوں کی جا — سادی انگیا لی مہ جبیں نے چڑھا

---

[1] ایک قسم کی آتش بازی سے اڑتے ہر آہ میں شرارے ہیں، چھوٹتے گنج کے ستارے ہیں
[2] ہلکی بارود کی نمائشی پھول دار آتش بازی جو ہاتھ پر رکھ کر چھوڑی جاسکے [3] پھلجھڑی [4] حدِ نظر
[5] مثنوی سحر البیان صفحہ ۵۵ تا ۵۸ مطبوعہ نول کشور ۱۹۴۴ء [6] گوٹ
[7] باریک ریشمی کپڑا [8] "مہ جبیں و ناز نیں" ورق ۴۶ ب

اوپر اس کے پہن کے نیم تنا[1] ایک علامہ ڈومنی وہ بنا
پہنی سادی ازار ساٹھن کی پر جو تھی بوٹیوں سے وہ گھن کی
تھی جو چادر مہین ململ[2] کی سو وہ اوڑھ اس نے اپنے سر پہ لی
متی دو انگلی کل کے مردانی فقط ایک ایک پہنی چوڑانی[3]
چوڑی مینے[4] کی ہاتھ میں ڈالی اور جگنی[5] ہی باندھ لی خالی
پہنے دو تین چار گہنے اور کیا بانکا ہی اپنا سارا طور
سمرن[6] ایک موتیوں کی ہاتھ میں ڈال ہولیا ساتھ ان کے جی کو سنبھال
کر یہ سادہ بناؤ اس نے تمام رکھ لیا اپنا نور بائی نام
اور دانش ور اس کا تھا جو وزیر اس لے کی یہ بناؤ کی تدبیر
جلد یانڈی پہن کے کلیوں دار اپنا ڈومن بنا کیا اظہار
ڈھیلا پاجامہ کھینچ گمٹی[7] کا جوڑا بالوں کا سر سے باندھ لیا
ڈوریے کا دوپٹہ سر پہ ڈال اس نے گہنے کا کچھ کیا نہ خیال
جب یہ تیار سب ہوا اسباب بی فضیلت لیا پھر اس نے خطاب
یوں وہ تیار ہاتھوں ہاتھ ہوئی ہو کے تیار ان کے ساتھ ہوئی

نازنیں کا لباس

پہنا شبنم[8] کا لہنگا کلیوں دار زعفرانی جو تھا سیا تیار
ساری کلیوں پہ اس کی تھا گوٹا اور نیفہ روپہری تاش[9] کا تھا

---

[1] نیم تنا۔ یہ طور کرتی کے بہت سی کلیوں کا ہوتا ہے [2] ململ [3] چوڑانی۔ ایک کان کے زیور کا نام جس میں موتی کے چار دانے لگے ہوتے ہیں [4] مینا۔ شیشہ۔ نیلے رنگ کا پتھر [5] جگنو [6] سمرن۔ رنگین نے ہر جگہ "ث" سے لکھا ہے معنی تسبیح [7] گمٹی۔ ایک قسم کا پھول دار یا دھاری دار کپڑا [8] ایک قسم کا سفید اور نہایت باریک کپڑا [9] تاش۔ زری کا کپڑا

اور اس کے بنت[1] لگائی تھی — لہر[2] دونوں طرف سلائی تھی
رکھ دیے تھے پھر اس کے اندر ڈانک[3] — اور ان سب کے دی تھی چنپا ٹانک[4]
اس پہ انگیا جو تھی وہ رانی کی — تھی وہ ڈھاکے کی جامدانی[5] کی
تھا جو آیا وہیں سے وہ پہلام[6] — اس میں اس کی ہی توئیاں[7] تھیں تمام
سی تھی مغلانیوں نے مل کے شتاب — بیچ میں اس کے تھی لگائی حباب[8]
سر پہ اوڑھی جو اس نے تھی ساری — تو وہ قیمت میں تھی بہت بھاری
اور سراندیپ کی بنائی تھی — نذر کے طور سے وہ آئی تھی
پہنا گہنا بھی اور ہی سارا — یعنی جو جو لگا اسے پیارا
شوق تھا بس کہ اس کو بے[9] تُر سے — ناک میں ڈالی وہ چھوا سر سے
ڈھبریاں[10] جو جڑاؤ تھیں تیار — لیں وہ کانوں میں سب پہن یک بار
پتے مینوں[11] کے بالیوں میں ڈال — پہنیں کانوں میں بالیاں وہ سنبھال
تھے زمرد کے جو فقط مالے — اس نے اپنے گلے میں وہ ڈالے
کیکرے[12] کے جڑاؤ بازو بند — باندھے بازو پر اپنے کر کے پسند

---

[1] گوٹے پٹھے یا سلمے ستارے سے بنائی ہوئی ایک بیل جو کپڑوں پر ٹانکی جاتی ہے [2] گوٹے کی لہر۔ جو بنت کے دونوں طرف بشکل لہر ــــــ بنائی جاتی ہے [3] نگینہ کے نیچے سنہری یا روپہلی ورق جو زیادہ چمک یا رنگ کے واسطے رکھ دیتے ہیں۔ نوہ۔ [4] گوٹے کی کلیاں جو گوٹا موڑ کر بنائی جائیں چنپا کی کلی سے مشابہ ہوتی ہیں [5] ایک قسم کا ریشم سے کڑھا ہوا پھولدار کپڑا [6] پہلام (پھولام)۔ اطلس ساٹن ریشم اور سوت کا ملواں بنا ہوا چکنی سطح کا کپڑا۔ پھول دار اطلس وضع اور رنگ کے اعتبار سے گل بدن، مشجر، پہلام (پھولام)، اور رقنا دیز کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔
[7] توئی (مونث) فیتہ، پٹی، گوٹ کپڑے کی حیثیت کے لحاظ سے ادنیٰ اعلیٰ سادہ اور زردوزی کام کی بنائی جاتی ہے اور مختلف ناموں سے موسوم کی جاتی ہے جیسے چمپا کی توئی، کھجور چھڑی کی توئی وغیرہ [8] روشنی کے باریک زجاجی کنول، شیشے [9] علاقہ بینی۔ وہ چھوٹی سی نتھنی جو ناک کے بیچ میں بلاق کے بجائے گاؤں کی عورتیں پہنتی ہیں [10] کان کا ایک زیور [11] رنگ دار شیشہ جو زیور پر جڑا جاتا ہے زمرد، زبرجد، پنا [12] کیکر (ببول) کی پھلی کی شکل کے مانند۔

خوانچے[1] میں سے اور اٹھا جھٹ پٹ　　اس نے جلدی چڑھا لیے انوٹ[2]

ان مناظر میں رنگین کے یہاں میرحسن سے زیادہ تفصیل ملتی ہو اور اس سے اس عہد کے لباس، زیورات اور لوازماتِ آرایش کا پورا اندازہ ہوجاتا ہو۔

مثنوی کو طول دینے کے لیے رنگین نے بعض اور مناظر بھی تفصیل سے کھینچے ہیں۔ مثلاً ہولی کا منظر ؎

بھر[3] کے پچکاریوں میں رنگیں رنگ　　نازنیں کو کھلائی ہولی سنگ[4]
یوں غرض آئی بہرہ ور بھی ادھر　　کھڑی کوٹھے پہ نازنیں بھی ادھر
چلتی ہو دو طرف سے پچکاری　　مینہ برستا ہو رنگ کا بھاری
بادل آئے ہیں گھر گلال کے لال　　کچھ کسی کا نہیں کسی کو خیال
وہ جو ہو اپنے کام میں پکّی　　لی ہو پچکاری اس نے بس یکّی
یعنی دور اس کی دھار جاوے گی　　جس کو چاہوں گی یہ بھگاوے گی
ہاتھ میں جس کے وہاں ہزارا ہو　　ایک عالم کو اس نے مارا ہو
ہیں جو مصروف سب صغیر و کبیر　　اُڑ رہا ہو گلال اور عبیر
بن گئے ہیں ہوا میں وہ بادل　　اور زمیں میں پڑے ہیں تھل کے تھل
سر کے بالوں کا ہو کسی کو غم　　کوئی ملتی ہو آنکھ ہی ہر دم
ہو کھڑی کوئی بھر کے پچکاری　　ہو کسی نے کسی کو جا ماری
کوئی جاتی ہو اس طرف سے اُدھر　　کوئی آتی ہو اُس طرف سے اِدھر
بھر کے پچکاری وہ جو ہو چالاک　　مارتی ہو کسی کو دور سے تاک

---

[1] خوانچہ:۔ چھوٹا تھال [2] انوٹ۔ ایک ہندوانی گھنگرو دار زیور جسے ہندنیاں پاؤں کے انگوٹھے میں پہنتی ہیں [3] مہ جبیں و نازنیں: قلمی نسخہ ورق $\frac{49}{3}$ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری [4] ساتھ

اور اُٹھا کر کسی نے بھاری گیند | کنپٹی میں کسی کے ماری گیند
کسی نے بھر کے رنگ کا تسلا | ہاتھ سے ہے کیا کسی کا منھ میلا
اور مٹھی میں اپنی بھر کے گلال | ڈال کر رنگ منھ کیا ہے لال
جس کے بالوں میں پڑ گیا ہے عبیر | بڑبڑاتی ہے یہ وہ ہو دل گیر
ایسی ہولی کا کھو جڑا جاوے | کوئی نوج ایسے کھیل میں آوے
جس کے لاگا ہے تمغہ بھاری | ہاتھ سے وہ پٹک کے پچکاری
کہتی ہے یوں پسار کر جھولی | ستیاناس ہو تیرا ہولی
جس کی آنکھوں میں پڑ گیا ہے گلال | وہ یہ کہتی ٹھنک کے ہے فی الحال
پل گئی مجھ پر آہ فوج کی فوج | گھر سے میں اپنے آج آئی نوج
گیند جس کے لگے ہے سینے میں | شک ہے بے شبہ اس کے جینے میں
وہ یہ کہتی ہے غش میں آ کر لیٹ | ہوئے ہولی کہیں یہ ملیا میٹ
جس نے ڈالا ہے حوض میں جس کو | وہ یہ کہتی ہے کوس کر دس کو
یہ ہنسی تیری بھاڑ میں جاوے | تجکو ہولی نہ دوسری آوے

اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کے علاوہ شاید ہی کسی نے ہولی کے منظر کو اس قدر تفصیل سے لکھا ہو لیکن نظیر کے یہاں ایک خامی یہ ہے کہ ان کی ہولی عوامی رنگ میں ہے جس کی وجہ سے بعض پست اور مبتذل اشعار بھی اس میں آ گئے ہیں۔ رنگین کی ہولی کا منظر ایک شہزادی کی ہولی ہے لہٰذا اس میں پستی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس قسم کا دوسرا منظر رقص کا منظر ہے اسے رنگین نے نہایت ہی تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی مختلف نظمیں اور تماشے جو ایسی محفلوں میں ہوتے

تھے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ رقص کا منظر میر حسن نے بھی بیان کیا ہی لیکن یہاں بھی رنگین کے یہاں میر حسن سے بہت زیادہ تفصیل ملتی ہی۔ مثلاً :-

رقص کا منظر

فرش[1] تھا چاندنی کا صاف عجب   تین رُخ اس پہ کرسیاں تھیں سب
بیچ میں اُن کے تخت تھا جو دھرا   نازنیں بیٹھی اس پہ ناز سے آ
جتنی امرا تھیں رنڈیاں یک سر   کرسیوں پر وہ بیٹھیاں آ کر
چاندی سونے کے شمع دان جو تھے   تو وہ اس فرش پر تھے لاکے دھرے
تور[2] و جھالر بنا کے سب پُر زر   ٹانکے کاری گردں لے تھے ان پر
شمعیں کافوری موم کی بنوا   ان کو دو چار رنگ سے رنگوا
روشن ان پر کیا تھیں لاکے تمام   دیکھتے تھے انھوں کو خاص اور عام
اور کسی[3] میں سے چھوٹتا تھا انار   لیکن اتنا بلند جتنا چنار
جائی[4] جوئی کہیں سے چلتی تھی   اور ستارے کوئی اُگلتی تھی
وہ جو اُن کے جڑاؤ نھے گل گیر   تو بنائی ہوئی تھی وہ تصویر
سبز تھے کوئی ان میں کوئی لال   تھا ہر ایک رنگ پر ہر ایک کا جمال
تھی جو سو سو کی ایک ایک قطار   تو عجیب طرح کی تھی ان پہ بہار
تھے قطاروں میں فاصلے جو پڑے   تو پھر ان سب میں طائفے تھے کھڑے
ناچتی تھیں کسی میں کنچنیاں   پر فقط گانے والی ڈومنیاں

---

[1] ورق ۵۵/ب [2] تور: فیتہ جو کپڑوں کے حاشیے پر لگاتے ہیں [3] ورق ۵۶/الف
[4] جائی جوئی: جاہی جوہی ایک سفید پھول چنبیلی کی قسم کا۔ عورتیں اکثر "جائی جوہی" بولتی ہیں۔ اُسی پھول کی مناسبت سے اُس آتش بازی کو کہتے ہیں جس کے چھوٹتے وقت بہت سے ننھے ننھے ستارے نکلتے ہیں ❊

اور کسی میں کھڑی ہو ڈومنیاں | سیر سب کو دکھا رہی تھیں وہاں
ناچتی تھی کھڑی کوئی سنگیت | کوئی خالی ہی گا رہی تھی کچھ گیت
بھنڈئی کو کوئی رجھاتی تھی | کر کے نقلیں کوئی ہنساتی تھی
گت[1] فقط ناچتی تھی کوئی پری | اور کرتی تھی اس میں جلوہ گری
فرش کے تھا اِدھر اُدھر جو مکاں | تو سنو مجھ سے تم وہاں کا بیاں
سوانگ جو اس طرف سے آتے تھے | تو وہ بس اس طرف کو جاتے تھے
ایک تن من جو تھیں کئی جنیاں | بھرتھری[2] وہ سوانگ تھیں بنیاں
حلقے سر پہ رکھے تھے سب نے بنا | لیکن ان کو کناریوں سے منڈھا
بال سر کے دیے تھے سب نے چھوڑ | دونوں ہاتھوں سے پرلٹوں کو مروڑ
مندری سُنہری بہت منگائی تھی | سب نے کانوں میں وہ لگائی تھی

آگ تھیں[3] سچے موتیوں کو جلا | تھا بھبھوت اپنے اپنے تن سے مَلا
تھیں چھپائیں جو چھاتیاں منظور | تو انھوں نے یہی کیا تھا شعور
کہ لگائیں تھیں گاتیاں سب نے | یوں چھپائیں تھیں چھاتیاں سب نے
اور سر اپنے وہ ملاتیں تھیں | ایک ہی سُر میں مِل کے گاتیں تھیں
ٹھیکرا ہاتھ پر کسی نے اُٹھا | آگ اس میں بہت سی دی تھی جلا

مَل کے کافور ہاتھ کو ہر دم | اس کو وہ سونتے تھی بس بے رحم
سوانگ بنیے کا وہ جو لائی تھی | اس نے شکل اپنی یوں بنائی تھی

---

[1] گت بھرنا، گت ناچنا: ناچنے کا ٹھاٹھ دکھانا ؎

خوشی سے کیوں گت بھرے نہ صوفی کہ دیکھتا ہو وہ بھک موا یہ
بجے ہو ڈھولک اِدھر اُدھر ہو اجاغ روشن مراد حاصل

[2] بھرتھری: ہندوؤں میں ایک قسم کے فقیر ہوتے ہیں عموماً "بھرتری" اس کا تلفظ کیا جاتا ہو [3] "تھیں بناتیں" ورق ۵۵

پگڑی رکھ سر پہ موٹی آگے کی
تا گڑی باندھ لی تھی تاگے کی

جامہ پہنا جو اس نے تھا اس دم
تو وہ تھا سات پاٹ سے بھی کم

اور چوٹی تھی اس قدر ہی بڑی
کہ وہ تھی چوتڑوں پہ اس کے پڑی

دھوتی باندھے تھی ایک موٹی سی
وہ بھی دو ہاتھ کی لنگوٹی سی

اور چکٹ تھی وہ ایسی ہی ناپید
سیروں صابن سے جو نہ ہوئے سفید

لی تھی تسبیح بھی بغل میں داب
تھا رکھا کان پر قلم کو شتاب

لیکھا چوکھا ہی کرتی آتی ہے
سب کو تقریر یوں سناتی ہے

کوئی کہتی تھی دیکھ دسم نہ ہلا
کوئی کہتی تھی اپنے پر نہ پھلا

تھا کھچایا الف کسی نے جھجک
ناک سے لے کے تا بہ مانگ تلک

خوب سا موتیا کے عطر میں بھر
آئی تھی کوئی روئی کان پہ دھر

جی میں اپنے سمجھ کوئی اچھا
پہن آئی تھی پوتھ کا لچھا

تھی جو وہ کانچ کی ٹپری سمرن
لی تھی سو کان میں کسی نے پہن

وہ جو بنیاں تھیں لیلیٰ و مجنوں
اصل سے نقل ان کی تھی افزوں

اور ہی سوانگ کوئی لائی تھی
کہ فرنگی وہ بن کے آئی تھی

ٹوپی اس نے رکھی تھی سر پہ گج
مارتی تھی قدم بنا کر دھج

اور اس نے بہت سی کر پھرتی
پہنی بانات کی تھی ایک کرتی

تھی جو ستھری ولایتی برجس
پاؤں کو دی تھی اس سے آرائش

کرچ تھی ایک ہاتھ میں خوں خوار
تولتی تھی اسے وہ سو سو بار

دوسرے ہاتھ میں جو تھا رومال
دم بہ دم اس سے جھاڑتی تھی بال

تھا جو نوکر وہ اس کے ساتھ پری
بوتل ایک اس کے ہاتھ میں تھی بھری

منھ سے پیپے کو وہ بجاتی تھی
تال وسم پر انھیں نچاتی تھی

بھانٹ[۱] متیاں ہی بیٹھیاں تھیں کہیں — ہاتھ سے اپنے کرکے صاف زمیں
کوئی کہتی تھی انھیں بھان متی — کوئی کہتی تھی انھیں جان متی
کوئی کہتی تھی حکم ہو جو ذرا — تو بُوا جن کو میں کروں بیٹا
کوئی کہتی تھی میں اگر نہ ڈروں — تو کسی لڑکے کو گلہری کروں
پر بہت ان میں جون سی تھی گرم — تھی وہ کہتی پکار کر بے شرم
اپنی خوبی کو کیا بیان کروں — کہ تو بوڑھے کو بھی جوان کروں

وہ جو ان سب میں تھی بہت خوش رو — تو وہ دو کرکے ایک گولی کو
ایک کو ناک میں چڑھاتی تھی — ایک کو کان میں چھپاتی تھی
ساتھ کھنکارنے کے دو میں ایک — وہ نکلتی تھیں دونوں ہوکر ایک
جون سی ان میں تھی بہت تصویر — وہ سلائی سے برنیوں[۲] کو چیر
آنکھ میں اپنی ڈالتی تھی اسے — اور منھ سے نکالتی تھی اسے

جون سی ان میں تھی بہت استاد — کسب تھا اس کو اپنا سارا یاد
رکھ کے انڈے کو وہ ہتھیلی پر — اور سب سے ملا کے اپنی نظر
ایک تھیلی میں ڈال لیتی تھی — اور منھ اس کا باندھ دیتی تھی
گردِ سر دے کے بس اسے چکر — پھیر[۳] لیتی تھی رکھ ہتھیلی پر
منھ سے کچھ کچھ پھر اپنے بکتی تھی — اور ہتھیلی کو وہ تھپکتی تھی
پھر یہ کہتی تھی سب سے ہے وہ کہاں — نہیں انڈے کا اس میں نام و نشاں
دیکھ وہاں بہرہ ور کو دانش ور — آکے حیرت میں رہ گیا ششدر

ان مناظر سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین کا مشاہدہ نہایت تیز تھا مختلف طبقوں

---

۱ شعبدہ باز ۲ برنی: وہ جگہ جس میں پلکیں اُگتی ہیں
۳ پھیر

کے لباس ان کی زبان اور لب و لہجے پر بڑی قدرت تھی اور اس اعتبار سے ان کی مثنوی کا یہ حصّہ اگرچہ میر حسن کے بعد لکھا گیا اور میر حسن سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ بہ ایں ہمہ تفصیل و تشریح کے اعتبار سے رنگین کا یہ نقشِ ثانی میر حسن کے نقشِ اوّل پر ایک اضافہ ہے۔

مثنوی نگاری میں دوسرا کمال جذبات نگاری میں ظاہر ہوتا ہے۔ خاص طور پر عشقیہ مثنویوں میں عالمِ فراق میں جو اشعار لکھے جاتے ہیں ان میں اعلیٰ درجے کی جذبات نگاری کا موقع پیدا ہو جاتا ہے۔ میر حسن نے بے نظیر کے غم میں بدرِ منیر کی حالت بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔[1]

رنگین کے یہاں اس قسم کے مناظر کا یہ انداز ہے ؎

مہ جبیں کی عجب ہی ہے حالت — ہے نہ وہ حُسن اور نہ وہ رنگت
غم سے پڑیاں ہیں جھائیاں مُنھ پر — چھُٹ رہی ہیں ہوائیاں منھ پر
ہونٹھ پپڑا گئے ہیں رنگ ہے فق — نہیں حواس اور ہوش مطلق
دونو آنکھیں ہیں ڈبڈبائی ہوئیں — حالتیں عشق کی ہیں چھائی ہوئیں
گاہ تڑپے ہے گاہ لوٹے ہے — بال سر کے کبھی کھسوٹے ہے
گاہ خاموش گہ خردش میں ہے — گاہ بے ہوش گہ ہوش میں ہے
گاہ پتھر پہ سر کو مارے ہے — گاہ خاموش گہ پکارے ہے
مدعا یہ کہ ایک دم میں ہے کہیں — مثلِ سیماب اس کو چین نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مناظر کے بیان کرنے میں رنگین کو زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ان کی زندہ دلی اور شوخ طبعی نے راگ رنگ کی محفلوں کی تفصیل میں بہار دکھائی ہے۔ الم انگیز جذبات کا بیان کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔

[1] سحر البیان، صفحہ ۷۸ مطبوعہ نول کشور ۱۹۲۵ء

اس اعتبار سے مثنوی میر حسن میں جو اثر آفرینی پائی جاتی ہے وہ رنگین کے یہاں نہیں ملتی۔ میر حسن کی مثنوی واقعی سحر آفرینی ہے اور رنگین کی مثنوی مضمون آفرینی اور معنی آفرینی، اس میں شبہ نہیں کہ اس مثنوی میں قدرتِ بیان، قوتِ زبان، وسیع مشاہدہ، ماحول کا مطالعہ، انتخاب اور تجزیہ سب کچھ ملتا ہے اور بلا شبہ میر حسن کی مثنوی کے بعد اس قسم کی مثنویوں میں یہی مثنوی سب سے اہم معلوم ہوتی ہے۔

رنگین اور میر حسن کی مثنوی کے مقابلے کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ رنگین نے میر حسن کی اس مثنوی سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اس کی ایک نہایت خارجی شہادت بھی ملتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی کا ایک نسخہ جو مثنوی کی سن تصنیف یعنی ۱۲۱۳ھ میں نقل ہوا ہے رنگین نے اپنی مثنوی کے اس سن کے لکھے ہوئے نسخے کے ساتھ ایک ہی جلد میں شامل کیا ہے۔ میر حسن کی یہ مثنوی[1] رنگین کے کسی بھائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جس کا نام ٹھیک پڑھا نہیں گیا غالباً شہباز بیگ خاں ولد طہماس بیگ خاں ہے۔

'شش جہتِ رنگیں'، کے نام سے رنگین نے مثنویات کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے اس میں تین مثنویاں (۱) شہر آشوبِ رنگیں (۲) دستانِ رنگیں (۳) حکایاتِ رنگیں کے عنوان سے مجموعہ 'مثلثِ رنگیں' بنایا ہے۔ دو مثنویاں 'عجائبِ رنگیں'، 'غرائبِ رنگیں'، سے مل کر 'عجائب و غرائبِ رنگیں'، کی ترتیب ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ مثنوی 'ایجادِ رنگیں'، شامل ہو کر چھ مثنویوں کا یہ مجموعہ مکمل ہو جاتا ہے۔

---

[1] پنجاب یونی ورسٹی لائبریری اردو مخطوطہ 5 .XII .1 .U

ان میں مثنوی "ایجادِ رنگیں" جسے ایک عنوان میں مثنوی مواحدِ رنگیں[۱] بھی کہا گیا ہے سب سے اہم ہے اس میں اشعار کی تعداد رنگین نے اپنے اس شعر کے مطابق بارہ سو قرار پاتی ہے۔

شعر کو چاہے کرے اس کے شمار — تو تو گن تو تین سو کو چار بار

ایک آخری شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی انشاؔ کو بھیجنے کے لیے لکھی گئی تھی۔

جب کہ رنگیں نے کیا انشا اسے — واسطے انشاؔ کے تب بھیجا اسے

اسی طرح کی ایک مثنوی فارسی میں لکھی ہے جس کا تذکرہ الگ کیا گیا ہے اس مثنوی میں مولانا روم کی مثنوی کے طرز پر چھوٹی چھوٹی اخلاقی داستانیں نظم کی ہیں۔ اس قسم کی ایک مثنوی میرحسن نے بھی لکھی تھی جس کا نام "مثنوی رموز العارفین" تھا۔ یہ مثنوی میرحسن نے ۱۱۸۸ھ میں تمام کی تھی اور اس میں بھی چھوٹی اخلاقی کہانیاں ہیں میرحسن کی اس مثنوی کی تصنیف کے وقت رنگین کی عمر اٹھارہ سال کی ہوگی وہ اس وقت حاتم کے شاگرد تھے اور بہ قول ان کے ہندی شاعری کا شوق جو ۱۱۸۵ھ سے شروع ہوا تھا ابتدائی منزلوں میں تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میرحسن کی اس مثنوی کی خاصی شہرت ہوگی کیوں کہ میرحسن اپنے تذکرے[۲] میں اس کا ذکر نہایت

---

[۱] قلمی نسخہ انڈیا آفس نمبر B 189 کاتب لکھتا ہے "تمام شد نسخہ اول "شش جہت رنگیں" مثنوی "مواحدِ رنگیں" کہ مشہور بہ "ایجادِ رنگیں" ہیں اور یہ نام یعنی "موحد رنگیں" نہیں ملتا۔ لیکن یہ ترکیب یہاں بے معنی ہے۔ "مواحدِ رنگیں" صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی رنگین کے احساسات۔

[۲] "تذکرہ شعرائے اردو" مؤلفہ میرحسن دہلوی بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۲ء میں مسلم یونی ورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوا اس کے مقدمہ صفحہ ۲ میں تذکرہ میرحسن کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین فیض آباد میں لکھا گیا (باقی بر صفحہ آئندہ)

فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ دکنی دور میں بھی بعض ایسی چھوٹی اخلاقی کہانیاں ملتی ہیں اس لیے رنگین کے سامنے ایسی مثنوی لکھنے کے لیے فارسی اور اردو میں کئی مثالیں پہلے سے موجود تھیں۔

سببِ تصنیف بیان کرتے ہوئے رنگین لکھتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے بنارس جا رہے تھے راستے میں خواجہ محمود سوداگر زادہ اور شیریں بیگ ان کے ہم سفر تھے۔ خواجہ محمود رنگین سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ چناں چہ انھوں نے رنگین کو اپنا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ بنارس کی ایک طوائف "الفو" پر عاشق ہو گئے تھے اور اس عشق میں بہ قول ان کے ؎

عشق نے ان کے کیا میرا یہ حال ہو گیا کروٹ کا لینا بھی محال

اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد رنگین عشقِ مجازی کے مقابلے میں عشقِ حقیقی کی تلقین کرتے ہیں ؎

ڈوب یا عشقِ حقیقی میں تمام ڈر کے رکھ بحرِ مجازی میں نہ گام

اس کے بعد ایک طویل وعظ ہے جس میں دنیا کی باتوں، رنگ روپ اور رونق وغیرہ کو ہیچ بتا کر نیکی کا رستہ دکھاتے ہیں۔ خود اپنی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ای رنگین تو خود شیطان ہے بلکہ شیطان سے بڑھ کر ؎

گاہ وہ ہے بیس[20] تو انیس[19] ہے گاہ تو انیس[19] ہے وہ بیس ہے

نیک کے جی میں بدی آتی نہیں بد کے جی سے تو بدی جاتی نہیں

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) جیسے کہ میر حسن خود فرماتے ہیں۔ "شروع جوانی از گردش روزگار ــــــ بہ طرفِ لکھنؤ و فیض آباد رسیدم"۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں بہ رعایت حروفِ تہجی لکھا گیا ہے۔ ہر ردیف میں تین دور قائم کیے ہیں۔ متقدمین، متوسطین، متاخرین ؛

بدی کا ذکر کرتے ہوئے بد کو بچھو سے تشبیہ دی ہے کہ اس کی فطرت میں ڈنک مارنا ہے۔ یہاں سے پہلی حکایت۔ 'حکایت کژدم' کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔

حکایت کژدم۔ اس حکایت میں بچھو کی مثال سے ثابت کیا ہے کہ فطرت بدلتی نہیں ؎

حق ہے رنگیںؔ جس کی جو فطرت میں ہے — اس کی بس دایم وہی نیت میں ہے

پھر کہتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی پروا کرنا چاہیے۔

حکایت گربہ

اس حکایت میں ظلم و تشدّد کرنے سے روکا ہے اور بتایا ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ ایک کُتے نے ایک بلی کو چیرا پھاڑا تو اس نے کہا ؎

رحم کھاتی میں اگر چوہے پہ گاہ — تو میرا کیوں حال یوں ہوتا تباہ
جو کیا تھا اس کا پھل مجھ کو ملا — اب کروں میں کس سے جا کے اپنا گِلا
ظُلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں — ناؤ کاغذ کی کہیں چلتی نہیں
ظُلم ای رنگیں بہت معیوب ہے — عاجزوں پر رحم کھانا خوب ہے

حکایت شکرہ و پدّہ یا پدّی

ظلم و ستم کے متعلق ہی یہ بھی کہانی ہے اور گربہ ہی کے سلسلے میں یہ دوسری کہانی بیان کی ہے۔

شکرے نے ایک پدّی پر حملہ کیا اس نے ایک نوجوان کے پیچھے

باکر جان بچائی تو شکرے نے کہا کہ میں آٹھ دن سے بھوکا ہوں اگر تو اس کی جان بچائے گا تو میں مرا ؎

جان اس کی تو بچے پر میں مرا — کیا ثواب[1] اس میں بتا تجھ کو ہوا

لیکن اس نیک بندے نے شکرے کو اپنی ران سے کاٹ کر گوشت کا ایک ٹکڑا دے دیا اور وہ چلا گیا اور پدہ بھی ؎

سچ تو ہی انساں انھیں کا نام ہے — رحم کھانا جن کا دایم کام ہے

آگے چل کر اپنے اوپر لعنت ملامت کرتے ہیں کہ ہمارا ہر فعل برا ہے اور دوسروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں بس نیکی کر د اولاد وغیرہ مرنے کے بعد کام نہ آئے گی ؎

کرلے نیکی تجھ سے جتنی ہو سکے — تخم اچھا ہے یہ بو گر بو سکے
بیٹھ اچھوں پاس تو شام و سحر — تا ہو تجھ میں اچھی صحبت کا اثر
اور جو اچھوں کا اثر تجھ میں نہ ہو — تو سمجھ کم سگ سے اپنے آپ کو

حکایت سگ گرجی ؎

اس کہانی میں بتایا ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک گرجی کتا ایک شخص کے پاس تھا اس نے اس کی تربیت کی تو انسان کی اچھی صفات اس میں پیدا ہو گئیں ؎

سن کے رنگیں ڈوب مر اس بات کو — یعنی صحبت کا اثر کتے کو ہو
اور جو تو انسان کہلاتا ہے یار — کچھ اثر تجھ میں نہ ہوئے زینہار
آدمیت کا تجھے کچھ غم نہیں — تو تیری کتے کی دم سے کم نہیں

---

[1] صواب ق۔ ن

حکایت دُم سگ ۔

ایک حکایت میں ہے کہ ایک شخص نے کُتے کی دُم دس برس تک نلکی میں رکھی لیکن وہ سیدھی نہ ہوئی اسی طرح اے رنگین تو بھی ہے تجھے چاہیے ؎

مالکِ سگ کا سا رنگین کام کر — نفس سگ اپنے کو اپنا رام کر
غیر کی دولت پر آنکھیں وا نہ کر — گر نہ مرغی کی طرح سے رینٹ پر

حکایت ماکیاں ۔

مرغیاں چوں کہ گندگی پر گرتی ہیں اس لیے ایک شخص نے ایک مُرغی سے پُوچھا کہ گندگی پر گرنے کی وجہ بتا۔ مرغی نے صاف صاف کہ دیا کہ یہ ہماری فطرت ہے، لیکن ہم اسے بدلنا چاہتے ہیں: ؎

لب کسی کامل کا شاید ہاتھ آئے — وہ نجاست کی کثافت[1] کو مٹائے

یعنی مرغی کو بھی احساس ہے کہ وہ غلاظت سے بچے اس لیے نیک آدمی کا لب اور رینٹ تلاش کرتی پھرتی ہے اور اے انسان تو بے خبر ہے انسان کو چاہیے کہ اپنے نفس دشمن کو اس طرح مارے جیسے ؎

مار اس دشمن کو اپنے اس طرح — سانپ کو کوّے نے مارا جس طرح

حکایت مار سیاہ و زاغ ؎

متصل ملتان کے تھا ایک باغ — تھا وہ باغ اس شہر کا چشم و چراغ

کہانی ہے کہ ایک سانپ زاغ کے بچّوں کو جو درخت کے اوپر رہتے تھے مار دیا کرتا تھا۔ سانپ درخت کی جڑ میں بل بنائے ہوئے تھا کوّے

---

[1] کسافت، ق۔ن

نے تنگ آ کر شہر کی راہ لی اور وہاں سے کسی کا سونے کا چھلا لے اُڑا۔ لوگ پیچھے پیچھے آئے۔ کوے نے وہ چھلا سانپ کے بِل میں ڈال دیا۔ لوگوں نے بِل کو کھودا تو سانپ نکلا۔ سانپ کو مار دیا اور چھلا لے کر واپس ہو گئے۔

اپنے نفس کو کالے سانپ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بس یہ دشمن نفس جو ہے بے زبان اس کو کالے سانپ سے تو کم نہ جان
پاؤں کے نیچے تو اس کے سر کو مل تجھ سے جتنا ہو سکے اس کو کچل

آخری شعر ؎

مت سمجھ پوچ اس میری گفتار کو مکڑی لیتی ہے پکڑ پر دار کو

حکایتِ عنکبوت و مگس

کہانی ہے کہ ایک مکڑی نے ایک مکھی کو اپنے جال میں گرفتار کر لیا کسی نے دیکھ کر مکھی کو جال سے نکال لیا اور خوش ہوا کہ میں نے ایک کی جان بچائی، لیکن اس وقت غیب سے ندا آئی کہ تو نے جو آٹھ دن سے بھوکی تھی اس پر ظلم کیا۔ خدا کے قانون میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ؎

تو نہ ہونا غافل اے رنگین کہیں کچھ یہاں دم مارنے کی جا نہیں
فی الحقیقت گو مگو کی ہے یہ جا وہ کرے جو کچھ کہ چاہے ہم کو کیا
سمجھیں کیا حکمت کے اس کی رمز ہم ہے کہیں شہد اور کہیں ہے گا وہ سم

حکایتِ طوطا و مردِ کافر کہ مسلمان شدہ ؎

ایک طوطا بولنے میں طاق تھا اس کا پڑھنا شہرۂ آفاق تھا

طوطا ہوشیار اور سمجھ دار تھا اس کا مالک گنہ گار تھا ایک دن مالک
گناہوں کی وجہ سے رو رہا تھا۔ طوطے نے کہا ؎

آج تک تو ہیں کھلے توبہ کے در ۔۔۔ حق سے ڈر کر دل سے استغفار کر
جب خدا ناکردہ ہو جاویں گے بند ۔۔۔ تب نہیں ہونے کی توبہ سود مند

طوطے کی یہ باتیں سن کر وہ مسلمان ہو گیا اور گناہوں سے توبہ کی،
شاعر کہتے ہیں کہ ہم تو طوطے سے بھی گئے گزرے ہیں، دوسروں کو تو کیا
سیدھا راستہ دکھائیں گے خود ہی غلط رستے پر چل رہے ہیں۔

آخری شعر ؎

مرد ہی تو مرد ہو جا اے عزیز ۔۔۔ ورنہ تجھ سے مرد سے بہتر ہی حیز[1]

حکایت حیز منصف۔

حیز نے کہا کہ جو دنیا سے محبت کرتا ہی وہ مرد نہیں ؎

ایک ہم ہیں طالب دنیائے دوں ۔۔۔ رنڈیوں سے سارے عالم کی زبوں

حکایت یہودی اور مرد مسلمان ؎

تھا یہودی ایک مرد حق شناس ۔۔۔ شہر میں رہتا تھا وہ شبلی کے پاس

کہانی ہی کہ ایک مسلمان نے اس یہودی سے اسلام لانے کو کہا
اس نے جواب دیا ؎

حضرتِ شبلی کا جو اِسلام ہی ۔۔۔ اس کی خواہش مجھ کو صبح و شام ہی
پر جو ہی آئین تیرا اے خودپسند ۔۔۔ اس سے میرا کفر بہتر ہی دوچند

---

[1] ہیز، مخنث۔ لغت کی کتابوں میں عام طور سے بڑے ہوز سے ہی۔ لیکن فارسی کی بعض پرانی کتابوں میں حائے حطی سے بھی لکھا ہی۔ اردو میں لفظ ہیجڑا غالباً جو اسی سے بنا ہی مشتق بھی بڑے ہوز سے ہی لکھا جاتا ہی۔

پھر یہودی نے کہا ؎

یعنی میں کافر ہوں پر ہوں نیک کار تو مسلماں ہو و لے ہو بد شعار
منصف اس کو سُن کے رنگیںؔ جی میں ہو کفر سے بد تر نہ کر اسلام کو

آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ ہے ؎

دم کا اک ہم دم بھروسا کس کو ہے ہے وہ ناداں اس پہ تکیہ جس کو ہے
حرص کے دانتوں کو آمت تیز کر صحبتِ بد سے ذرا پرہیز کر

حکایت بوتیمار (بگلا) ؎

چاند کو پانی میں بگلا دیکھ کر جی میں یہ سمجھا کہ مچھلی ہے مگر

ایک مرتبہ بگلے نے چاند کا عکس پانی میں دیکھ کر سمجھا کہ یہ مچھلی ہے اسے پکڑنا چاہیے لیکن ناکام رہا پھر مچھلی بھی نظر آئی تو اس کے کھانے کی ہوس نہ کرتا اس خیال سے کہ ممکن ہے یہ بھی عکس ہی ہو اور میری کوشش رائیگاں جائے چناں چہ بھوک سے مر ہی گیا ؎

تو بھی گھر پانی پہ رنگیںؔ مت بنا ہے فنا آخر فنا آخر فنا

رنگیںؔ کہتے ہیں کہ دنیا سے دل نہ لگا۔ سب کچھ یہیں رہ جائے گا جو ساتھ جائے گا وہ تمھارے اچھے اعمال ہوں گے ؎

ساتھ دولت تیرے جائے گی نہیں رسم یہ ہرگز زمانے کی نہیں

حکایتِ شُتر ؎

اونٹ سے پُوچھا کسی نے دے کے دم بات تجھ سے پوچھتے ہیں ایک ہم

کسی نے اونٹ سے پُوچھا کہ تجھے چڑھائی پسند ہے یا اُتار اس نے کہا دونوں

یہ لعنت ہے۔ شاعر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے نہ ہمیں دین ہی ملا اور نہ دُنیا ہی ؎

سگ بنے دھوبی کی نا ندین چاٹ کے ہائے ہم گھر کے ہوئے نے گھاٹ کے

دین و دنیا کے متعلق کہتے ہیں ؎

فرق تاریکی میں کر اور ماہ میں چل نہ اندھوں کی طرح سے راہ میں

حکایت مرد کور و مرد بینا ؎

ایک اندھا ایک بینا کا تھا یار ربط تھا دونوں میں باہم بے شمار

کہانی ہے کہ ایک اندھا اپنے بینا دوست کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ کہیں دونوں نے قیام کیا۔ اندھے کے ہاتھ میں قمچی تھی وہ کہیں گر گئی اس نے تلاش کی تو اندھیرے میں سانپ اس کے ہاتھ آگیا۔ بینا نے کہا کہ یہ سانپ ہے تو اسے مار دے۔ اندھے نے کہا تو مجھے دھوکا دے کر یہ قمچی جو تیری قمچی سے اچھی ہے اور نرم ہے لینا چاہتا ہے اور بینا کی بات کو نہ مانا اتنے میں سانپ نے اسے کاٹ لیا اور اندھا مر گیا۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ اے رنگین اس شعر کے مطابق ؎

تو بھی کالے سانپ کو قمچی نہ جان تا زیاں پاوے نہ کچھ اے مہرباں

پھر کہتے ہیں ؎

سانپ کیا ہے سانپ ہے یہ نفس سگ تجھ سے جو ایک دم نہیں ہوتا الگ

گر رہا تو اس عدو سے ہوشیار بچ رہا تو لومڑی کی طرح یار

حکایت روباہ و خرگوش ؎

لومڑی کا دشمن ایک خرگوش تھا پر بہت بے عقل اور بے ہوش تھا

خرگوش لومڑی کی فکر میں لگا ہوا تھا اور خوشامدانہ طریقے سے اسے
اپنے جال میں پھنسا کر مارنا چاہتا تھا۔ خرگوش بھیڑیے سے ملا اور دوستی
پیدا کر کے اسے لومڑی کے دروازے پر لے جا کھڑا کیا اور خود اندر گیا
خرگوش نے لومڑی سے کہا کہ ایک مہمان آیا ہے اس کی تواضع کرنی چاہیے
لومڑی اس کو اپنا عدو سمجھتی تھی۔ لومڑی نے خرگوش کو رستہ بتایا کہ مہمان
کو فلاں رستے سے لانا اور آگے آگے تو آنا ؎

تھا بتایا اس نے جو اس راہ کو   وہاں کیا خس پوش تھا ایک چاہ کو
دونوں کے دونوں اس چاہ میں گر پڑے اور مر گئے۔ چناں چہ رنگین

فرماتے ہیں ؎

ہے بُرائی کا ثمر رنگیں یہی   پوست کندہ مَیں نے اب تجھ سے کہی
آگے چل کر کہتے ہیں کہ دوست دشمن میں پہچان رکھو دوست کو دشمن
تصور نہ کرو ورنہ زیاں ہوگا اور دشمن کو دوست نہ سمجھو ورنہ وہ تمھاری کھال
بھی کھینچ لے گا۔

حکایتِ باز و ماکیاں ؎

باز نے طعنہ دیا مُرغی کو یوں   تو بھلا انسان سے بھاگے ہے کیوں
باز نے مُرغی سے کہا کہ تو انسان سے نہ بھاگا کر کیوں کہ انسان تجھ پر بہت
احسان کرتا ہے اور تجھے پالتا ہے اور جب وہ بُلاتا ہے تو نہیں جاتی اور ایک
مَیں ہوں کہ ذرا سے اشارے سے انسان کے پاس جانے کو تیار ہو جاتا
ہوں، مُرغی نے جواب دیا کہ انسان مرغی کو ذبح کرتا ہے اور باز کی اسے خواہش
نہیں ؎

کچھ نہیں خواہاں وہ تیری جان کا آدمی دشمن ہی میری جان کا

پھر کہتے ہیں ؎

پاس دشمن کے تو ای رنگین نہ جا دیکھ ورنہ پائے گا آخر دغا
دوست کو تو دوست اپنا جان رکھ پر عدو کو بھی ذرا پہچان رکھ

نصیحت ؎

چار چیزوں کو نہ تھوڑا جانیو عرض یہ میری ہی اس کو مانیو

ایک تو آگ سے ڈرنا چاہیے دوسرے قرض سے اور تیسرے بیماری کو کم نہ سمجھنا چاہیے ؎

ایک دمڑی قرض ہو یا لاکھ ہو دہر میں مقروض کی کب ساکھ ہو
چوتھے عاجز ہوئے گو اپنا عدو ہو جیو ایمن نہ اس سے ایک ہو

حکایت مردِ طامع و گرگ ؎

لومڑی کے پھاندنے کا کر خیال ایک نے صحرا میں پھیلایا تھا جال

ایک طامع نے جال بچھایا اور اس میں گوشت رکھ دیا اس جال میں اتفاق سے بھیڑیا پھنس گیا۔ طامع ہرن سمجھ کر جال کے پاس پہنچا بھیڑیے نے اس کے منھ مارا اور وہ طامع مرگیا اور بھیڑیا جال میں پھنس کر مرگیا۔ جس کی موت جس طرح لکھی ہی اسی طرح آتی ہی اس لیے نیک کام کرنا ضروری ہی یہی نیک اعمال ساتھ جائیں گے ؎

ہاں مگر کر جائے گا جو نیک کام دہر میں چندے رہے گا اس کا نام

حکایت مار و ضِفدعہ[1]

میںڈک نے سانپ سے پُوچھا کہ تو کیوں مجھے کھاتا ہو اس نے کہا کہ رسمِ دُنیا یہی ہو مجھے مور کھا جاتا ہو یہ تو دستورِ دنیا ہو جیسا کوئی کرے گا ویسا بھرے گا : ؎

کہہ گئے ہیں اگلے جو اس ہاتھ دے پھر وہی اس ہاتھ کا اس ہاتھ لے

حکایت مردِ مسافر با خدا۔

جنگل میں ایک مردِ خدا نے ایک کتے کو گیدڑ کا پاؤں چباتے دیکھا ایک آدمی آیا اس نے کتے کے ڈنڈا مارا وہ لنگڑا ہوگیا اتنے میں ایک سوار آنکلا اس کا گھوڑا عیب دار تھا۔ اس گھوڑے نے اس کتے کو مارنے والے کے ایک لات ماری تو ران کی ہڈی ٹوٹ گئی گھوڑا جب آگے بڑھا تو اس کا پیر ایک بل میں جا پڑا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی چناں چہ شاعر کہتا ہو کہ اس دنیا میں رات دن یہی ہوتا رہتا ہو ؎

روئیں رنگیں روز و شب اس غم کو کیا کارخانہ حق کا ہو یہ، ہم کو کیا

کہتے ہیں ای رنگیں ؎

تو ہو کیا شے اور ہو کیا تیری بساط جس پہ یہ کرتا ہو تو عیش و نشاط

حکایت وصیت برادر بہ جان برابر خدا یار خاں مرحوم۔

رنگین کہتے ہیں کہ میرے بھائی نے مرتے وقت مجھ سے وصیّت کرنا شروع کی کہ خدا سے ہمیشہ ڈرنا اور محتاجوں کو مقدور کے مطابق دیتے رہنا مال وغیرہ پر غرور نہ کرنا اور موت کو ہر وقت یاد رکھنا قبر میں حساب دینا ہوگا

---

[1] ضفدع :۔ مینڈک

ڈر تجھے کچھ آہ یزداں کا نہیں سوچ ذرا اپنے ایماں کا نہیں

حکایت مار مکار۔

ایک سانپ بہت ہی بوڑھا تھا لیکن آفت کا پرکالہ شکار کرنے کی طاقت اس میں نہ تھی۔ ایک دن اس نے دل سے مشورہ کیا جب اسے بھوک نے تنگ کیا تو تالاب کے پاس آ بیٹھا۔ مینڈک نے پوچھا کیوں رنجور ہیں پھر مینڈک اپنے شاہ کے پاس گیا اور اس کا شاہ سانپ کے پاس آکر کہنے لگا کچھ تو حال اپنا سنائیں اس نے کہا کہ میں بھوکا تھا ایک زاہد کے حجرے[1] میں مینڈک پر دوڑا لیکن وہ بھاگ گیا۔ زاہد کا لڑکا پڑا سو رہا تھا میں نے اس کے پیر کو مینڈک سمجھا اور کاٹ لیا وہ فوراً ہی مر گیا۔ زاہد نے بد دعا کی کہ یہ سانپ کبھی مینڈک کو نہ پکڑ سکے اور یہ میرے لڑکے کو کاٹنے والا سانپ ایسا ہو جائے کہ اس پر مینڈکیاں سوار ہوں اور گھوڑے کا کام لیں۔ لہذا زاہد کی دعا قبول ہو گئی میں مینڈکوں کو پکڑنے کے قابل نہیں رہا۔

مینڈک کے شاہ نے کہا کہ تو میرا اسپ بن اور روزانہ تجھے ایک مینڈک ملا کرے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوتا رہا ؎

جب سے رنگیں ہو گیا ہے تو بھی پیر ہیں بہت تب سے تیرے مکر ای شریر

تو مال و دولت دھوکا دے کر حاصل نہ کر اولاد وغیرہ سب مل کر دولت کو کھائیں گے لیکن اس کی سزا صرف تجھ ہی کو ملے گی ؎

کون اس جا کام تیرے آئے گا مظلمہ میں تو ہی پکڑا جائے گا

---

[1] حجرے، ق۔ ن

حکایت افغان گرسنہ ۔

ایک روہیلہ بھوک سے تنگ آ کر گھر سے نکلا تو ایک باہمن کو دیکھا کہ اپنی رسوئی ٹھیک کر چکا تھا۔ روہیلہ نے موقع پا کر چوکے میں قدم رکھ دیا۔ برہمن رسوئی چھوڑ کر باہر آ گیا اور روہیلہ نے سب کھانا کھا لیا دوسرے دن بھی ایسے ہی کیا۔ چناں چہ تیسرے دن پھر آیا تو برہمن نے خود ہی چار روٹیاں کھانے کو دے دیں۔ پٹھان کا یہ کردار مفلسی کی وجہ سے تھا نہ کہ عیاری کی وجہ سے۔ عام طور سے لوگوں کا ظاہر اور ہوتا ہے اور باطن اور ؎

مثل ظاہر، باطن اپنا کر درست　　　باندھ ہمت کی کمر کو ہو کے چست

حکایت مرید و مرشد کامل ۔

ایک مرید پر اپنے پیر کی تعلیم کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ مرشد نے تنہائی میں پوچھا تجھے کس سے محبت ہے اس نے کہا بھینس سے۔ مرشد نے کہا اس کا دھیان رکھا کر چناں چہ مرشد نے کمرے کے اندر سے اسے بلایا تو وہ بولا کہ میرے سینگ در میں اڑتے ہیں ؎

آ گیا جو وہ فنا کی شان میں　　　بن گیا بھینس آپ اپنے دھیان میں

ہو تصور جس کو اتنا ذات کا　　　غش ہوں رنگیںؔ اس کی میں اوقات کا

مرشد نے کہا کہ بس اب اس پر رنگ چڑھ گیا۔

حکایت مرد زاہد خدا شناس ؎

ایک زاہد اتقا میں طاق تھا　　　زہد اس کا شہرۂ آفاق تھا

ایک متقی کو ایک دن کسی نے دھکا دیا لیکن اس نے فراشی سلام کیا کسی نے اس سے پوچھا کہ تو نے جھک کر سلام کیوں کیا اس نے جواب دیا ؎

بد بدی سے گر نہ اپنی باز آئے　　نیک کیوں نیکی سے اپنا ہاتھ اُٹھائے
اس کا ثمرہ یہ کہیں پا جائے گا　　میرے دھکے میں دغا کھا جائے گا

آگے چل کر کہا ہے کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہے موت کسی کو نہیں چھوڑے گی بڑے بڑے شان دار لوگ قبرستان میں پڑے ہیں جنھوں نے نیک کام کیے تھے وہ نیک نام ہیں اور جنھوں نے بد کام کیے تھے وہ بد مشہور ہیں ؎

مت ستا ہرگز کسی کو آپ سے　　یہ نصیحت ہم کو ہے ماں باپ سے

حکایت بلبل۔

بلبل نے دو پھول توڑے تھے اس کا بدلا یہ ملا کہ جال میں پھنس گئی تب اس نے صیاد سے کہا کہ میں نے دو پھولوں کو تکلیف پہنچائی اس کی سزا میں میں جال میں گرفتار ہوں اب تو سمجھ لے کہ مجھے مارنے اور پکڑنے کی سزا تجھے کیا ملے گی۔ یہ سُن کر صیاد نے اسے چھوڑ دیا ؎

وہ جو احمق ہے نہیں اس کا علاج　　وہ نہ کل سمجھا نہ کچھ سمجھے گا آج

حکایتِ سائیس[1] ؎

نوکر ایک گھوڑے پہ ایک سائیس تھا　　حمق میں لیکن وہ سب سے بیش تھا

ایک دن اس سائیس کا آقا اپنی آشنا کے گھر گیا یہ سائیس قریب ہی

---

[1] رنگین نے قلمی نسخے میں اس کا املا یونہی لکھا ہے، رائج اِملا "سائیس" ہے۔

اپنے گھر جا کر سو رہا کوئی گھوڑا کھول لے گیا یہ اپنے آقا کے پاس پہنچا اور کہا ؎

جا کے کوٹھے پر کہا کیوں جی میاں　　چھوٹ کر گھوڑا ابھی آیا ہو یہاں

آقا اس بات پر ہنسا ؎

احمقی پن خوب ای رنگیں نہیں　　دیکھ مت اس جال میں پھنسا کہیں

حکایت عقل مند و کم عقل و بے عقل۔

جنگل کے کسی تالاب میں تین مچھلیاں رہتی تھیں ؎

شام کو صیاد پہنچا ایک وہاں　　بولا ڈالوں گا سحر[1] کو جال یہاں

جب صبح کو جال ڈالا تو کم عقل مچھلی گھبرا گئی اور مردہ بن گئی۔ صیاد نے اسے مُردہ سمجھ کر پھینک دیا اور اس کی جان بچ گئی۔ جو دانا تھی صیاد کی بات کو سُن کر آگے چلی گئی جو تیسری تھی وہ احمق تھی اور جال میں پھنس گئی۔ صیاد اسے کام میں لایا۔ بس دانائی یہی ہو کہ موت سے پہلے عقل سے کام لیا جائے اور جوانی ہی میں نیک کام کیے جائیں اگر بڑھاپے میں بھی خیال آ جائے تو غنیمت ہو ورنہ احمق پنے سے موت بہتر ہو۔

حکایت کنجشک خانہ کی۔

ایک چڑیا اور ایک چڑے نے کسی کے گھر میں گھونسلا بنا لیا تھا اس آدمی نے گھونسلے کو اُتار پھینکا۔ چڑے نے کہا اس سے بدلہ لینا چاہیے چڑیا نے کہا کہ ذرا خاموش رہ اور شام ہونے دے جب شام ہوئی تو چراغ کی بتی چڑیا نے چونچ سے اُٹھا کر چھپّر پر رکھ دی، گھر فوراً ہی جل گیا اس طرح

---

[1] ق ۔ ن صحر۔

چڑیا نے انتقام لیا۔ شاعر کہتا ہے کہ نفس تیرا دشمن ہے اگر تو نے اسے مار لیا تو تو شاہ روم سے بھی بڑھ گیا۔

نفس کے مارنے کا طریقہ یہی ہے کہ اسے خوراک اچھی نہ دو اس کا کہا نہ مانو اور برعکس کرو ؎

دوست یہ در پردہ دشمن ہے تیرا　　تو مسافر ہے یہ رہزن ہے تیرا
دشمنِ دانا کو بھائی جانیے　　یار ناداں کا نہ کہنا مانیے

حکایتِ خرس و باغ باں۔

باغ باں کا ایک باغ تھا وہاں اس نے ایک ریچھ بھی پالا ہوا تھا یہ ریچھ تمام قسم کے میوے کھاتا اور باغ بان کے ساتھ گنجفہ، شطرنج اور چوسر بھی کھیلا کرتا۔ اس سے زیادہ گہرا دوست باغ بان کا کوئی نہ تھا۔ ایک دن باغ بان نے بہت سے میوے کھا لیے اور نشے میں ہو کر سو رہا اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں تو وہ ان کو اُڑانے گیا۔ لیکن وہ مٹھاس کی وجہ سے نہ ٹلیں۔ چوں کہ مکھیاں نہ ٹلتی تھیں اس لیے ریچھ کو غصہ آتا تھا وہ ایک پتھر اُٹھا لایا اور منہ پر زور سے مارا تاکہ مکھیاں مر جائیں۔ بجائے اس کے کہ مکھیاں مرتیں اس کے دوست ہی کا سر پھٹ گیا۔

چناں چہ شاعر کہتا ہے ؎

دوست جو ناداں ہو اس سے لاکھ چند　　دشمنِ دانا ہو خوب اے ہوش مند
دوست وہ ہے جو کہ جانی دوست ہو　　ہے وہ دشمن جو زبانی دوست ہو
جس کو رنگیںؔ اپنے مطلب سے ہو کام　　گن نہ یار اپنا اسے اے نیک نام

آشنائی دیکھ چھوٹوں سے نہ کر کیوں کہ اس میں ہوئے گا تیرا ضرر
دوستی تو کر بڑے لوگوں کے ساتھ تا کہ حاصل تجھ کو ہو کچھ ہاتھوں ہاتھ

حکایت مردِ تجربہ کار۔

ایک سے کسی نے پوچھا کہ تیرے جانی دوست کتنے ہیں اس نے جواب دیا کہ آج دولت و ثروت کی وجہ سے دشمن بھی دوست ہے

جب خدا ناکردہ تنگی آئے گی بات یہ تب امتحاں ہو جائے گی
خود غرض جو دوست ہے وہ ہے عدو بھو لیومت دوستی پر اُس کی تو
اور جہاں پایا غرض نے انصرام پھر اسے ہرگز نہیں تجھ سے کام

حکایت زن و شوہر

ایک شخص کی بیوی نہایت خوب صورت اور صاحب جمال تھی۔ اس کا شوہر کمال کا بدصورت تھا۔ عورت کو اس سے کوئی رغبت نہ تھی۔ ایک رات چور گھر میں آیا تو وہ عورت ڈر کے مارے شوہر کی پیٹھ سے چمٹ گئی تو وہ سمجھا کہ میری قسمت کھلی جب چور پر نظر پڑی تو کہا کہ جو چاہے یہاں سے اُٹھا کر لے جا اور روز آیا کر

جس زن و شوہر میں رنگیں ہو نہ پیار اُس زن و شوہر کی کیا ہو زیست یار
جس کی جورو میں نہ ہوئے خوئے زشت جیتے جی اس کو ہو دُنیا میں بہشت

حکایت مردِ گازر۔

ایک دھوبی نے ایک بیل پالا تھا اس پر وہ لادی لادتا تھا جب

دھوبی کی شادی ہوئی تو دھوبن ایک گدھا جہیز میں لائی۔ دھوبن کو گدھے سے زیادہ محبّت تھی اس لیے بیل کا راتب بھی گدھے ہی کو دے دیا کرتی تھی۔ گدھا موٹا ہوتا گیا اور بیل دُبلا۔ جب دھوبی کو علم ہوا تو اس نے کہا کہ خدا کرے اس کا گدھا مر جائے اور میرا بیل بچ جائے۔ اتّفاق سے بیل مرگیا تو دھوبی نے کہا ؎

کب سے کرتا ہو خدائی ای خدا ۔۔۔ پر نہیں پہچانتا بیل اور گدھا

خدا کے سامنے تو بیچارگی ہو اور بندگی ہو اور بس ہر بات پر شاکر اور صابر رہنا چاہیے ؎

دیکھ تو برخود غلط اتنا نہ ہو ۔۔۔ مت فلاطوں جان اپنے آپ کو

حکایت مرد دہقان۔

ایک تلاش دہقانی کسی شہر میں گیا۔ بھوک لگی تو روٹیوں کی دُکان تلاش کی۔ ایک نانبائی سے سودا کیا۔ نان بائی نے کہا کہ دو آنے میں پیٹ بھر کے روٹی کھا سکتا ہو۔ جب اس نے آٹھ آنے کی کھالی تو دُکاندار نے کہا تو کب تک ایسے ہی کھاتا رہے گا۔ دُکان کے پاس نالا بہ رہا تھا اس نے کہا کہ جب تک یہ بہتا رہے گا۔

بس کو ای رنگیں قناعت ہی نہیں ۔۔۔ اس کو دنیا میں فراغت ہی نہیں
جو مقدر میں ہو سو آئے گا ہاتھ ۔۔۔ تیری روزی یوں ہو تیرے دم کے ساتھ
بہ تری کوشش نہیں ہو کچھ بجا ۔۔۔ سعی تیری سے بھلا ہوتا ہو کیا
ہو کے قانع حرص کو موقوف کر ۔۔۔ واسطے روزی کے مت پھر در بہ در
ہو قناعت تو جواں مردوں کا کام ۔۔۔ شاہد اس پر مولوی کا ہو کلام

سلہ ق۔ن النسرام

کاسۂ چشم حریصاں پُر نہ شد تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شد

حکایت مردِ مسافر و بھٹیاری

کہتے ہیں ایک مسافر کسی شہر کی سرائے میں ٹھیرا۔ بازار سے آٹا خرید کر بھٹیاری کے پاس گیا اور کہا کہ اسے پکا دے۔ یہ مسافر بھٹیاری کو چور سمجھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بھٹیاری بھی چُرانے کی فکر میں تھی لیکن بھٹیاری بازی نہ لے جا سکی۔ مسافر زیادہ ہوشیار تھا۔

حکایت مردِ شیخ کہ خود را سید می گفت

ایک شیخ کو سید کہلانے کا شوق تھا سب سے کہا کرتا کہ مجھے میر صاحب کہا کرو۔ ایک دوست نے کہا تیرا باپ تو شیخ ہی۔ جواب دیا کہ میں نے ایک سیدانی سے شادی کی ہی اور وہ بے حد حسین ہی۔ اس رشتے سے میں اپنے آپ کو سید کہلانا چاہتا ہوں۔ اس دوست نے کہا کہ جورو کا رشتہ نہیں لگا کرتا۔ رنگین کہتے ہیں کہ ایسی مخلوق سے محفوظ رہو۔

حکایت کانس و درخت بڑ

جنگل میں ایک نرم اور لمبی گھاس ہوتی ہی اسے کانس کہتے ہیں۔ ہوا یعنی بادِ تُند اس کانس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن بڑ کا درخت جس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں اسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکتی ہی

مکر و فن تجھ کو بہت سا یاد ہی کام کا اپنے تو ایک اُستاد ہی
گہ ملائم ہی تو اور گاہ ہی کرخت گاہ تو ہی رحم دل اور گاہ سخت

حکایت سفید باف یعنی جُلاہہ

ایک جولاہہ ہمیشہ کپڑا ہی بُنتا رہتا تھا ایک دن جب تھک گیا تو کہا کہ کچھ آرام کرنا چاہیے۔ چناں چہ وہ سر لپیٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ آدمی بھی بکھیرے سے کم نہیں کبھی آسمان پر کبھی زمین پر چناں چہ شاعر کہتا ہے ؎

تو بھی رنگیںؔ ایسی کم ظرفی نہ کر ہو کے ناداں بن نہ احمق اس قدر
عاجزی کو اور اس مستی کو چھوڑ خاکساری کو زبردستی کو چھوڑ

حکایت قاضی و مردِ بے نوا۔

کسی بے نوا نے کسی کے دھول مارا وہ قاضی کے پاس گیا۔ قاضی نے کہا کہ جس کے دھول مارا ہے اسے آٹھ آنے جرمانہ دے۔ اس بات پر بے نوا نے قاضی کے بھی ایک دھول جڑا اور کہا کہ جب آٹھ آنے دھول ہی ہے تو پھر کیا بے نوا نے رُپیہ نکال کر دیا اور کہا کہ دونوں اسے بانٹ لو ؎

الغرض جتنے ہیں دُنیا میں فقیر ان کو ای رنگیںؔ سمجھ تو مت حقیر
یہ لوگ اگرچہ دشمن کو بھی نقصان نہیں پہنچاتے تاہم ان سے ڈرنا چاہیے ؎
گو نہیں ان سے عدو کو بھی ضرر پر ڈرا کر ان سے تو شام و سحر

حکایت بادشاہ جلد مزاج و باز

ایک بادشاہ کے پاس بے شمار فوج تھی اور دولت کی بھی بہتات تھی۔ ایک دن وہ شکار کو گیا۔ شکار بھی ہاتھ نہ آیا اور بادشاہ بھی اپنے

لشکر سے جُدا ہوگیا اور گھبرایا اس کے ہاتھ پر ایک باز بھی تھا۔ بادشاہ
کو سخت پیاس لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑ ہے وہاں چیل اور کوّے
اُڑ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ پانی قطرہ قطرہ ہوکر پہاڑ سے ٹپک
رہا ہے۔ جب جام بھر گیا اور بادشاہ نے پینا چاہا تو باز نے پَر مار کے
گرا دیا۔ بادشاہ نے غصّے میں آکر اسے مار ڈالا اور سوچا اب اوپر جاکر ہی
جلدی سے پانی پی لوں۔ یہاں تو قطرہ قطرہ ہوکر ٹپک رہا ہے وہاں جاکر
دیکھا کہ ایک مار مردہ جو دس گز سے کم نہیں چشمے میں پڑا ہوا ہے اس کا
زہر پانی میں مل مل کر آ رہا تھا اس جلد بازی نے اسے نقصان پہنچایا کہ
اس نے باز کو مار دیا ہے

کام جلدی کا ہے ای رنگیں زبوں   کر گئے ہیں پند یہ سب رہنموں
ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے تاکہ بعد میں پشیمانی اُٹھانی نہ پڑے ہے

یہاں کے کار و بار میں ناداں نہ ہو   کام میں عقبیٰ[1] کے مت انجان ہو
واسطے عقبیٰ کے منہ دنیا سے موڑ   واسطے دنیا کے عقبیٰ کو نہ چھوڑ

یعنی اس دُنیا میں نہ پھنس اور کسی کو تکلیف نہ پہنچا اگر تیری طبیعت میں بچھو
کی طرح ڈنک مارنا ہی ہے تو تجھے اختیار ہے۔

حکایت کژدم و سنگ پشت[2]۔

ایک بچھو اور کچھوے میں گہری دوستی تھی۔ ایک دن دونوں سفر کو
چلے ایک دریا عبور کرنے کے لیے کچھوے نے بچھو کو اپنی پیٹھ پر بٹھالیا۔
جب بیچ میں پہنچے تو بچھو نے ڈنک مارا کچھوے نے پُوچھا یہ کیا۔ بچھو نے کہا
کہ میری سرشت ہی میں یہ ہے پھر کچھوے نے بھی ایک غوطہ لگا کر بچھو کو پیٹھ سے

---

[1] عقبیٰ: آخرت   [2] کچھوا

علیحدہ کیا اور کہا کہ مَیں بھی اپنی خو سے مجبور ہوں ۔ بچھو مر گیا ۔

دیکھ رنگیںؔ بد بدی کا ہے ثمر نیک نیکی کا ہے پھل اے بے خبر
نیم میں ہرگز نہیں لگتے انار ناشپاتی سے پھلے کیوں کر چنار

حکایت مردے کہ دردِ شکم داشت ۔

ایک شخص کے پیٹ میں سخت درد تھا وہ طبیب کے پاس جا رہا تھا کہ طبیب رستے میں مِل گیا ۔ اس نے دَوا چاہی اور طبیب کو بتایا کہ مَیں نے رات نان سوختہ کھائی تھی طبیب نے اسے آنکھ میں لگانے کے لیے سُرمہ دیا اور کہا کہ تیری آنکھوں کا علاج کر رہا ہوں تاکہ اچھی اور بُری چیز کو پہچان سکے ؎

حرص کے مارے نہ کھا روٹی جلی بات یہ حق میں نہیں تیرے بھلی
اب تو مجھ سے سُن کے ایک بلّی کا حال صبر کر اور مت طمع کا کر خیال

حکایت گربہ و پیرزال[1]

ایک بُڑھیا کے گھر میں ایک بلّی پلی تھی اس نے سوائے سوکھے ٹکڑوں کے اور کچھ کبھی نہ کھایا تھا اس میں صرف کھال اور ہڈیاں ہی تھیں ۔ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ چوہے آ کر اس کے کان کترتے تھے ۔ ایک دن اس نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا کہ ہم سائے کے دسترخوان پر عمدہ عمدہ کھانے چُنے ہوئے ہیں ۔ کھانوں کی خواہش سے وہ کُود کر دسترخوان کے پاس گئی کِسی نے چوب دستی ماری وہاں سے بُڑھیا کے مکان میں آئی چوٹ زیادہ لگی ہوئی تھی ۔ بڑھیا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ؎

---

[1] بوڑھی عورت

گر قناعت کرتی ٹکڑوں پر پڑے دست و پا تو ٹوٹتے یوں کیوں ترے

نتیجہ نکلا کہ انسان کو قانع ہونا چاہیے۔

حکایت مردِ کامل :۔

رنگینؔ سے ایک کامل نے کہا دنیا دار کی چشمِ تنگ کو قناعت پُر کرتی ہے یا گور۔ مولانا نے مثنوی میں کہا ہے ؎

شکر نعمت نعمتت افزوں کُند کفر نعمت از کفت بیروں کُند

آہ تو تو شکر کرتا ہی نہیں مطلقاً مرنے سے ڈرتا ہی نہیں

یہ تکبّر کام ہے شیطان کا جوہرِ ذاتی ہے خُلق انسان کا

حکایت مردِ مغرور و مردِ فقیر :۔

ایک شخص درس میں جاتا تھا اور کسی کا سلام تک بھی نہیں لیتا تھا اس لیے کہ اسے اپنے علم پر گھمنڈ تھا۔ ایک دن ایک فقیر نے اس سے کہا کہ درس میں آنے سے کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ تمھارے خُلق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فقیر کی نصیحت سے اس نے تکبّر و غرور کرنا چھوڑ دیا۔ چناں چہ شاعر اپنی طرف مخاطب ہو کے کہتا ہے ؎

نخوت و پندار کو آ چھوڑ دے شیشۂ کبر و منی کو توڑ دے

پہلے تو انسان کے سے کرے کام بعد اس کے آدمی رکھ اپنا نام

آدمی اسے کہتے ہیں جو کسی کو نہ ستائے۔

حکایت سگ آدم شناس۔

کسی نے کُتّے سے پوچھا کہ تو رستے میں کیوں پڑا ہے۔ اس نے کہا

اس لیے بیٹھتا ہوں کہ دیکھوں کون بد ہے اور کون نیک۔ نیک خاموشی سے گزر جاتا ہے اور بد ستاتا ہے ؎

نیک و بد کا تا کروں مَیں امتحاں اس لیے بیٹھوں ہوں وہاں اے مہرباں

چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ کُتّے کو نیک انسان کی تلاش ہے اور تو ہر وقت فکرِ معاش میں لگا رہتا ہے ؎

اس کو ہو آدم تلاشی کی تلاش اور تجھے دن رات ہو فکرِ معاش

آگے چل کر کہا ہے کہ جس شاخ پر ثمر آئے گا وہ جھکی ہوئی ہوگی۔ اے انسان تو بھی اسی طرح عاجزی سے زندگی بسر کر۔

نصیحت :۔

پانچ شخص اپنی جان کے دشمن ہوتے ہیں ایک تو وہ جو غرور کرتا ہے دوسرے وہ جو زیادہ کھاتا ہے ؎

تیسرے اہلِ شجاعت روزِ جنگ چاہیے ہو زندگی سے اپنی تنگ

چوتھے ہو جس شاہ کا احمق وزیر دشمنوں کا خود کو وہ سمجھے اسیر

پانچویں جو دوست ہو ناداں سے ہاتھ دھو بیٹھے وہ اپنی جان سے

حکایت مینڈک و موش۔

ایک چوہا ایک مینڈک کا دوست تھا۔ مینڈک نے ایک دن چوہے سے کہا کہ جب مَیں تیرے بِل پر آتا ہوں تو تجھے پکارنا پڑتا ہے لیکن تجھ تک آواز نہیں پہنچتی۔ چوہا بِل سے ایک دھاگا نکال کر لایا اور کہا کہ اسے اپنے پاؤں میں باندھ لے اور مَیں ایک سرا اس کا اپنی گردن میں باندھے لیتا ہوں۔ اس طرح سے جب تجھے میرے بُلانے کی ضرورت ہو

تو دھاگا ہلا دینا میں باہر آجایا کروں گا۔ اتفاق سے ایک دن چوہا باہر آیا۔ چیل اسے اُٹھا کرلے گئی اور ساتھ اس کے مینڈک بھی لٹکا ہُوا چلا گیا ؎

تو بھی گر دشمن ہی اپنی جان کا　　تو تو رنگین دوست ہو نادان کا

نصیحت۔

جو شخص چار باتیں جان کر کرتا ہی اسے چار چیزوں کا انتظار کرنا پڑتا ہی :-

(۱) جو اپنے دوست کو نادان جانے گا وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

(۲) جو عاجزوں پر ظلم کرے گا یقیناً وہ تھوڑے ہی دنوں میں مرجائے گا۔

(۳) جس کو کھانے کا خیال نہ ہوگا یعنی زیادہ کھائے گا جلد ہی بیماری سے ہلکان ہو جائے گا۔

(۴) جو فاحشہ رنڈی کا یار بنے گا وہ ذلیل و رُسوا ہوگا۔

حکایت شخصے کہ دو زن داشت۔

ایک شخص کی دو بیبیاں تھیں ایک بڑھیا اور دوسری جوان۔ یہ شخص باری باری ہر ایک کے پاس رہتا تھا۔ بوڑھی عورت اپنے خاوند کی داڑھی کے سیاہ بالوں کو سوتے میں قینچی سے کتر دیا کرتی تھی اس لیے کہ جوان بیوی اس کو بوڑھا سمجھ کر نفرت کرنے لگے اور یہ شخص میرا ہی ہو جائے اور دوسری جوان یہ کرتی کہ جتنے بال داڑھی میں سفید تھے رات کو سوتے وقت سب موچنے سے نکال ڈالتی اور یہ خیال کرتی کہ جب اس کے سفید بال نہ رہیں گے تو میرے ہی پاس رہے گا

اور بڑھیا کے پاس جاتے ہوئے شرمائے گا۔ اس طرح سے دونوں عورتوں نے شوہر کی داڑھی ختم کردی۔ اس کہانی سے ثابت کیا ہے کہ ایک طرف ہو جاؤ دُنیا ہی حاصل کرلو یا دین ہی۔ اگر دونوں طرف رہے تو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ مثنوی کا شعر مثال کے طور پر دیا ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　　ایں خیال است و محال است و جنوں

حکایت دو آہو و مادۂ شغال (گیدڑی)

ایک جنگل میں دو ہرن لڑ رہے تھے کوئی کسی کو ہٹا نہ سکتا تھا اور دونوں خوب زخمی ہو گئے تھے۔ اتّفاق سے ایک گیدڑی وہاں آنکلی، اور ان کے پاس کھڑی ہو گئی اور ان کے لہو کو چاٹنا شروع کر دیا چناں چہ اس کے پیٹ میں کسی کا سینگ لگا اور مرگئی ؎

پاؤں اپنا جو رکھے حد سے بروں　　　حال اس کا ہوئے ای رنگیںؔ زبوں

حکایت باز و کبک

نیپال کا رہنے والا ایک باز تھا اس نے ایک کبک کو یار بنا لیا تھا، ان میں خوب محبت ہو گئی تھی۔ اتّفاق سے باز بیمار ہو گیا اور اس قدر کمزور کہ چل پھر بھی نہ سکتا تھا اور خوراک بھی حاصل نہ کر سکتا تھا ؎

عہد و پیماں کو نہ لایا دھیان میں　　　کھا گیا وہ کبک کو ایک آن میں
پیٹ کی خاطر ہے رنگیںؔ سب یہ درد　　　دُور کر فکر اس کی رہ دنیا سے فرد
پیٹ کی خاطر کسی کو مت ستا　　　بارہا ئیں نے دیا تجھ کو جتا

حق سے اپنے کر طلب روزی حلال ۔۔۔ تا تجھے دے روز و شب روزی حلال
شیر کے مانند ہو اکاہ[1] بھی ۔۔۔ کھا نہ تنہا کچھ کھلا بندہ بھی

حکایت شیر و پاڑہ

ایک پاڑھے نے ایک شیر سے پوچھا کہ تو بیل کو کیوں شکار کرتا ہے جب کہ تو پورے کو کھا نہیں سکتا، تجھے تو اپنی خوراک کی مقدار ہی شکار کرنا چاہیے۔ شیر نے جواب دیا ؎

پیٹ اپنا پالتے ہیں نابکار ۔۔۔ یعنی نامردوں کا ہے گا یہ شعار

جو ذی شعور ہیں وہ کچھ آپ کھاتے ہیں اور کچھ دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرو مساکین اور غربا کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ صرف اپنا پیٹ ہی نہ پالو ؛

حکایت میموں ہائے بسیار۔

ایک جنگل میں بے شمار بندر تھے۔ وہاں سے ایک شخص کا گزر ہوا۔ اسے بھوک لگی تو اس نے نمک مرچ والے چنے نکال کر کھانے شروع کر دیے۔ بندروں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور مختلف طریقوں سے اسے تکلیف دینا شروع کی یعنی کوئی بندر کنکری اس پر پھینکتا تھا کوئی خاک اڑاتا تھا اور کوئی غراتا تھا۔ یہ بندر سب کچھ اپنے پیٹ کی خاطر کر رہے تھے۔ چناں چہ شاعر کہتا ؎

تو بھی اے رنگین یونہیں ہر صبح و شام ۔۔۔ پیٹ کی خاطر ہی کرتا ہے کام

---

[1] اکاہ: اکیلا، یکتا، بہادر

کودتا پھرتا ہی ناحق گھر بہ گھر　　سوجھتا مطلق نہیں نفع و ضرر

حکایت آقا و غلام۔

ایک شخص نے ایک غلام خریدا۔ اس شخص نے نام پوچھا تو جواب دیا کہ جو بھی تو رکھ دے۔ پھر کھانے کے متعلق پوچھا تو جواب دیا جو بھی کھلائے گا کھا لوں گا۔ پوشاک کے متعلق پوچھا تو جواب دیا کہ جیسا پہنائے گا پہن لوں گا۔ پھر کام کے متعلق کہا کہ تو کیا چاہتا ہی اس نے کہا جو کرواؤگے کروں گا ؎

چاہیے بندہ گنے جو آپ کو　　اس کو لازم ہی کہ وہ مالک نہ ہو

حکایت مادہ شتر و بچہ

اونٹنی نے اپنے بچّے سے کہا کہ تو بے شک مجھ سے بھٹک گیا تھا کیوں کہ میں دوسرے کے قبضے میں تھی اس لیے اپنا رستہ چھوڑ نہ سکتی تھی۔ ہاں خیال میرا تیری ہی طرف تھا۔ چناں چہ شاعر کہتا ہی ؎

گو نہیں رنگیں ترا کچھ اختیار　　ایک رہ تو رات اور دن ہوشیار

یعنی انسان کو رات اور دن ہوشیاری سے دین و دنیا کے کام کرنے چاہییں۔

حکایت سہ مرد حاسد و بادشاہ

ایک شہر میں تین حاسد مشہور تھے۔ بادشاہ نے انھیں بلوایا اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ پوچھا۔ ایک نے کہا میرا دل نہیں چاہتا ہی کہ مجھ سے

کسی کو کوئی فائدہ پہنچے۔ دُوسرے نے کہا کہ میں تو اسے بھی پسند نہیں کرتا
کہ کوئی کسی کو فائدہ پہنچائے۔ تیسرے نے بھی اسی طرح کا جواب دیا۔ چنانچہ
بادشاہ نے تینوں کو مروا دیا تاکہ دُوسروں کو عبرت ہو ؎

ہے حسد جو تجھ کو اے رنگیںؔ کمال — اس کو اپنے دل سے تو دھو کر نکال
ورنہ خالق کے پھنسے گا قہر میں — ہوگا رُسوا گھر بہ گھر سب شہر میں

حکایت دو مصاحب و بادشاہ۔

ایک بادشاہ کے مصاحب اس کے دو غلام تھے۔ ایک غلام نے
دُوسرے کو حسد کی بنا پر مار ڈالا۔ شاہ نے بُلا کر کہا کہ تُو نے اس غلام
کو زہر دے کر میرا عیش آدھا کر دیا اب میں تجھے مروائے دیتا ہوں
اس نے کہا کہ اے بادشاہ اگر میں مارا گیا تو یہ آدھا عیش بھی جاتا رہے گا
بادشاہ نے یہ بات سُن کر اسے بخش دیا۔ مطلب یہ کہ جو گناہ ہُوا سو ہُوا
آئندہ بقیّۂ عمر میں انسان کو خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یعنی اپنے
آدھے عیش کو کیوں گنوایا جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ بڑھاپے میں تمام
اعضا بیکار ہو جاتے ہیں اس لیے جوانی ہی میں انسان کچھ نہ کچھ کرے ؎

یاد ہے مجھ کو جوانی کا مزا — اب کہاں وہ زندگانی کا مزا
کیوں جوانی کا نہ ہووے مجھ کو غم — عیش سے مایوس ہوں اب دم بدم

داستانوں کے آخر میں رنگینؔ اپنے بیٹے اختر یار خاں کو دس نصیحتیں
کرتے ہیں ؎

اے میرے فرزند اختر یار خاں — دس نصیحت تجھ کو کرتا ہوں عیاں
ایک تو ڈریو خدا سے روز و شب — تا درستی دین کی تیرے ہو سب

دوسرے خُلق اپنا پیشہ کیجیو — خُلق کر کر نیک نامی کیجیو
تیسرے جتنی ہیں مخلوقِ خدا — جانیو تو سب سے اپنے کو بُرا
چوتھے اس "ایجادِ رنگیں" کو مدام — وردمیں تو اپنے رکھیو صبح و شام
پانچویں آئیں پہ رہنا مستقیم — تاکہ راضی تجھ سے ہو تیرا کریم
صحبتِ بد سے چھٹے کیجو حذر — بلکہ اس کوچے سے مت کیجو گزر
ساتویں اپنا ادب کرنا شعار — تا تیرا خلقت میں ہو عزّ و وقار
آٹھویں یہ پند میری مانیو — مَوت کو نزدیک دایم جانیو
اور نویں ڈریو عذاب قبر سے — رہیو مت ایمن زمیں کے جبر سے
دسویں مجھ کو فاتحہ سے کیجو یاد — تاکہ میری روح ہووے تجھ سے شاد

ان نصائح کے بعد لکھتے ہیں ؎

مَیں نے جیتے جی کیے لاکھوں گناہ — جان کر اپنا کیا نامہ سیاہ
تو کہیں چلنا نہ میری راہ پر — رکھیو ایماں اپنے بس اللہ پر

اس مثنوی میں کوئی فنّی خوبی نہیں ہے اور ظاہر ہے اس قسم کی مثنویوں میں شاعر کا اصلی مقصد کمالِ شاعری دِکھانے کے بجائے اخلاقی تعلیم و تلقین ہوتا ہے۔ مثنوی کی زبان صاف اور سادہ ہے اس کا یہ پہلو البتّہ قابلِ غور ہے کہ جب ہم رنگینؔ کے دیوان ریختہ، دیوانِ انگیختہ، دیوانِ بیختہ اور نثر میں ان کے لکھے ہوئے فواحش کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ جو شخص ایسی مثنوی لکھ سکتا ہو جیسی "ایجادِ رنگینؔ" ہے وہ اس قسم کی فحش گوئی پر کس طرح اُتر سکتا ہے۔ اس کا بہ ظاہر صرف ایک

سبب معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی کبھی کبھی انسانوں کو مذہب کی طرف بھی لے جاتی ہے اور وہ اپنی بیماریوں کا علاج اس طرح کی اخلاقی تعلیم سے کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے ماحول میں ایسے عناصر زیادہ ہیں جنھیں صحت مند نہیں کہا جاسکتا اور جو شاعروں اور ادیبوں کو نفس پرستی اور اسفل جذبات کے اظہار پر آمادہ کرتے ہیں۔ رنگین نے اپنے ماحول کا جو اثر قبول کیا وہ ان کی ذات سے مخصوص نہیں۔ علاوہ رنگین کے دیگر معاصرین کے اس زمانے میں میر جعفر زٹلی بھی موجود تھے جنھیں ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ جعفر کی کلیات میں جس قسم کے فحش اشعار اور فحش نثر موجود ہے رنگین کا کلام اس کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات دل چسپ ہے کہ رنگین نے ۱۲۲۰ھ میں ہزل کی باقاعدہ مشق شروع کی چناں چہ کہتے ہیں۔

[1] "بہ حسب تقدیر در ہماں سال [52] سفر کلکتہ روئیں بنیاد مع میر افضل علی خاں نیاز افتاد۔ او شاں گاہ گاہے برائے تفنن طبع مشق ہزل کہ اکثر قدما ہم کردہ اند می فرسودند و نیاز مند را نیز مجوز می بودند پس برائے خاطر او شاں بندہ ہم اشعار ہزل می گفت و دُرہائے بے ہودہ می سُفت بحدّے کہ صورت دیوان سویم۔ کہ موسوم" بہ دیوان آمیختہ" است ورزید و مقبول خاطر ظریفاں گردید۔"

یہ زمانہ جعفر کی وفات سے صرف پانچ سال پہلے کا ہے۔ اس ماحول میں رنگین کے قلم سے ایسی اخلاقی مثنوی بھی خلاف توقع ہے اور اسے اس زمانے کے عام مذاق یا کسی خاص رجحان کا علم بردار نہیں کہہ سکتے۔

رنگین کی طبیعت کا یہ تضاد اس مجموعے کی دو اور مثنویوں سے ظاہر

---

[1] دیباچہ دیوان ریختہ [52] ۱۲۳۰ھ

ہوتا ہے ان دو مثنویوں کے مجموعے کا نام رنگین "عجائب[1] و غرائب رنگین" بتاتے ہیں اور مقصدِ تصنیف میں لکھتے ہیں کہ وہ دو ایسی مثنویاں لکھنا چاہتے ہیں جن میں سے ایک میں ظرافت اور دوسری میں تصوّف ہو دونوں مثنویوں میں پانچ پانچ سو اشعار ہوں لیکن جسے رنگین ظرافت کہتے ہیں وہ بہ قول انھیں کے شیطان کے کنارے ہیں۔ رنگین کا بیان یہ ہے

بعد[2] حمدِ حضرتِ ربّ الودود — بھیجتا ہوں میں پیمبر پر درود
اور اس کی آل اور اصحاب پر — بلکہ ان اصحاب کے احباب پر
پھر میں اس کے بعد تجھ سے اے کریم — عرض یہ کرتا ہوں اے میرے رحیم
تجھ سے یہ مانگوں ہوں مجھ کو کر عطا — یک قلم کر عفو میری سب خطا
اور یہ گویا کر مرے منہ میں زباں — رشک کھا دیں جس پہ سب پیر و جواں
تاکہ اپنے مدّعا پر آؤں میں — توسنِ خامہ کو ٹھکرا جاؤں میں
اور کروں میں نظم نسخے ایک دو — پر ہر ایک تصنیف وہ اس طرح ہو
ضد ہم دیگر ہوں یہ منظور ہے — تجھ سے ہے نزدیک مجھ سے دور ہے
بحر ہے ہر ایک کی لیکن جدا — پر لکھے جاویں وہ دونوں ایک جا
یہ ظرافت سے کرے جلوہ گری — دوسری ہوئے تصوّف سے بھری
جو پڑھے اس کو ہنسے وہ بار بار — جو پڑھے اُس کو وہ روئے زار زار
پہلے نسخے کا "عجائب" نام ہو — اور ثانی کا "غرائب" نام ہو
شعر ان دونوں کے پورے ہوں ہزار — نصف اس کے اور نصف اس کے ہوویں یار
پر ہر اک کے بعد ہو تیرا بھی نام — عرض یہ کرتا ہوں میں رنگیں غلام
چاہتا ہوں ایسے نسخے دو کہوں — کہہ کے ان دونوں کو میں چپ ہو رہوں

---

[1] دوسرا نام مثنوی 'مثناء رنگین' ہے اور یہ 'شش جہت رنگیں' کا دوسرا حصہ ہے۔
[2] انتخاب از 'عجائبِ رنگیں' یعنی حصہ اول 'مثناء رنگیں'۔

پھر اٹھاؤں شعر کے کہنے سے ہاتھ اور لگاؤں دھیان اپنا تیرے ساتھ
نسخۂ اوّل یہ ہے اے صاحبو نام اس کا ہے "عجائب" سن رکھو
سب ظرافت کی حکایات اس میں ہیں۔ سارے شیطاں کے کنایات اس میں ہیں
ہنسنے کی خاطر کیا اس کو بیاں ورنہ تھا دھیان اس طرف میرا کہاں

اس میں ۳۲ حکایات ہیں اور ہر حکایت میں رنڈیوں، کسبیوں اور بدافعال لوگوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ممکن ہے رنگین کے زمانے میں ایسی کہانیوں کو ظرافت میں شامل کیا جاتا ہو کیوں کہ ان کے بعد بھی واجد علی شاہ نے اپنی مشہور تصنیف "بنی" میں اس قسم کی فحش حکایتیں اور نقلیں لکھی ہیں لیکن ان بتیس حکایات میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے ؛

غرائبِ رنگیں

عجائب وغرائب' کا دُوسرا نسخہ جو' غرائبِ رنگین' کے نام سے موسوم ہے اور جس میں رنگین کے بہ قول پانچ سو اشعار ہیں یہ ان کی سابق الذکر مثنوی ' ایجاد رنگین' کی طرح چھوٹی چھوٹی اخلاقی مثنویوں پر مشتمل ہے ان کا موضوع صوفیانہ خیالات ہیں۔ چناں چہ حمد میں لکھتے ہیں ؎

تصوّف میں غرائب ہو وہ مشہور ترے رنگیں کو ہے یہ بات منظور

اس میں عشقِ حقیقی کی تلقین، ظاہر و باطن کی یکسانیت، اطاعتِ حق، ترکِ دنیا، تزکیۂ نفس، کسبِ حلال، دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری عبادت و ریاضت وغیرہ کے موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن کی تعداد ۳۲ ہے۔ ان میں سے بعض کہانیاں یہ ہیں :۔

حکایت پیر زال کہ در گدائی مردہ بود

ایک بڑھیا بے حد کم زور تھی اس کی غذا اس کا لعابِ دہن ہی تھا۔ شہر میں گدائی کیا کرتی تھی۔ ایک دن مرگئی تو لوگوں نے دفن کر دیا۔ قبر میں فرشتے مہیب شکل میں آئے اور بڑھیا سے کہا کہ تو مدت کے بعد یہاں آئی ہے بتا دُنیا سے کیا تحفہ لائی ہے اس نے کہا کہ میں تحفہ کیا لاتی جس کے پاس میں مانگنے جاتی تھی وہی کہتا تھا کہ آگے بڑھ اور خدا سے

مانگ اب میں یہاں آئی تو تم اُلٹا مجھ سے مانگتے ہو حالاں کہ مجھے کچھ دینا چاہیے تھا۔

حکایت جواب و سوال درخت و سایہ۔

سایے نے ایک نخل سے کہا کہ تجھے میرا ذرا خیال نہیں۔ میرا سر ہمیشہ سے تیرے پیروں پر رہا ہی تو اس بات کا غرور نہ کر کہ تیرا سر آسمان سے جا ملا ہی مجھے بھی دیکھ کہ میں خاک پر ہوں پھر بھی تیرا دھیان ہر وقت رہتا ہی۔ اب تو مجھے کبھی کبھی سورج کو تو دیکھنے دیا کر جب درخت نے یہ بات سایے سے سُنی تو کانپ کر کہا کہ تجھے اپنا قصور معلوم نہیں کہ تو مستوں کی طرح پڑا رہتا ہی۔ بہ ظاہر تو اپنے کو پست سمجھتا ہی لیکن حقیقت میں تیرے باطن میں مستی ہی جبکہ ظاہر و باطن ایک نہیں تو خورشید کا چہرہ بھلا کیسے دیکھ سکتا ہی۔ درخت نے کہا کہ میں عاجزوں کی طرح سے رات دن ایک ہی پاؤں پر کھڑا رہتا ہوں۔ میں بے ادب نہیں ہوں۔ اگرچہ سر آسمان پر ہی لیکن دھیان زمین پر ہی ہی۔ مجھے جو پتھر مارتے ہیں میں انھیں پھل دیتا ہوں۔ ای سایے! تو تو کسی کے پاس ایک دم کے لیے بھی نہیں ٹھیرتا کبھی کہیں کبھی کہیں۔ تیرے اندر تو بالکل بھی خُلق نہیں بھلا تو کیسے خورشید کا چہرہ دیکھ سکتا ہی یہ باتیں سُن کر سایہ منفعل ہُوا۔

حکایت دزد و زاہد۔

ایک زاہد کے گھر میں ایک چور داخل ہوا۔ بہت سی تلاش کے بعد بھی اسے کچھ نہ مِلا۔ زاہد بیدار تھا اس نے کہا مجھے بے حد افسوس ہی کہ تو خالی ہاتھ جا رہا ہی۔ چور نے کہا تو میرا غم نہ کر بلکہ تو اس گھر کو چھوڑ دے تجھے بھی

اس گھر سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ زاہد نے کہا کہ میں منادی کرا دوں گا کہ چور زاہد کا ہادی بنا ہے۔

حکایت مرد بزرگ کہ درراہ می رفت۔

ایک بزرگ رستے میں چنے بھنوا بھنوا کے کھاتا جاتا تھا اور اپنے سفر کو طے کرتا جاتا تھا۔ رستے میں ایک بڑا پتھر پڑا دیکھا۔ ایک آواز آئی کہ اس پتھر کو اُٹھا کر کھا جا۔ یہ ندا سُن کر وہ پتھر کے پاس گیا پتھر اس کو چھوٹا نظر آیا جب اس نے اسے اُٹھایا تو وہ چنے کے برابر تھا اور کھایا تو مختلف مزے پائے۔ پھر ندا آئی کہ میرا احسان مان یہ پتھر نہ تھا بلکہ تیرا غصہ تھا اس کو کھانے کا تیرا ارادہ نہ تھا۔

حکایت حضرت شبلی و زنِ پارسا درخانہ کعبہ۔

ایک مرتبہ شبلی کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ایک عورت کو سر کھلے پھرتے دیکھ کر کہا کہ عورت تجھے شرم نہیں آتی۔ اس نے جواب دیا کہ شبلی شرم کیوں آئے جبکہ یہاں مرد ہی نہیں ہے۔ شبلی نے کہا کہ میں جو مرد ہوں۔ عورت نے کہا کہ تو تو رنڈی سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ تیری نظر کعبہ میں مجھ پر پڑی اور میری نظر تجھ پر نہ پڑی اس لیے تو اپنے آپ کو مرد نہ سمجھ۔

حکایت مرد تاجر شہر حلب۔

حلب کا ایک سوداگر جب مرنے لگا تو قضا ایک آدمی کی شکل میں آئی اور اس تاجر سے کہا کہ میں موت ہوں اب تیرا وقت آگیا ہے۔ تاجر نے

موت سے کہا کہ ایک لاکھ دینار لے کر ایک سال کے لیے چھوڑ دے۔ موت نہ مانی تو دو لاکھ کر دیے۔ موت نے کہا کہ یہاں رشوت کا کام نہیں ہے۔ تاجر نے کہا کہ مجھے کچھ دیر اور زندہ رہنے دے تاکہ میں وصیت کر لوں۔ موت نے کہا کہ ابھی تیرے دم کچھ اور باقی ہیں کچھ تحریر کر لے۔

حکایت ہیر در غم رانجھ۔

ہیر کو رانجھا کا بے حد غم تھا رات دن روتی تھی۔ اتفاقاً ایک دن رانجھا کی یاد میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ رستے میں ایک گندھی دین دار نماز عصر پڑھ رہا تھا وہ اس کے سامنے سے نکلی گندی اس کے پیچھے پڑ گیا کہ تو نے آگے سے نکل کر میری نماز کھو دی۔ ہیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ میں ایک شخص پر عاشق تھی تو مجھے مطلق دکھائی نہیں دیا لیکن اب تو ہی بتا کہ مجھے تو کسی کے عشق میں تو نظر آیا نہیں لیکن میں تجھے نظر آگئی تیرا یہ عشق خدا سے کیسا ہے۔

حکایت مرد کوفی صوفی و حسن نوری رحمۃ اللہ علیہ۔

ایک مرد کوفی بہت ہی متقی تھا وہ زبانِ وحش سے واقف تھا ایک دن حسن نوری سے ملنے روانہ ہوا اس نے ایک بلی کو کہتے سنا ؎

کہ ہے افسوس دنیا ہے یہ فانی گرے کوئی کہاں تک زندگانی

بلی نے یہ بھی کہا کہ خواجہ حسن بھی ایک رات ہی کا مہمان ہے۔ یہ بات سن کر حسن نوری مغموم ہو گئے اور دل میں کہا کہ اب وہاں جانے سے کیا فائدہ پھر دل نے کہا کہ چلو فاتحہ پڑھ کر ہی واپس آجانا جب مرد کوفی وہاں پہنچا

تو حسن نوری زندہ تھے۔ حسن نوری نے کہا کہ تم حیران مت ہو جو کچھ بلّی نے کہا تھا صحیح تھا کیوں کہ مَیں اپنے حق سے غافل ہو گیا تھا اس لیے فرشتوں میں شور مچ گیا کہ حسن نوری شاید آج فوت ہو گیا۔ بلّی نے بھی انھیں سے سُنا تھا۔

حکایت مرد زاہد کہ سوائے کمبل اسباب نداشت

مردِ زاہد کو جب موت آئی تو یہ کمبل بھی پھینک دیا کہ اسے دنیا کی اب کچھ پروا نہ تھی ؎

وہ کامل ہیں یہ ہم کو یقیں ہے　　تعلّق جن کو دُنیا سے نہیں ہے

حکایت حاتم طائی کہ ارادۂ سفر داشت

حاتم طائی جب سفر کے لیے تیار ہُوا تو بیوی سے کہا کہ تو جو کچھ کہے مَیں تیرے واسطے لے آؤں تاکہ تجھے میرے پیچھے کسی چیز کی تکلیف نہ ہو بیوی نے کہا ؎

مجھے دے جاؤ جتنے دن کا جینا　　دلا دو اتنے دن کا کھانا پینا

حاتم نے کہا زیست میرے اختیار میں نہیں۔ بیوی نے کہا کہ جو زیست کا ذمّہ دار ہے کیا وہ روزی مجھے نہ دے گا۔ تب حاتم نے کہا کہ تیری ہمت تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ رنگین کہتے ہیں کہ اس دُنیا پہ شیدا ہونا عقلمندی نہیں یہ دنیا وفا نہیں کرے گی۔

جو شخص اس سے دِل لگا کر خوش ہوتا ہے وہ اپنے دین کے گھر کو برباد کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

مثل یہ ایک پنجابی کی بھائی مجھے یہاں برمحل ہی یاد آئی
کرے گر عدل تو سانو وہ لٹے کرے گر فضل تو نرمول چھٹے

مثنوی کا خاتمہ ان دعائیہ اشعار پر ہوتا ہی ؎

ولے تو رحم کی مجھ پر نظر کر مجھے دنیا میں تو مت در بدر کر
میری ہو جس قدر یہ آل و اولاد رکھ اُس کو تو جہاں میں خورم[1] و شاد
عطا ایسی ہی کر پھر تندرستی کہ مطلق جینے دم تک ہو نہ سستی
پھر استغنا کا میرے سر پہ رکھ تاج کسی کا مجھ کو ہرگز کر نہ محتاج
میرا پھر وقت جب آ پہنچے نزدیک رکھ ایماں کو میرے اور دیں کو ٹھیک
نہ ہووے جاں کنی پھر مجھ پہ دشوار عذاب قبر پھر ہوئے نہ زنہار

آخر میں شاعر التجا کرتا ہی ؎

دُعا کو میری ای خالق اثر دے اجابت کے دعا کو میری پَر دے
'دعزائب' کو کروں تا ختم میں اب کہ شعراب ہو چکے ہیں پانچ سو سب

اسی طرز کی دُعا میر حسن نے بھی خدا سے مانگی ہی جو 'مثنوی میر حسن' میں موجود ہی۔

یہ مثنوی بھی صرف اخلاقی مثنوی کی حیثیت سے اہم ہی اس میں اسی قسم کے صوفیانہ خیالات ہیں جو میر و مرزا کے دَور میں شاعری میں عام طور پر داخل ہو گئے تھے اور جن کا مقصد اس عہد کی سیاسی اور سماجی حالت کا نقشہ پیش کرنا ہی۔ بعض لوگ اس قسم کی شاعری کو فرار کی ذہنیت کا ترجمان

---

[1] خرم

کہتے ہیں۔ ایسے ناقدین کے بہ قول اس دور کے شاعروں میں قوتِ عمل نہیں رہی تھی اس لیے جدّ وجہد کی تعلیم کے بجائے وہ ترکِ دُنیا کی تلقین کرتے تھے۔ یہ تلقین صرف شعراء تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس عہد کے صوفیا نے ترکِ دُنیا کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ یہ اعتراض کسی قدر درست ہے لیکن اس صوفیانہ تعلیم کا ایک پہلو جو تزکیۂ نفس اور اخلاقی اصلاح سے متعلق ہے نہایت اہم ہے۔ اس دور میں اخلاقی پستی جس حد تک پہنچ گئی تھی اس کا اندازہ شعراء کی ہجویات سے بہ خوبی ہوتا ہے۔ ان حالات میں ایسی شاعری اخلاقی اصلاح کا ایک جذبہ ظاہر کرتی ہے۔ ممکن ہے اس کا اثر اس وقت زیادہ نہ ہوا ہو لیکن اس سے ایک رجحان کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

اس مجموعے کے بعد 'مثلثِ رنگین' شروع ہوتی ہے جس کا پہلا حصّہ 'شہر آشوبِ رنگین' کے نام سے موسوم ہے اور دو سو اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کے آغاز میں رنگینؔ خود لکھتے ہیں ؎

بسم اللہ کو پہلے لکھ کر — لکھ اے رنگیں نعت پیمبرؐ
پھر لکھ مدح چہار خلیفہ — تھے جو نبی کے یار خلیفہ
لکھ کے مناقب آل نبی کا — بن تو محب اولادِ علیؓ کا
پھر آگے خاموش نہ رہنا — مثنویاں ایک تین تو کہنا
ڈول ان کا پر کچھ ایسا ہو — ایک سے ایک کا طرز جدا ہو
اسم بھی ہاتھ آیا تیرے ڈھب کا — نام "مثلث" ہو ان سب کا
تینوں وہ ایک ہی جگہ لکھی جائیں — جو انھیں دیکھے اس کو وہ بھائیں
چھوٹ سے ان کے شعر ہوں بھائی — خواہش سب تجھے دل کی بتائی
شعر ہوں ان تینوں کے برابر — گھٹ بڑھ ان میں نہ ہوئیں مقرر

ہاتھ میں اپنے لے کے قلم اب مثنوی میں کرتا ہوں رقم اب

شہر آشوب کا رواج فارسی اور اُردو شاعری میں پہلے سے موجود تھا
چناں چہ امیر خسرو کے کلام میں شہر آشوب کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔
اس قسم کی نظمیں مختلف پیشہ وروں کے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ امیر خسرو کے
شہر آشوبوں کا نمونہ یہ ہے ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑیے، سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا، نہ کچھ سنوارا

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے از دست و زباں چرب او واویلے
خلطے بہ لبش دیدم و گفتم کہ دل است گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

یہ ترجمہ ہے " ان تلوں میں تیل نہیں " کا، ہندستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں
دودھ دہی لے کر گلی گلی آواز لگاتی پھرتی ہیں " لیئو دہی، لیئو دہی "
امیر کے زمانے میں بھی یہی رواج تھا چناں چہ فرماتے ہیں ؎

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد ہر گاہ بہ گوئی کہ " دہی لیئو دہی "

سودا نے بھی شہر آشوب لکھا ہے جس میں اپنے زمانے کے مختلف
پیشہ وروں کی تباہ حالی کا ذکر کیا ہے اس کا نمونہ یہ ہے ؎[1]

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے
گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب اس کی تو اذیت ہے، بڑی آفت جاں ہے
وہ جلکے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے

---

[1] کلیات سودا، صفحہ ۱۵۰ مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۸۸۷ء

بے وقت خورش اس کی جو ہو اپنے تئیں گھ سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے

رنگین اپنے شہر آشوب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :

سُنو بیان ایک میرا یارو منصف ہو تو سُن کر رو دو
ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دُنیا میں آئے ہیں جب سے چین نہیں ہے مطلق تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکرِ معیشت نے ہے مارا کیجے کس صورت سے گزارا
ہُوا بہت ساجب مَیں مضطر تب یہ کہا دل سے گھگیا کر
کیوں اے دل کیا مرضی ہے تیری فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
مجھ کو تو یہ بات یقیں ہے کوئی دُنیا میں کسی کا نہیں ہے
چیز بڑی دُنیا میں ہے دولت بِن اس کے ہوتی ہے ذِلّت
کام یہی دُنیا میں ہے آتی اسی لیے سب کو ہے بھاتی
جی سے اس پر ہو کر شیدا کر اس کو اے جان تو پیدا
کھیتی کر یا کر تو تجارت نوکری کر یا باندھ کے ہمّت
بِن آئے باتوں کے اے بھائی کہ دولت تو نے کب پائی
سُن کر دِل نے یوں کہا مجھ کو خاص مَیں کہتا ہوں تجھ کو
ہووے اگر امدادِ الٰہی سب سے ہے بہتر یادِ الٰہی
صبر کی داد خدا ہی دے گا دِل کی مراد خدا ہی دے گا
جو ہے کسب سو ہے واہی ہر یک میں سو سو ہے تباہی
کہہ تو بہ تفصیل اس کا بیاں ہو تا کہ نہاں وہ تجھ پہ عیاں ہو

اس کے بعد بارہ مختلف پیشوں کا ذکر اس ترکیب سے کیا ہے:-

(۱) دربیان کسبِ دہقان۔ (۷) دربیان کسب تجار۔
(۲) دربیان سپاہ گری۔ (۸) دربیان حاجی و طوفِ کعبہ
(۳) دربیان کسب تجارت۔ (۹) دربیان کسب حلوائی۔
(۴) دربیان کسبِ قصاب۔ (۱۰) دربیان کسب بھڑبھونجہ۔
(۵) دربیان کسبِ گازر۔ (۱۱) دربیان کسب عطار۔
(۶) دربیان کسب باغ بان۔ (۱۲) دربیان سیّاحی۔

داستانوں کا نمونہ یہ ہے:-

دربیان کسب دہقان۔

کسان کی طرف مخاطب ہو کے کہتے ہیں کہ کاشت میں خونِ دل کھانا ہوتا ہے ؎

چاہیے پہلے بنجر توڑے بیل ہلوں میں ستھرے جوڑے
کرے شعور سے پھر تو بُوائی اس کے بعد کرے تو نلائی

یہ تو ترکیب بونے کی بتائی ہے اور مثال پیش کرکے توجہ دوسرے جہان کی طرف مبذول کرائی ہے ؎

بووے اگر اس راہ میں ایک جو کاٹے تو ایک ایک کے سو سو
تو تو یہاں کرتا ہی نہیں کچھ وہاں کے لیے دھرتا ہی نہیں کچھ
یوں ہاتھ نہیں کچھ آتا بنے گا یہاں سے خالی جانا
تو ہی بتا اے مردِ غافل بن بوئے کیا ہووے حاصل

جس طرح سے بغیر محنت کے کسان کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح جب تک انسان دین کے لیے تکلیف نہ اُٹھائے گا اسے دوسری دنیا میں کچھ نہ ملے گا

در بیان سپاہ گری۔

سپاہی اگر کہیں نوکری چاہتا ہو تو گھوڑا خریدے اور کسی لشکر میں ملازمت کرکے لڑے۔ گھوڑا خرچ کر کے خریدے گا لیکن ملے گا کچھ نہیں سوائے جان جوکھوں کے۔ دشمن سے ہمیشہ ڈرنا ہی چاہیے۔ تو لوٹ کا مال کھاتا ہو۔ اگر بچ گیا تو گھر کو واپس آگیا۔

آگے چل کر شاعر کہتا ہو کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہو کہ اپنے نفس سے لڑتا رہے ؎

اپنے نفس شوم سے لڑ تو اسی سے دن و رات جھگڑ تو

اگر تو اس پر ہووے غالب شاہ و گدا ہوں تیرے طالب

در بیان کسبِ تجارت

گر ہو تجارت کی ہی خواہش تو تو بہت اس میں ہو کاہش

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ پہلے دولت لگاؤ اور رات دن محنت کرو اور دنیا کی خاک چھانتے پھرو جیسا شخص ہو ویسی ہی اس سے باتیں کرو ؎

جھوٹ ہمیشہ سب سے بولے چاہیے سب بن جھوٹ نہ کھولے

جھوٹا کبھی نہ جھوٹا ہووے جھوٹے کے آگے سچا روے

عاقل جھوٹ بولنے کی تکلیف نہیں اٹھاتے اس لیے تو بھی ؎

اس سے تو اک مردِ واہی کر دن رات تو یادِ الٰہی

ایسی تجارت کس کو بھاوے ایک ایک دے اور دس دس پاوے

یہاں کوئی کام نہیں آنے کا کریے تردد کچھ جانے کا

پھر فرماتے ہیں کہ سفر لمبا ہو کچھ توشہ تیار کر لینا چاہیے اپنے گھر کچھ نہ کچھ

اس سفر کے لیے کرتا رہ۔

گھوڑا، ٹٹو، بکری، ہاتھی کوئی نہیں ہی تیرا ساتھی

اس کے بعد کہتے ہیں کہ تجھے کسی چیز پہ مغرور نہ ہونا چاہیے۔ دوست بھی ساتھ نہیں دے گا یہ بھی دشمن ہی ے

دوست برابر کون ہی دشمن ہر یک دوست تیرا ہی رہ زن

راہِ خدا سے پھیرے ہی تجھ کو اپنے پھندے میں گھیرے ہی تجھ کو

ذکرِ خدا سے باز رکھے ہی اپنے سے ہم راز رکھے ہی

در بیان کسبِ گازر۔

دھوبی کو بھی اپنے پیشے میں سکھ نہیں۔ سب سے پہلے اسے لدو گدھا خریدنا پڑتا ہی۔ پھر کلر میں جا کر اس پر ریہہ لادنا پڑتا ہی۔ پھر گھروں سے کپڑے لا کر ناند کے پاس بیٹھ کر ان پر ریہ ملنا پڑتا ہی۔ پھر بھٹی پر چڑھانے ہوتے ہیں۔ بھٹی سے نکال کر دھونے ہوتے ہیں۔ برسات میں دھونے کا غم ہوتا ہی کیوں کہ پانی گدلا ہوتا ہی۔ گرمی میں گرمی ستاتی ہی اور سردی میں سردی۔ ان سب باتوں سے بہتر یہ ہی کہ ے

اس سے تو اپنے نفس گدھے پر دین کی لادی کو لادا کر

نکل کے تیدِ آب و گِل سے دھو تو بغض و حسد کو دِل سے

شرع کے میدان میں جا کر لا ایمان کی ریہ اُٹھا کر

پھر اس اپنے جامۂ تن کو دھو کلمے کے لگا صابن کو

بغض و حسد سے دُور رہا کر روز و شب مسرور رہا کر

در بیان سیاحی ؎

چاہے اگر کرے سیاحی　　تو کرنی ہو گی ملاحی

دُنیا کا دریا ہی گہرا　　رستے میں سو رہا ہی لہرا

قدم قدم پر اس میں بھنور ہی　　گزرے کیوں کر جائے خطر ہی

کہتے ہیں کہ اس دریا سے کشتی کا گزر جانا اندیشہ ناک ہی ؎

دِل سے تو کلمے کو پڑھ جا　　کشتی میں ایمان کی چڑھ جا

پیر ہی اس کشتی کا مانجھی　　بن جا اپنے پیر کا ساجھی

مطلب یہ کہ اپنے دِل کو صاف رکھنا چاہیے اور ہر وقت مرنے کا خیال دل میں ہونا چاہیے۔ موت کے بعد ہی اس کشتی سے پار اُترا جائے گا موت سے پہلے خوف و رجا کی حالت ہی میں رہنا ہوگا ؎

لیکن پار نہ اُترے جب تک　　خوف و رجا میں رہیو تب تک

یہ مثنوی بھی ان اخلاقی مثنویوں کے تحت میں آتی ہی جن کا پہلے ذِکر کیا جا چکا ہی۔ اس میں بھی رنگینؔ نے شاعری کے فنّی کمالات دکھانے کی کوشش نہیں کی ہی بلکہ سیدھے سادے انداز میں اخلاقی باتیں بیان کی ہیں اور اس قسم کی صوفیانہ تعلیم دی ہی جیسے اُوپر بیان کیا جا چکا ہی۔

'مثلثِ رنگینؔ' کا دُوسرا نسخہ 'داستانِ رنگینؔ'[1] کے عنوان سے دو سو اشعار پر مشتمل ہی۔ مثنوی اِن اشعار سے شروع ہوتی ہی ؎

حمد لکھوں اس اپنے خدا کی　　جس نے بنا کی ارض[2] و سما کی

اس نے انجم کو ہی بنایا　　وہی ہر ایک شئ میں ہی سمایا

اس نے انسان کیا ہی تجھ کو　　دیکھ تو کیا کیا دیا ہی تجھ کو

---

[1] دوسرا نام "کہاوت ہائے رنگیں"　　[2] ق۔ ن عرض

تجھ کو عقل و شعور دیا ہے کیا شکل اور کیا نور دیا ہے

ان اشعار کے بعد انسان کی قوتوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ سب کچھ عطیۂ الٰہی ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ شکرگزار ہو اور دوسرے جہان کے لیے کچھ تیاری کرے۔ اس کے بعد اخلاقی مضامین ہیں جنھیں ضرب الامثال اور کہاوتوں کے ساتھ نظم کیا ہے۔

'مثلثِ رنگین' کا آخری حصہ 'حکایاتِ رنگین' کے عنوان سے ہے۔ مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

حمد کریم کی سب سے پہلے دھو کے زباں کو رنگیں کہہ لے
کیوں کہ وہ خلّاق جہاں کا واقف ہے پنہاں دعیاں کا
سب مخلوق ہیں خالق ہے وہ سب کا دائم رازق ہے وہ
جو شے ہے وہ اس پہ ہے ظاہر سب شے سے وہ خوب ہے ماہر

پھر اس میں چھوٹی چھوٹی حکایات نقل کی ہیں۔ پہلی حکایت مجنوں صیاد اور آہو کی ہے۔ رنگین لکھتے ہیں :۔

ایک صیاد نے اپنے جال میں ایک ہرن کو پھنسایا۔ قیس کو دیکھ کر رقت پیدا ہوئی اس نے صیاد سے کہا کہ یہ تو لیلیٰ کا ہم چشم ہے اسے نہ پکڑ لیلیٰ کے صدقے میں اسے تو چھوڑ دے کیوں کہ اس کی آنکھیں اور قد لیلیٰ جیسی ہیں۔ صیاد کو ان باتوں پر رحم آگیا اس نے ہرن کو چھوڑ دیا سب سے بڑی بیماری دنیا میں عشق ہے جو عشق میں داخل ہو اپنے سے ہاتھ دھو بیٹھے ؎

تجھ کو عشق کی قدر کہاں ہے تو نہیں واں یہ عشق جہاں ہے

ہے اس عشق کا اعلیٰ رتبہ　　سمجھا کون ہے عشق کا رتبہ

بعض دیگر حکایتیں یہ ہیں :-

حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام

موسیٰؑ کی شبانی کے زمانے میں ایک دن بھیڑ کا ایک بچہ گلّے سے بھاگا۔ موسیٰ علیہ السلام پیچھے بھاگے آخر کار اسے پکڑ لیا اور کندھے پر اُٹھا کر لائے ؎

اس کے باعث سُن اے دانا　　ہوا پیغمبر وہ فرزانا

اے انسان تجھے بھی سب کا خیال رکھنا چاہیے اور ظاہر و باطن ایک ہونا چاہیے ؎

ظاہر و باطن کو کر یکساں　　تاکہ نہ دیں کا ہو تیرے نقصاں
دین کے سارے کام کیا کر　　دُنیا کا مت نام رلیا کر
ہاتھ نہیں مطلق یہ آنی　　کھوتا ہے کیوں اپنی جوانی

حکایت مردِ عابد و شخص فاسق و درویش زاہد۔

ایک آدمی کو ایک عابد نے فسق میں مبتلا پایا۔ عابد نے دُعا کی کہ خدا تو اس پر اپنا قہر نازل کرتا کہ یہ اس راہ سے منحرف ہو جائے جب ایک زاہد اس چال سے واقف ہوا تو رو کر کہنے لگا کہ اس سے زیادہ اور خدا کا قہر کیا ہوگا کہ شیطان اس کا ہادی بنا ہوا ہے اور یہ خدا سے رو گرداں ہے اور یہ بھی کہا کہ اہلِ فنا میں مشہور ہے کہ اگر کوئی دریا میں ڈوبتا ہو تو اس کے ہاتھ کو پکڑ لو اور دھکا مت دو ؎

شاید ہو جاوے تیرے ڈھب کا　　ہاتھی[1] کے پاؤں میں پاؤں ہے سب کا

---

[1] ہندی کہاوت۔ یعنی حاکم وقت کے سب مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں۔ سچی کی کمائی میں سب کا ساجھا ہوتا ہے کون جاوے گردش گرد دن گرد ای سے بچل　　پاؤں میں ہاتھی کے سب کا پاؤں ہے یہ مثل

کیا نہ کر تو دل کی خواہش | اس کی تجھ کو ہوگی کاہش
جو کچھ تو اس ہاتھ سے دے گا | وہی تو پھر اس ہاتھ سے لے گا

"چہار چمن رنگین" کے نام سے رنگین نے چھوٹی چھوٹی مثنویوں یا منظوم حکایتوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو "شش جہت رنگین" کا چوتھا حصّہ ہے۔ چہار اور چمن کی رعایت پورے مجموعے میں ملحوظ رکھی گئی ہے چناں چہ حمد کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

ای گلشنِ دوجہاں کے خالق | دے والی وانس وجاں کے رازق
خالق ہے تو ہی کریم ہے تو | قادر ہے تو ہی قدیم ہے تو
مطلب تو ہے تو ہی ہے مقصود | نہاں ہے تو ہی اور تو ہی ہے موجود
ہے تو ہی معاد سے ڈراتا | ہے تو ہی معاش کی سجھاتا

آگے چل کر کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز خدا نے ہی پیدا کی ہے اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے ؎

ہے باغ سو کیا یہ تیری وحدت | ہیں اس میں شجر یہ سارے کثرت
وہ شخص جو تھا رسول تیرا | اس باغ میں تھا وہ پھول تیرا
گلشن کا ترے پھول تھا وہ | بے شک بڑا رسول تھا وہ

یہی رعایت نعت اور مدح اصحاب کے مضامین میں ہے ؎

نام اس کا اگرچہ تھا محمدؐ | ہے ہیم یقین تھا وہ احمد
تھا جسم وہ اس کا رشکِ صد باغ | فردوس ہے جس کے رشک سے داغ
نسرین تھا یا وہ یاسمن تھا | وہ جسم تھا یا کہ وہ چمن تھا
تھا گل کی وہ آب و تاب سے خوب | تھا اس کا عرق گلاب سے خوب

ل دوسرا نام مثنوی "ربع رنگین" ہے۔

اک باغ وہ حق کی سیر کا تھا | دخل اس میں ذرا نہ غیر کا تھا
اور اس کے جو چار تھے وہ اصحاب | سو اس کے تھے یار اور احباب
یا اس میں چہار سرو تھے چار | یا چار تھے نہر چار وہ یار
ہے بارہ دری جو اس کے اندر | سو بارہ امام اس کے ہیں در
ہے اس کی روش یہ شرع کی راہ | فقراء ہیں شجر سب اس میں باللہ
جو جس کا ہے سلسلہ سوائے یار | وہ اس کی ہے شاخ ایک نمودار
اور ان کے مرید ہیں جو بنتے | سو ہیں ان ڈالیوں کے پتے
پھل پھول ہیں ان کے شغل اور ذکر | ہے جس کی انھوں کو رات دن فکر
دم ریزی انھوں کی ہیں یہ ہم لوگ | رس ہیں وہ سارے اور ہم پھوک

مناجات کے بعد سبب تصنیف میں ۶۷ اشعار کہے ہیں اور لکھا ہے کہ تمام لوگ دنیا میں اس لیے نیک کام کرتے ہیں کہ ان کے بعد ان کا نام باقی رہے اس لیے بعض لوگ باغ لگاتے ہیں لیکن ایسے باغ پائے دار نہیں ہوتے ان کی بہار خزاں سے بدل جاتی ہے اور گلشن ویرانے ہو جاتے ہیں ؎

پھر تھوڑے دن میں لوگ آ وہاں | پاتے ہیں نہ باغ اور بستاں
آتا نہیں وہاں نظر کہیں باغ | بلبل کی جگہ پھرے ہے خوش زاغ
پھولوں کی جگہ بچھے ہیں وہاں خار | جنگل ہے نہ گل ہے وہاں نہ گلزار

اس لیے بعض کی خواہش کے بجائے نظم کا باغ لگانا چاہیے ؎

گر باغ ہی کی تجھے ہوس ہے | تو نظم کا باغ تجھ کو بس ہے
کر نظم کا باغ تو وہ تیار | بگڑے نہ خزاں سے جس کے گلزار
دیکھے جو کوئی اس کو آ کے | دے تجھ کو دعا وہ ہاتھ اٹھا کے

کتاب کا نام اشعار کی تعداد اور ترتیب ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

ہو چار چمن جو نام اس کا — خوش کرنا ہو سب کو کام اس کا
میں نے جو کیا شمار بارے — شعر اس کے ہیں ایک ہزار سارے
دروازے وسیع اس کے ہیں چار — ہو ایک سے ایک بہتر ای یار
جس در سے کہ چاہے اس میں تو آ — ہر ایک چمن کی سیر کو جا
اب چار جو اس کے یہ چمن ہیں — ہر ایک میں سرو اور سمن ہیں
پر چاروں میں چار بحر ہیں یار — میں نے تجھے کر دیا خبردار
ہر ایک کا بڑا ہو عرض اور طول — لاکھوں ہی طرح کے سب میں ہیں پھول

آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہر چمن میں چار چار شجر ہیں اور ہر ہر نخل میں مختلف پھل ہیں اور چار چار ڈالیاں ہیں یعنی چار چار حکایات لیکن ڈالیوں (حکایات) میں پتے کم و بیش ہیں ؎

پتے ہیں حکایتوں کے اشعار — یہ بھی رہے دھیان میں تیرے یار
معنی ان کے ہیں پھول اور پھل — مضمون جو بنا ہو سو ہو کونپل
پر وہ جو شجر انھوں میں ہیں چار — تفصیل سُن ان کی مجھ سے ای یار
ہر ایک شجر کا پھل جُدا ہو — کوئی ہو بھلا کوئی بُرا ہو
ہیں ایک میں "معاد" کے پھل — کر لے انھیں دیکھ کر تو آکل
اور ان میں شجر جو دوسرا ہو — وہ صرف "معاش" سے لدا ہو
پھل تیسرے کے جو ہیں آفت — تو ان میں بھری ہو کل "ظرافت"
چوتھا جو ہو بھلا دھواں دھار — ہو اس میں فقط "تصوف" ای یار

"چہار چمن رنگین" میں مختلف مضامین کا یک جا کرنا اس رعایت سے

ہو کہ باغ میں خار اور گل ۔ زاغ و بلبل سب موجود ہوتے ہیں اس لیے بعض مضامین ناپسندیدہ بھی اس میں آ گئے ہیں اور ان کے لیے رنگین معذرت طلب کرتے ہیں ؎

کھٹا کوئی پھل اور کوئی ہے میٹھا | پھیکا ہے کوئی اور کوئی ہے سیٹھا
ہر باغ کا نسق ہے یہی یار | اس بات میں سخت ہوں میں ناچار
اس امر میں جان مجھ کو مجبور | رکھیو تم سب طرح سے معذور
دل میری طرف سے صاف رکھنا | للہ مجھے معاف رکھنا

"چہار چمن رنگین" کا پہلا چمن اس عبارت سے شروع ہوتا ہے۔

چمن اول "چہار چمن رنگین" کہ سوائے فضائے دیگر چہار درخت بار دار کہ ہر یک میوہ جدا و چہار شاخ رسا دار یعنی درخت اول در "معاد" و درخت دوم از "معاش" و درخت سوم از "ظرافت" و درخت چہارم از "تصوف" بار ور است ؎

اب ہیں جو چمن یہ نظم کے چار | ہے بحر جدا ہر ایک کی یار

حکایتوں کا نمونہ یہ ہے :-

حکایت حضرت ذوالنون مصری و شیطان ۔ "در معاد"

حضرت ذوالنون مصری نے کسی جگہ شیطان کو دیکھا کہ شیطان سر خاک پر رکھ کر روتا ہے اور آہ و فغاں کرتا ہے ۔ ذوالنون مصری نے کہا کہ احمق تجھے تو خدا نے معزول کر دیا ہے۔ تیری کوئی بات مقبول نہ ہوگی تو رو کر اپنا وقت ہی ضائع کر رہا ہے ۔ شیطان نے جواب دیا ؎

معزول ہوں میں اگرچہ پُر عیب | ہے وہ تو بحال بے شک و ریب

گو میری نہ بندگی ہو مقبول وہ تو نہیں ہو گیا ہو معزول
شیطان جو معزول ہو چکا تھا وہ بھی بندگی اور معانی میں لگا ہوا
ہو رنگین تو بھی اگرچہ گناہ گار ہو لیکن عبادت کیے جائے
ہر چند گناہ میں ہو تو غرق پر اس کی نہ بندگی میں کر فرق

حکایت شخصے کہ قرض دار شخصے بود۔ در "معاد"

ایک شخص کسی کا قرض دار تھا لیکن قرض کی اسے پروا نہ تھی۔ ایک دن مالکِ قرض نے آکر شور مچایا اس نے کہا کہ شور نہ مچائیں تیرے قرض کی فکر میں ہوں اور ادا ضرور کروں گا۔ اب میں کپاس بونے کی فکر میں ہوں۔ کپاس پیدا ہو گی اس کا سوت کتواؤں گا پھر تھان بنواؤں گا اور ان تھانوں کو گراں قیمت پر فروخت کر کے قرض ادا کروں گا۔ آگے چل کر رنگین کہتے ہیں ؎

رنگین جسے حشر کا نہ ڈر ہو لازم ہو اسے وہ بے خبر ہو
جس شخص سے چاہے قرض لے وہ لے کر مطلق ہی پھر نہ دے وہ
ہو جس کو معاد کی نہ کچھ فکر ان باتوں کا وہ کرے نہ کچھ ذکر

حکایت حاسد احمق۔ در "معاش"

ایک شخص ایک شخص سے حسد کرتا تھا یہ حاسد اس کے مال و گنج کو دیکھ کر جلتا تھا اور اس کے نقصان سے خوش ہوتا تھا ایک دن سوچا کہ شگونِ بد سے اس کو شکست دے۔ چناں چہ اپنی ناک کاٹ کر اس کی رہ گزر میں جا بیٹھا جب اس نے نکلتے کو دیکھا تو کہا کہ یہ ظلم کس نے کیا ؎

بولا وہ کہ کیا کہوں یہ کیا ہو یہ تیرے حسد کا گل کھلا ہو

پھر اس کا ہوا جو کچھ نہ نقصان نکٹا ہوا کاٹ کر پشیمان
اس کا تو برا ہوا نہ کچھ خاک کھو بیٹھا یہ اپنی مفت میں ناک

حکایت جواب و سوال پیر و مرید (در تصوّف)

ایک پیر کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ مجھے مرید بنا لو۔ پیر نے کہا کہ جب مر جاؤں گا تو پھر کس کی صحبت میں رہے گا اس نے جواب دیا کہ پھر حق سے ہی کام ہوگا۔ پیر نے کہا ؎

یعنی تو مجھے ابھی موا جان رکھ اپنے خدا کا رات دن دھیان

حکایتوں میں سے جن کی تعداد سولہ[16] ہے چند حکایتیں[1] جو درخت سوم میں ظرافت کے عنوان سے ہیں، نہایت فحش ہیں آخری چار حکایتیں تصوّف کے متعلق ہیں۔

"چہار چمن رنگین" کا دوسرا چمن یعنی پہلے چمن کی طرح سولہ حکایات پر مشتمل ہے چار حکایتیں معاد سے متعلق، چار معاش سے متعلق، چار ظرافت سے اور چار تصوّف سے متعلق ہیں ان کا انداز بھی وہی ہے جو چمن اوّل کا ہے اسی طرح چمن سوم اور چمن چہارم کا۔

مثنوی میں فنی اعتبار سے کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک سادہ بیانیہ انداز اختیار کیا گیا ہے، تشبیہات، استعارے اور صنائع بدائع کا استعمال بہت کم ہے مختلف حکایتوں کے انتخاب سے ظرف

---

[1] حکایت مرد قصاب کہ نوشادی کردہ بود۔
حکایت مہتر و مہترانی و مرد مسافر مجرد۔
حکایت مرد پہلوان کہ زن نازک کردہ بود۔

رنگین کے مزاج کا پتہ چلتا ہی بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہی کہ اس عہد میں انسانی کردار میں حالات نے کیسا تضاد پیدا کر دیا تھا۔ کہ ایک شخص ایک ہی تصنیف میں اعلیٰ درجے کی اخلاقی حکایات اور اخلاقی مضامین کے ساتھ ادنیٰ درجے کے جذبات اور پست خیالات بھی شامل کر لیتا تھا۔ ممکن ہی اس میں رنگین کی افتادِ طبع کا بھی کچھ دخل ہو لیکن بڑی حد تک اس میں رنگین کے ماحول کا اثر جھلکتا ہی۔ اور مثنوی کا مطالعہ اس عہد کی ذہنی اور اخلاقی حالت کے مطالعے میں مدد دیتا ہی۔

"مخمس رنگین" کہ مشہور بہ "پنجۂ رنگین" است

عددوں کی رعایت کے لحاظ سے رنگین نے "چہار چمن رنگین" کے بعد "مخمسِ رنگین" کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہی اسے مثنوی کہنا مشکل ہی اس میں دو منظوم خط اور تین داستانیں ہیں۔ پہلا خط لکھنؤ سے اپنے بھائی خدایار خاں کے نام لکھا ہی۔ اس[1] میں خدایار خاں کو مرحوم لکھتے ہیں اس خط میں ایک سو تریسٹھ اشعار ہیں اور آغاز اس طرح ہوتا ہی ؎

عزیز القدر میرے یار بھائی	ستاتی ہی مجھے تیری جدائی
قسم ہی تیرے سر کی اے خدایار	بہت بے کل رہے ہی یہ دلِ زار
تجھے معلوم ہو بعد از دعا کے	کہ بھائی کام ہیں یہ سب خدا کے
جو اپنے دوست یاروں سے جدا کر	یہاں پھینکا ہی تنہا مجھ کو لاکر
شفیق اپنا نہ کوئی یار ہی یہاں	نہ مونس نہ کوئی غم خوار ہی یہاں
گزرتی ہی عجب صورت سے اوقات	تڑپتے ہی کٹے ہی مجھ کو دن رات

---

[1] خدایار خاں کی تاریخ وفات سنہ ۱۲۱۳ھ ہی اور یہ مجموعہ سنہ ۱۲۰۷ھ میں ختم ہوا یعنی قلمی نسخے میں خدایار خاں کو مرحوم لکھا گیا ہی جو سنہ ۱۲۰۷ھ تک زندہ تھے، لیکن کتابت کے وقت ان کا انتقال ہوچکا تھا۔

نہ کھانا کچھ خوش آتا ہے نہ پینا　　نہ موت آتی ہے بھاتا ہے نہ جینا

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ میں سخت پریشاں ہوں۔ شاہ جہاں آباد کی گلیاں دن اور رات یاد آتی ہیں خصوصاً اس کافر صنم کی یاد جس کا نام تمھیں معلوم ہے بہت ستاتی ہے اور یہی میرے الم کا باعث ہے۔ غم سے میرا دل چھلنی ہوگیا ہے جب غم گھیرتا ہے تو یہ غزل پڑھتا ہوں ؎

کچھ اپنی دن بہ دن وحشت فزوں ہے　　بہار آئی ہے اور تازہ جنوں ہے

وہی ہے عشق کے نزدیک آساں　　قیاس و فکر سے جو کچھ بروں ہے

جہاں کی خوبیاں ہیں اس میں ساری　　مگر ہر ایک سے لگ چلنا زبوں ہے

گلے میں لعل کا تکمہ ہے اس کے　　گریباں گیر یا رنگیں کا خوں ہے

ہمارا عشق کی دولت سے یارو　　جنوں ہادی ہے وحشت رہنموں ہے

غرض اس ڈھب کے میں پڑھ پڑھ کے اشعار　　اس اپنے دل کو بہلاتا ہوں ہر بار

آگے چل کر کہتے ہیں کہ میں عشق کا راز چھپا نہیں سکتا اس لیے جو کچھ دل پر گزر رہی ہے بھائی تمھیں سنانا چاہتا ہوں۔ گزشتہ رات روتے روتے جب میں سو گیا تو میں نے خواب دیکھا کہ ایک مخلوق دریا پہ پھر رہی ہے اس کے پار ایک مکان ہے جو عرش سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ دریا کون سا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ جمنا ہے اور آج نوچندی کا میلہ ہے اس لیے لوگ جمع ہیں۔ پھر میں نے دریا پار کا مکان معلوم کیا تو کہا کہ یہ ایک کافر نگار کا ہے جو کھڑکی صحرا کی طرف کو ہے اس میں وہ نگار شام کو بیٹھتی ہے۔ میں بھی کھڑکی کے پاس گیا اور غور سے دیکھا تو ؎

دل اپنا جس کا تھا مدت سے جویا　　وہی بیٹھی ہے اس کھڑکی میں گویا

نظر اس کی پڑی میری طرف جب　　پڑھا یہ قطعہ اس نے مسکرا تب

قطعہ ؎

ارے یہ مردوا ہی سخت واہی | اس سے پوچھو تو یہاں یہ کیوں کھڑا ہی
لڑاتا ہی مُوا جس تس سے آنکھیں | اسے بے طرح یہ لپکا پڑا ہی
رہا میں دیر تک یہ سُن کے خاموش | پھر اتنے میں جو مجھ کو آ گیا ہوش
کہا میں نے کہ بے تقصیر ہوں میں | جدائی سے تری دل گیر ہوں میں
بس اب مجھ کو نہیں برداشت غم کی | نہ طاقت ہی مجھے درد و الم کی
مجھے اب وصل کی دارو پلا دے | خدا کو مان مرتا ہوں جلا دے
یہ سُن کر مجھ کو کوٹھے پر بُلایا | پھر اپنے پاس مسند پر بٹھایا
کروں تعریف کیا میں اس مکاں کی | انوکھی ہی عمارت ہو جہاں کی

اس خط میں مکان کی تعریف اور سراپے میں بعض نہایت عمدہ اشعار ہیں ——— تعریف مکان

مکان کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ کمروں میں چاندنیاں اور غالیچے بچھے ہوئے تھے، پلنگ پڑے ہوئے تھے ان پر توشکیں بچھی ہوئی تھیں اور اوپر سے چادریں پڑی تھیں ؎

نواڑ ریشمی سے وہ بُنے تھے | اور ان کے گرد گل دستے چُنے تھے

تعریف سراپا ؎

گندھی اس کی کھجوری تھی جو چوٹی | سو تھی لمبی بہت اور خوب موٹی
پڑی گُدّی کے پیچھے تھی وہ یک سر | کہے ناگن بھلا اس کو یہ کیوں کر
کہیے کیوں کر جبیں کو ماہ پارا | کہ چھائی سے لدا ہی ماہ سارا
مژہ اس کی جو تھیں ناوک کے ثانی | انھیں تشبیہ دے کس سے زبانی

تعریف زیور

زُمُرد کے کرن پھول اور جُھمکے
جنھیں دل دیکھ کر عاشق کا ہمکے
پڑے تکتے تھے رخساروں کو اس طرح
گلِ خورشید دیکھے حُور کو جس طرح

"مخمسِ رنگین" کا دُوسرا جز "عباداللہ مرزا پسرِ تاجرِ اصفہان اور "محبوب" دخترِ سوداگرِ بنارس کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۴۶ اشعار ہیں۔ کہانی یہ ہے :-

عباد اللہ بہت ہی خوب صورت اور دولت مند تھا۔ بدقسمتی سے اسے تجارت میں ٹوٹا ہوا اور وہ مجبور ہو کر اپنے نوکر کا نوکر ہوا۔ عباداللہ ایک دن کئی روز کا سفر کر کے ساحلِ سمندر پر آیا اور جہاز میں سفر کے لیے تیار ہو گیا۔ جب جہاز ایک کوہ کے قریب پہنچا تو ناخدا نے کہا کہ یہ مقام قضا نامی ہے جب تک یہ کسی کو نہ لے جہاز آگے نہیں جا سکتا۔ عباداللہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور لوگوں کو مجبور کر کے کشتی میں بیٹھ کر جہاز سے اُتر پڑا جہاز دُور نکل گیا تو عباد اللہ نے کہا کہ جب مرنا ہی ہے تو غم سے کیا فائدہ۔ یکایک ایک جانب سے آندھی اُٹھی۔ یہ آندھی کشتی کو پہاڑ کی طرف لے چلی اور کوہ سے ٹکرا گئی اور ٹوٹ کر ڈوب گئی اور کشتی کے ٹوٹتے ہی عباد اللہ کوہ پر چڑھ گیا۔ اب اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ شام کو کسی ایک طرف غم زدہ ہو کر سو گیا جب صبح آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے ایک مُرغ اونٹ سے بڑا اس کے پاس کھڑا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ اُڑ گیا اور نظر سے اوجھل ہو گیا۔ عباداللہ نے سب جگہ ڈھونڈا لیکن نہ ملا آخر شب کو اسی اپنی جگہ پر عباداللہ آکر سو رہا۔ مرغ بھی اپنی جگہ پر آ گیا۔

عباد اللہ نے خدا سے دعا کی کہ اس راز کو مجھے بتا کہ مرغ رات کو آتا ہے اور دن کو چلا جاتا ہے۔ پھر دل میں خیال آیا کہ شب کو یہاں آکر آرام کرتا ہے اور دن کو چُگنے چلا جاتا ہے۔

جب یہ مرغ اُڑنے لگا تو عباد اللہ بھی اسے چمٹ گیا وہ اتنا بڑا مرغ تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کوئی چمٹا ہوا ہے۔ یہ مرغ اتنا اونچا اُڑا کہ زمین ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے سمندر میں کشتی۔

اب نیچے اُترتے اُترتے اس مرغ کو رستے ہی میں رات پڑ گئی۔ دو بجے رات کو وہ بنارس آنکلا اور محل پر عباد اللہ کے پیر لگے تو وہ سمجھ گیا اب زمین قریب ہی ہے اس نے مرغ کے پَر چھوڑ دیے اور دھم سے کوٹھے پر گر پڑا۔ یہ جوان جس کوٹھے پر گرا تھا۔ یہ ایک سوداگر کا گھر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز سے سب محل والیاں جمع ہوگئیں۔ کوئی کہتی کہ یہ چور ہے کوئی کچھ کوئی کچھ کوئی کہتی پری زاد ہے کوئی چاند بتاتی۔ لیکن عباد اللہ خاموش تھا۔ تاجر کی بیٹی نے جھنجھلا کر کہا کہ روشنی لاؤ۔ شمع آئی تو دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر پڑیں اور دونوں اپنا اپنا دل ایک دوسرے کو دے بیٹھے۔ پھر لڑکی کا باپ آیا تو سب کی سب ایک کنارے ہوگئیں۔ نوجوان نے سلام کیا اور سوداگر نے جواب دیا۔ سوداگر نے نام اور وطن پوچھا جس کا جواب عباد اللہ نے دیا (کچھ شعر فارسی کے ہیں جن میں دونوں کی گفتگو ہے) غرض کہ اپنی تمام کہانی نوجوان عباد اللہ مرزا نے سُنا دی اور اس کہانی ہی میں رات کٹ گئی۔ تاجر نے عباد اللہ کو صبح کو نہلا کر عمدہ پوشاک پہنوائی اور اپنا مہمان بنایا یہ تاجر بھی اصفہانی ہی تھا۔ عباد اللہ کو مکان علیحدہ دے دیا گیا۔ سوداگر بچی کے دل پر تیر عشق بُری طرح سے

لگا تھا وہ سخت بے چین تھی۔ عباد اللہ کو ایک سادہ وضع لڑکا دیکھ کر سوداگر نے فیصلہ کیا کہ اس کو اپنی فرزندی میں لیا جائے۔ پھر شادی کا دن مقرر کیا۔ اور ایسی دھوم سے شادی کی کہ سب حیران رہ گئے۔ اب پھر اس کی قسمت جاگی اور دولت ہاتھ لگی۔

"مخمس" کا تیسرا حصہ نہایت دل چسپ ہے جس میں چھکو طوائف کی ہجو بیان کی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۹۸ ہے۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

کہوں میں آنکھ دیکھی ایک حکایت   سنو یارو کہ ہے طرفہ روایت
لڑکپن کے میرے ایک آشنا تھے   بہت مدت سے وہ مجھ سے جدا تھے
اور ان کا تھا سعادت یار خاں نام   انھیں بن عشق آتا تھا نہ آرام
قضارا لکھنؤ میں وہ جو آئے   تو میرے پاس ہی تشریف لائے
بہت مدت میں ان کا پاس آنا   نہایت ہی غنیمت میں نے جانا

اس کے بعد جوانی اور خوب صورتی کا تذکرہ کیا ہے ؎

جوانوں میں وہ مشہورِ جہاں تھے   غرض یہ ہے کہ وہ رنگیں جواں تھے
ہوئے یہاں آ کے ایک رنڈی پہ مفتوں   نہ مفتوں فی الحقیقت بلکہ مجنوں
جہاں وہ بیٹھتے بس ایک دم میں   ہزاروں شعر کہتے اس کے غم میں

اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے۔

اس غزل میں عشق کے طاری ہونے کا نقشہ کھینچا ہے جیسا کہ عام طور سے رواج ہے دوستوں نے سمجھایا کہ رنگین تمھیں فرہاد اور مجنوں کی کہانیاں یاد رکھنی چاہییں۔ وہی نتیجہ تمھارا بھی ہوگا۔ پھر رنگین اس کا جواب دیتے ہیں کہ اگر میں پریشان ہوں گا تو میری محبوبہ کا بھی یہی حال ہوگا اور تم اس سے واقف نہیں ہو۔ دوست سمجھانے کہ یہ رنڈی تم سے

بے وفائی کرے گی۔ رنگین نے کہا کہ میں نے اس سے قول لے لیا ہے ؎

بہت سا ان کو میں نے بھی پڑھایا بدلے کچھ ان کی خاطر میں نہ آیا

پھر میں نے رنگین سے کہا کہ مجھے بھی تو دکھاؤ چناں چہ وہ اس کے مکان پر لے گئے۔

تعریفِ مکان۔

مکان کی خستہ حالت دکھائی ہے۔ ایک کوٹھری ہے اس میں باورچی خانہ وغیرہ ہے، بدبو آرہی ہے۔ برتن مٹی کے ہیں اور وہ بھی گندے یہ نقشہ کھینچنے کے بعد سراپا ہے ؎

کہوں کیا سر کو اور مونڈے سر کو کوئی کھٹاٹے جیسے ناریل کو

یہ تھا اس ادہدی پیشانی کا عالم کہ دیکھے سے جسے تنگی کرے دم

ہُوا میں دیکھ ان کانوں کو حیران جذامی کے سے تھے سوجے ہوئے کان

بھم تو دیکھ یوں اوس کی بھوؤں کو کہ چھپکلیاں لڑے ہیں جس طرح دو

زبس پڑیاں تھے آنکھوں کے اندر تو یوں دیکھے تھی جیسے گھور کے بندر

یہ تھی یہ ناک رخساروں میں بیٹھی کہ جل ہو مینڈکی جوتے پہ بیٹھی

ہنسی میں اد لٹتی مونٹھ اس طرح نکلتی ہے کسی کی کانچ جس طرح

بیٹھے اپلے سے تھے اس کے جو رخسار تھے ان پر رد نگھٹے جوں خس نمودار

زبان کی تشبیہ بہت ہی فحش ہے

زنخ ایسی تھی جیسے پکا پھوڑا ذقن جیسے کہ پھوڑے پر دو دوڑا

کمر اس کی جدھر دیکھو ادھر تھی بغل سے چوتڑوں تک سب کمر تھی

تعریف پوشاک۔ کل ۱۶ اشعار ہیں

عجائب اوس اُجالی کی تھی انگیا غرض یہ ہے کہ جالی کی تھی انگیا

نظر آتی تھیں اس میں چھاتیاں یوں　　　　که آرنے ادپلے جالی بیچ ہوں جوں

تعریف زیور

نتھ، چنپاکلی، چوڑیوں کا ذکر کیا ہے اور بُرا نقشہ کھینچا ہے۔ جب وہاں سے اُٹھ کر یہ عالم دیکھ کر گھر واپس آیا تو رنگین سے کہا کہ تم ایسی بھدّی شکل والی عورت پر دم دیتے ہو کہاں تم اور کہاں وہ عورت لیکن رنگین کو اس عورت کے دیکھنے سے تسلّی ہوتی تھی۔ آگے چل کر کہتے ہیں ؎

کٹے ایک چھ برس یوں ان کے اوقات　　　　کہ غٹ پٹ ہی رہے وہ اس سے دن رات

سلیقے سینکڑوں اس کو سجھائے　　　　ہزاروں اس کو سگھڑاپے[1] سکھائے

سنائے اس کو دم دینے کے سب طور　　　　سکھائے اس کو جی لینے کے سب طور

سجھائیں دل بری کی اس کو باتیں　　　　جتائیں اس کو معشوقی کی گھاتیں

جب تمام ناز و انداز کی باتیں سیکھ گئی تو مشہور ہوگئی اور مخلوق نے آنا شروع کر دیا اب اس کے کئی اور بھی ٹھکانے پیدا ہوگئے پھر یہ ہُوا ؎

لگی وہ بے وفائی ان سے کرنے　　　　لگی وہ کج ادائی ان سے کرنے

وہ باتیں جتنی تھیں اس کو سکھائیں　　　　وہی آخر انھوں کو پیش آئیں

جب رنگین سے تعلّقات ختم ہونے لگے تو یہ دو شعر لکھ کر دروازے پر لگا دیے ؎

کرے کسی سے جو کوئی بھلائی　　　　تو آخر اس کو پیش آوے بُرائی

رکھے کسی سے جو چشمِ مروّت　　　　تو اس کے سات پرکھے[2] پہ لعنت

اس مثنوی سے بھی رنگین کی طبیعت کی ظرافت کے علاوہ اس عہد کی

---

[1] تمیزداری، خوش سلیقگی

[2] پرکھا، نسل۔ اس سے اردو میں پرکھا ہے یعنی بزرگ۔

معاشرت کا پتہ چلتا ہے کہ معقول لوگ بھی طوائفوں کے یہاں آیا جایا کرتے تھے اوران سے اپنے تعلقات کا بیان معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ سراپا کے اشعار میں بعض تشبیہات میں ندرت ہے لیکن ظرافت کی جگہ رکاکت ملی ہوئی ہے۔

مخمس کا آخری حصہ ایک منظوم خط ہے جو الٰہی بخش خاں معروف کے نام لکھا گیا ہے۔ اس میں ۱۶ اشعار ہیں اور رنگین نے ایک فرنگی عورت پر اپنے عاشق ہونے اور بے قراری کا حال نظم کیا ہے۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرنگی عورت نے پہلے کچھ قول کیا تھا پھر اس اقرار سے پھر گئی اس پر رنگین کو جو اضطراب ہوا اس کا حال بھی خط میں لکھا ہے۔

'مخمس' میں اشعار کی کُل تعداد جیسا کہ رنگین نے 'مخمس' کے آغاز میں خود لکھا ہے سات سو ہے۔

'شش جہتِ رنگین' کا چھٹا حصہ 'مسدسِ رنگین' کے نام سے ہے۔ اس میں چھ خط نظم کیے گئے ہیں۔ سببِ تصنیف میں لکھتے ہیں :ے

ایک دن میرے جی میں یوں آیا ۔۔۔ کہ کروں مثنوی میں ایک انشا
پر نئی وضع کوئی ایسی ہو ۔۔۔ خوش طبیعت ہو دیکھ کر جس کو
کہ کے یہ ہاتھ میں اٹھا کے قلم ۔۔۔ نظم چھ خط کیے یہ میں نے رقم
لیکن ہر ایک کا نیا ہے طور ۔۔۔ نظم میں نے کیا ہے کر کے غور
تا کہ جو دیکھے دل سے اہلِ یقیں ۔۔۔ کہے اس کو 'مسدسِ رنگیں'
اب میں کرتا ہوں اس پہ ختم کلام ۔۔۔ پانچ سو ہوں گے اس کے شعر تمام

ان اشعار سے 'مسدسِ رنگین' کے اشعار کی کُل تعداد پانچ سو

معلوم ہوتی ہو۔ پہلا خط لکھنؤ سے شاہ جہاں آباد کسی شخص کے نام لکھا ہو اور
اس میں اپنے دل کی بے قراری کا حال نظم کیا ہو۔ ممکن ہو اس میں بعض اشعار
رسمی ہوں لیکن جس طرح رنگین نے شاہ جہاں آباد کی صحبتوں کو یاد کیا ہو
اس کی تہ میں جذبات کی شدت اور خلوص نمایاں ہو ؎

پھر جو سنتا نہیں ادھر سے جواب — تو میں آنکھوں کو کھولتے ہی شتاب
شعر یہ مصحفی کا پڑھ کر زار — رونے لگتا ہوں مثل ابرِ بہار

مطلع ؎

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

اسی کیفیت کا اظہار دوسرے خط میں بھی کیا ہو۔ یہ خط بھی لکھنؤ سے
شاہ جہاں آباد کو اسی شخص کو لکھا گیا ہو اس کے یہ اشعار قابلِ ذکر ہیں :؎

تیری صورت جو یاد آتی ہو — بے قراری مجھے ستاتی ہو
دن کو بے تاب یہاں رہوں ہوں میں — شب کو بے خواب یہاں ہوں ہوں میں
چشمِ تر سے لہو رہے ہے رواں — دل بہ رنگِ جرس کرے ہو فغاں
خط جو میں نے لکھے ہیں خدمت میں — شوق میں ذوق میں محبت میں
حال اس درد و غم کے مارے کا — ان سے معلوم ہو گیا ہوگا

رنج و غم کی حالت ؎

چہرہ دیکھو تو زعفرانی ہو — اشک دیکھو تو ارغوانی ہو

شہر بیگانہ میں مسافر ہوں — جھوٹ کہتا جو ہوں تو کافر ہوں
ہو غرض اضطرار یہاں جو مجھے — کس طرح سے لکھوں وہ جان تجھے
صحبتیں جب وہ یاد آتی ہیں — اور دونا مجھے ستاتی ہیں

خاص طور پر یہ شعر ؎

شہر بیگانہ میں مسافر ہوں　　جھوٹ کہتا جو ہوں تو کافر ہوں

شہر کی بیگانگی اور اپنی مسافرت کا شکوہ ان تمام شعرا نے کیا ہے جو دہلی سے لکھنؤ پہنچے تھے۔ میر، میر حسن، مصحفی، انشا اور جرأت کے کلام میں ایسے اشعار بہ کثرت موجود ہیں جن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی روایات بنیادی طور پر دہلی سے مختلف تھیں۔ یہ شعرا اگرچہ سب کے سب دہلوی الاصل نہ تھے اور مختلف شہروں سے آکر دلّی میں بسے تھے لیکن ان کی تربیت دہلی میں ہوئی تھی اور اسی ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ دہلوی روایات سے ان کی وابستگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جو ذہنی طور پر کبھی لکھنؤ سے مفاہمت نہ کر سکے۔ میر تقی میر اور مصحفی کا یہی حال ہے۔ لکھنؤ ان دونوں کو راس نہ آیا اور ان کا کلام اس کا گواہ ہے۔ رنگین اور انشا نے لکھنؤ کی صحبتوں میں شریک ہو کر تھوڑی بہت مفاہمت کر لی تھی۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ اس رنگ میں رنگ گئے جو لکھنؤ کا رنگ تھا اور کبھی کبھی گزشتہ صحبتوں کی یاد ان کے دل میں چٹکیاں لیتی۔ اپنے کلام کے علاوہ انشا "دریائے لطافت" میں بی نورن اور میر غفری کی گفتگو میں دلّی کا تذکرہ جس حسرت سے کرتے ہیں وہ قابلِ غور ہے۔

"مسدس رنگین" کے خطوط بھی رنگین کی اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

دوسرے خط میں اپنے شاگرد میر صادق علی کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی سنائی ہوئی ایک کہانی نظم کی ہے۔ یہ کہانی اس وقت سنائی گئی تھی جب رنگین کو غم کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی۔ کہانی سنانے کی شرط یہ تھی کہ رنگین اسے نظم کریں۔ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے: ؎

کہ کسی وقت میں کہیں ہمدم — ہم سفر چار شخص تھے باہم
ایک درزی تھا ایک تھا نجار — ایک زاہد تھا اور ایک سنار
سب سفر میں اذیتیں پا کر — وارد ایک شہر میں ہوئے جا کر
تھا جو چوری کا وہاں بہت خطرہ — کوئی دم بھر نہ شب کو سوتا تھا

ان چاروں نے بھی باری باری جاگنے کا مشورہ کیا سب سے پہلے نجار کی باری آئی۔ بڑھئی نے سوچا کہ کوئی شغل ہونا چاہیے چناں چہ اس نے کاٹھ کی ایک پتلی بنائی جو مثل حور کے تھی۔ اس کے بعد درزی کی باری آئی۔ اس نے جی میں خیال کیا کہ بڑھئی نے اپنا ہنر مجھے دکھایا ہے۔ اب مجھے بھی اپنا ہنر دکھانا چاہیے۔ سو اس نے ایک کرتی جالی کی تیار کی اور ایک انگیا۔ پھر گوٹے کی گوٹ نہایت عمدہ طریقہ سے لگائی۔ شبنم کی اوڑھنی پر کام کیا۔ ایک شلوار بھی تیار کی اس کے بعد پھر جوڑے کو عطر میں بسایا اور پہنا دیا۔

اب سنار کی باری آئی اس نے بھی دیکھا اور کہا کہ ان دونوں نے تو اپنا اپنا ہنر دکھا دیا اب مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ سنار نے اوزار نکال کر گہنا تیار کر ڈالا۔ ہاتھوں کے کڑے، پاؤں کی پازیب، کانوں کی بالیاں اور پاؤں کے توڑے بھی بنائے۔ ہاتھوں کی دس دس چوڑیاں بھی گھڑیں پھر تمام زیور پر میناکاری کی اور گہنا پہنا کر سو گیا۔ پھر زاہد اٹھا اور دیکھ کر حیران ہو گیا۔ دل میں کہا کہ میں بھی اپنا کمال ظاہر کروں۔ زاہد خدا کی درگاہ میں زار زار رو کر کہتا کہ خدایا تو اس میں جان ڈال دے ؎

قدرتِ حق سے ایک دم کے بیچ — آگئی جان اس صنم کے بیچ
بارے اتنے میں دن ہوا روشن — شکل کو دیکھ اس کی چاروں تن

دو گھڑی تک کھڑے رہے خاموش بعد ازاں ان کو جب کہ آیا ہوش
پھر تو اس کو پری سی جو پایا اوس کا کرنے لگا ہر ایک دعویٰ
پہلے بخار نے کہا کہ دوستو میں نے ہی تو پہلے اس کو عیاں کیا ہے اس کا
تو نام و نشان بھی نہ تھا۔ پھر درزی نے کہا کہ شرم کرو جب میں نے اسے
پوشاک پہنائی تب ہی تو اس میں حُسن پیدا ہوا ورنہ یہ تو لکڑی تھی۔ پھر سنار
نے کہا کہ میرا اس پر بہت خرچ ہوا ہے اس لیے یہ میری ہونی چاہیے۔ زاہد
نے کہا کہ تم سب پابند ہوس ہو از روئے شرع یہ میرا حق ہے میری ہی دعا سے
اس میں جان پڑی۔ اثنائے تنازع میں لوگ جمع ہو گئے اور کوتوال بھی
آگیا اور کہا کہ یہ تو اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی تھی تم اسے یہاں کس
طرح لے آئے۔ جتنا مال اس سے لیا ہے سب واپس کرو۔ اب معاملہ یہ طے
پایا کہ قاضی جو فیصلہ کرے وہی ہو۔ پھر قاضی کے ہاں سب آئے۔ قاضی نے
کہا کہ یہ تو میری کنیز ہے اور میرا مال و زر لے کر بھاگی تھی دولت اس نے
کہیں چھپا دی ہے تم مٹھائی کے لیے کچھ مجھ سے لے لو اور اسے یہاں
چھوڑ دو۔ لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ تم کیوں جھگڑتے ہو میری بات سنو
کہ یہاں سے سو کوس پر ایک درخت ہے اس سے ماجرا بیان کرو آپس میں نہ
جھگڑو۔ وہ درخت حق بات بتا دے گا اور انصاف کرے گا۔ سب کے
سب درخت کے پاس پہنچے اور اس سے قصہ بیان کیا تو اس میں سے
ایک آواز نکلی ہیبت ناک اور درخت کا سینہ چاک ہو گیا۔ وہ مورت دوڑ کر
اس میں سما گئی اور درخت جوں کا توں ہو گیا۔ سب جھگڑا ہی ختم ہو گیا ؎
جُز کو نسبت ہے اپنے کُل کے ساتھ نشہ ہوتا ہے جیسے مُل کے ساتھ
پھر زاہد نے کہا ؎

واردات ایسی ہی عجیب و غریب — حق تعالیٰ کرے ہمارے نصیب
یعنی ہم تم یہ جس کے ہیں اجزا — قطرہ ساں سب ہیں اور وہ ہو دریا
ہوں اسی طرح اس سے سب ملحق — نظر آوے نہ کچھ بھی پھر جز حق
یارو عشقِ مجاز ترک کرو — راہ حقیقت کے عشق کی سب لو
سُن کے یہ پند زاہدِ آگاہ — سب نے لی اپنے اپنے گھر کی راہ

محبوبہ کی طرف مخاطب ہو کے کہتے ہیں ؎

تھا میرے حسب حال یہ قصّہ — مجھ کو بھایا کمال یہ قصّہ
جھٹ قلم ہاتھ میں اُٹھا جو لیا — اس کہانی کو میں نے نظم کیا
اپنا ہو وہم اسی طرح نجار — عقل خیاط ہو خیال سُنار
دل بہ عینہ مثال زاہد ہو — جو کرے ہو رہِ حقیقت طو
ہو یہ دنیا مقامِ خوف و خطر — جس میں واقع ہوا ہو ہم کو سفر
عشق ہو کو توال قاضی رُوح — دم بہ دم جس کو سینکڑوں ہی فتوح

آخر میں اس قصّے کے نظم کرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خط دس دن میں نظم ہوا ہو۔ اس خط کے آخری اشعار سے مجموعے کی تاریخ تصنیف جو 'چار باغ' سے نکلتی ہو ۱۲۰۷ھ[1] قرار پاتی ہو ؎

نظم دس دن میں یہ خط ہوا ہو تمام — اور اس خط کا 'چار باغ' ہو نام
جس برس میں ہوا ہو یہ مرقوم — کیجے تاریخ نام سے معلوم
تیسرا خط اسے لکھوا ای یار — وہ جو شاگرد ہو میرا غم خوار

تیسرا خط بھی لکھنؤ سے شاہ جہاں آباد لکھا گیا ہو اور اس کے مکتوب الیہ لالہ بسنت سنگھ نشاط ہیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہو کہ رنگین اس زمانے میں بیمار بھی ہو گئے تھے۔ چناں چہ حکیم مسیح الزماں محمد اشرف خاں

[1] قلمی نسخے کے حاشیے پر ۱۲۰۸ھ تحریر ہو جو غلط ہو

کو خط لکھا ہے اس خط میں رنگین نے اپنے آپ کو بیماریٔ عشق کا مریض بتایا ہے اور دردِ عشق کا نسخہ طلب کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کچھ امراض اور تھے جن کی بنا پر لکھنؤ کے طبیبوں نے سِل ہو جانے کے خطرے کا اظہار کیا تھا اور فصد لینے یا مسہل کا مشورہ دیا تھا۔ چناں چہ ان مشوروں کے بعد رنگین نے حکیم صاحب سے نسخہ منگایا۔

پانچواں خط لکھنؤ سے بنارس کو لکھا ہے اس کے مکتوب الیہ خواجہ محمود ہیں جو لکھنؤ سے بنارس تک ایک مرتبہ رنگین کے ہم سفر ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے عشق کی داستان رنگین کو سنائی تھی۔ اس کا حال رنگین نے تفصیل سے "ایجادِ رنگین" کے ورق ۲۰ ب میں کیا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے بعد خواجہ محمود سے ان کے تعلقات کافی بڑھ گئے تھے۔ رنگین نے اس خط میں اپنی حالتِ عشق اس طرح بیان کی ہے ؎

میں اب آیا ہوں اپنی زیست سے تنگ — کچھ نہیں مجھ کو فکرِ نام ہو ننگ
عشق جب سے ہوا گلے کا ہار — تب سے اس کش مکش میں ہوں اے یار
دل اسے یاد جب دلاتا ہے — تب یہ جی میں خیال آتا ہے
کہ رہوں کھا کے اس طرح کچھ سو — کہ خبر کچھ مری کسی کو نہ ہو
کبھی میں زار زار روتا ہوں — کبھی اشکوں سے منھ کو دھوتا ہوں

دوست سمجھاتے ہیں لیکن رنگین پر کوئی اثر نہیں ہوتا ؎

لطف دنیا کا زندگانی ہے — باقی قصہ ہے اور کہانی ہے

آگے چل کر عشق سے پریشان ہو کر کہتے ہیں کہ دوستوں نے ہر طرح سے سمجھایا لیکن راہ راست پر نہ آیا۔ چناں چہ کہتے ہیں ؎

شعر یہ مصحفی کے دو بیداد — مجھ کو یہاں برمحل ہیں آئے یاد

ایک تو ہجرِ یار نے مارا دُوسرے روزگار نے مارا
ہم تو مرتے نہ تھے پراس تیرے خنجرِ آب دار نے مارا

یہ وہی رنگین ہیں جو "ایجادِ رنگین" میں خواجہ محمود کی بے قراری کا حال سُن کر بجائے عشقِ مجازی کے عشقِ حقیقی کی طرف مائل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس خط میں بے قراری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود اس مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس سے وہ خواجہ محمود کو باز رکھنا چاہتے تھے۔

چھٹا خط مرزا محمد ابراہیم کے نام لکھنؤ سے بنارس لکھا گیا ہے اشعار کی کُل تعداد اُنتیس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین کسی سفر سے واپس آئے تھے غالبًا یہ سفر بنارس ہی کا ہے۔ کیوں کہ اس میں مرزا محمد ابراہیم کا خواجہ محمود کو پیام بھیجنا اور رنگین کا اس پیام کو پہنچانے کا حال بھی لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ بڑی تکلیف سے کٹا۔ چناں چہ فرماتے ہیں ؎

ایسے ایسے اُٹھائے رنج والم کہ وہ دیکھے کسی نے ہوں گے کم
راہ میں ٹوٹ جانا گاڑی کا چلنا پاؤں سے پھر اگاڑی کا
متصل پھر الٰہ آباد کے آ ڈوبنا ناؤ کا بھنور میں جا
گزرے جو جو کہ ہیں گے رنج و تعب میں زبانی کہوں گا آپ سے سب
خواجہ محمود کو پیام تمام کہہ دیے میں نے لے تمھارا نام
کیا لکھوں تم کو اپنے جی کا حال اس کو رہتا ہے آپ کا ہی خیال

کیوں کہ مسدس کا خط نمبر ۲ ۱۲۰۷ھ میں لکھا گیا اس لیے یہی سن رنگین کے سفرِ بنارس کا قرار پاتا ہے۔

ان خطوں کی فنی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن رنگین کی

زندگی کے واقعات ان کے احباب سے تعلقات اور ذاتی حالات وواقعات
مرتب کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

ان مثنویوں کے علاوہ مختلف مجموعوں میں الگ الگ ایسی مختصر نظمیں
ہیں جو مثنوی کی تعریف میں آتی ہیں مثلاً "دیوان ریختہ" میں دو مثنویاں بطور
خط لکھی گئی ہیں۔ رنگین نے انھیں خود مثنوی کہا ہے پہلی مثنوی کا عنوان
یہ ہے:-

مثنوی اوّل بہ طور خط از بنارس بہ لکھنؤ بہ نام بی فرخندہ طوائف و
بیان خوبی شہر و بازار و گھاٹ ہا و نہاں آں جا و احوال بے قراری
قائم ماندن خود بر قول و قرار و حالتِ اضطرار۔

اس مثنوی میں ۷۳ اشعار ہیں اور اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

ای ہمدم و دل نواز جانی سرمایۂ عیشِ جاودانی
فرخندہ نہال راحت وعیش گل دستۂ باغِ عشرت وعیش

مثنوی کا سب سے دلچسپ حصّہ بنارس کے گھاٹ، وہاں کے
نہانے والوں کی چہل پہل اور منظر نگاری سے متعلق ہے۔ اور یہی حصّہ
سب سے طویل بھی ہے ؎

ایک سمت بنینیاں ہیں خوش رو بنگالنیں ایک رُخ ہیں دل جو
چھینٹوں سے لڑیں ہیں ایک سے ایک دیکھیں ہیں کھڑے انھیں بد و نیک
پیہم کوئی غوطہ ہے لگاتی کوئی لے ہے چھپا دکھا کے چھاتی
کوئی پھرتی سے پھر دکھانے کو پیٹ ہنس کر جاتی ہے پانی پر لیٹ
نکلے ہے نہا کے کوئی چالاک جب گرتی ہے کوئی بند کر ناک
سورج ہی کی کوئی کر کے پوجا کہتی ہے نہیں ہے تجھ سا دوجا

خوش ہوتی ہے کوئی کہہ کے شے رام — کہتی ہے کوئی کہ بول ہر نام

مٹی کا بنا کوئی سدا شیو[1] — کہتی ہے کہ بول بم مہا دیو

بھیروں[2] کا لگا کے کوئی چھاپا[3] — گنگا کو چڑھاتی ہے بتاشا

ننگے ہی پاؤں کوئی آتی — دریا سے ہے کوئی گھر کو جاتی

غمزے کوئی کرتی ہے نہاتی — دیتی ہے موؤں کو کوئی پانی

خوش ہو کے کوئی نہا رہی ہے — پھولوں کو کوئی بہا رہی ہے

چپکے ہی کھڑی ہے کوئی حیراں — کرتی ہے کھڑی کوئی گپ واں

بیٹھی ہے بچھاکے کوئی آسن[4] — کہتی ہے یہی کہ دے برہمن

آ مجھ کو تنک تلک لگا دے — سورت مجھے شیو کی دکھا دے

سورج سے کوئی نظر ملاکر — پانی کو ہتھیلی میں اٹھاکر

چک پھیری کے جلد پڑھ کے کچھ ساتھ — لے جاتی ہے لب سے مانگ تک ہاتھ

دل اپنا دکھا رہی ہے کوئی — بال اپنے سکھا رہی ہے کوئی

جوڑا ہے کسی نے کسی کا باندھا — گزرے ہے کوئی رگڑ کے کاندھا

چلتی ہے کمر کو کوئی لچکا — پہنچے جسے دیکھ دل کو دھچکا

بیٹھی ہے کوئی کوئی کھڑی ہے — لیٹی ہے کوئی کوئی پڑی ہے

کوئی اپنی سہیلیوں کو لے ساتھ — دے کر چلتی ہے ہاتھ میں ہاتھ

کوئی چلتی ہے رات سے اکیلی — کہتی ہے کہ ساڈا رب ہے دیلی[5]

چونکہ کوئی لے کے مارتی لب — جاتی ہے نہانے آخر شب

پہنے ہے کھڑے ہی کوئی پوشاک — ننگی ہی کھڑی ہے کوئی بے باک

---

[1] بھیروں : دیوتا ؛ شیو کا اوتار [2] وہ نشان جو ہندو جاتری تیرتھوں میں جاکر اپنے بازوؤں پر لگواتے ہیں۔ [3] پوجنے کی چیزیں [4] اون کی بنی ہوئی چیز مثل کمبل جس پر ہندو پوجا کرتے وقت بیٹھتے ہیں [5] پنجابی بمعنی ہمارا خدا حافظ ہے۔

ٹیکے ہے زمیں پر کوئی سر — سر نیچے کیا ہے پاؤں اوپر
پہروں سے کھڑی ہے گھاٹ پر آ — کرتی ہے اس روش سے پوجا
تھیلی کوئی ہاتھ پر چڑھائے — آسن[1] کسی گھاٹ پر جمائے
بیٹھی ہے الگ سبھوں سے ہو کر — کرتی ہے گپت ہی جی میں ہر ہر
صندل کوئی گھس کے ہے لگاتی — گوگل[2] ہی کو ہے کوئی جلاتی
دانتن ہی کوئی کر رہی ہے — سر کوئی زمیں پہ دھر رہی ہے
کوئی پیٹھ پر اپنی دونوں کے ہاتھ — رگڑے ہے جبیں زمیں کے ساتھ
ڈنڈوت کرے ہے کوئی جھک کے — چپکی ہی کھڑی ہے کوئی رک کے
کوئی اپنا کمال وہاں جتا کے — اشلوک پڑھے ہے بڑبڑا کے
پوتھی کوئی باچتی ہے رر سے — پڑھتی ہے شبد ہی کوئی ڈر سے
کوئی یاد کرے ہے گاتر[3]ے آ — سیکھے ہے کوئی کسی سے پوجا
ساری کوئی اوڑھ کر چلے ہے — دل پاؤں تلے کوئی ملے ہے
لہنگا کوئی کھیر کا ہے پہنے — پہنے ہے کوئی جڑاؤ گہنے
مستی کوئی آئی ہے لگا کر — آئی ہے دھڑی[4] کوئی جما کر
کوئی کر کے گلوری پان کی ٹھیک — پھینکے ہے چبا کے بس وہیں پیک
چترا جو ہے ان میں ہو کے انجان — کرتی ہے بدن کو اپنے واں دان[5]
القصہ یہ شہر ہے طلسمات — یہاں شغل یہی رہے ہے دن رات
پر مجھ کو نہیں کسی سے کچھ کام — دن رات ہے ورد بس تیرا نام

اس مفصل بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین کو جزئیات نگاری پہ بڑی قدرت حاصل تھی اور خاص طور پر متحرک مناظر کی تصویریں کھینچنے میں بڑا

---

[1] آسن جمانا: کھونٹا سا بیٹھنا [2] ایک درخت کا گوند جس کی ہندو دھونی دیتے ہیں۔ [3] گاتر (سنسکرت) فقرہ [4] ہونٹوں پر مسی کی تہ جمانا [5] صدقہ، پُن۔

کمال رکھتے تھے۔ اردو کی بہت کم مثنویاں ایسی ہوں گی جن میں ایسی جان دار مناظر نگاری ملے گی۔ اس بیان میں کہیں بھی تصنع پیدا نہیں ہوا اور نہ آورد کا پتہ چلتا ہے۔ اس سارے مناظر کو بیان کرنے کے بعد رنگین لکھتے ہیں کہ میں ان دل چسپیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کیوں کہ میں تیری محبت میں مبتلا ہوں۔ اس بیان سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رنگین بی فرخندہ اور اس قسم کی دوسری طوائفوں سے کیسے تعلقات رکھتے تھے اس اعتبار سے یہ مختصر مثنوی سوانحی اور تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہے۔ اپنا حال رنگین نے ان اشعار میں بیان کیا ہے ؎

جب تو ہی جدا ہوا ای پری رو — تب چین ہو کس طرح سے مجھ کو
ہے آٹھ پہر یہ میری صورت — آنکھوں میں پھرے ہے تیری صورت
رہتی جو دل کو ہے تری یاد — رہتا ہے یہ تری یاد سے شاد
پر چین مجھے کہیں نہیں ہے — میں آپ کہیں ہوں دل کہیں ہے
تیری ہی قسم ہے مجھ کو ہر آن — دن رات رہے ہے یہاں ترا دھیان
احوال غرض کڈھب ہے میرا — معلوم نہیں ہے حال تیرا

مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے ؎

رنگین سے خدا تجھے ملادے — جلدی کہیں لکھنؤ دکھادے

یہ مثنوی 'دیوان بیختہ' میں ہے جو اپنے قول کے مطابق رنگین کا دوسرا دیوان ہے اور جسے انھوں نے ۱۲۱۵ھ میں شروع کیا تھا۔ 'مسدس رنگین' میں مرزا ابراہیم کو جو خط لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین ۱۲۰۷ھ میں بنارس سے لکھنؤ واپس آچکے تھے۔ قیاس ہے کہ ۱۲۰۷ھ کے سفر میں یہ مثنوی لکھی گئی ہوگی۔

اس سلسلے کی دوسری مثنوی بھی بنارس سے لکھنؤ کو لکھی گئی ہے اور یہ بھی بی فرخندہ طوائف کے نام ہے۔ اس میں اشعار کی کل تعداد ۷۱[1] ہے ضمنی طور پر اس سے بنارس پہنچنے کی تاریخ اور مہینہ بھی معلوم ہو جاتا ہے ؂

شعبان کی دوسری[2] کو پیارے ۔۔۔ پہنچا ہیں بنارس آکے بارے

ابتدائی اشعار یہ ہیں ؂

شعبان کی دوسری کو پیارے ۔۔۔ پہنچا ہیں بنارس آکے بارے
لازم ہے کہ دیکھتے ہی خط کو ۔۔۔ جلدی سے مجھے جواب لکھیو
پہلے تو مزاج کی حقیقت ۔۔۔ لکھنا مجھے اے خجستہ طینت
دل کو مرے تا کہ چین آوے ۔۔۔ یہ آہ و فغاں کو بھول جاوے
کنہلی[3] کا بغل کی پھر کچھ احوال ۔۔۔ تھا جس سے کہ دشمنوں کا بدحال
تحریر جو آپ کیجیے گا ۔۔۔ بے زر مجھے مول لیجیے گا
تھا ہاتھ پہ گل[4] جو تم نے کھایا ۔۔۔ جس نے مجھے آگ پر اٹھایا
کیجو رقم اس کا ماجرا بھی ۔۔۔ مجمل بھی دلے جدا جدا بھی

'دیوان ریختہ' میں رنگین نے اسے مثنوی دوم بہ طور خط بہ نام بی فرخندہ لکھا ہے لیکن پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بنارس پہنچنے کے بعد یہ پہلا خط ہے اور پہلی مثنوی جس میں اپنے پہنچنے کا حال اور بی فرخندہ کی خیریت دریافت کی ہے۔ پہلی مثنوی جس میں بنارس کے گھاٹ کا حال نظم ہوا ہے غالباً بعد میں لکھی گئی ہوگی۔

---

[1] ورق 9/ب قلمی نسخہ 'دیوان ریختہ' [2] طالب علم محمد دلی کے لکھے ہوئے نسخے میں "تیسویں" ہے [3] غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ یہاں گُٹھلی ہونا چاہیے یعنی گلٹی [4] گل کھانا: معشوق کے کسی زیور کو آگ پر لال کر کے اپنے ہاتھ پر بہ طور یادداشت داغ دینا ؂ ہزاروں کھا کے گل ہم نے بنایا ہاتھ گلدستہ ٭ ہمارے دستۂ گل پر عجب عالم ہے سر گل کا زخم

'دیوانِ ریختہ' کے علاوہ 'مجموعۂ رنگیں' میں بھی چند چھوٹی حکایات بہ طور مثنوی موجود ہیں۔[1] یہ تین حکایات جن میں پہلی اور تیسری حکایت پوربیوں کے متعلق پوربی زبان میں ہیں۔ دوسری حکایت "جواب و سوال فرعون و شیطان" پنجابی زبان میں ہے۔ ان تینوں حکایتوں کو رنگین نے 'مجموعۂ رنگین' میں شامل کیا ہے جس کا مقصد سترہ زبانوں میں اپنی لیاقت کا اظہار ہے اس لیے ان کو تفصیل سے رنگین کی زبان دانی کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔

مثنوی گوئی کے سلسلے میں رنگین کا اپنا ایک بیان نہایت اہم ہے یہ "امتحانِ رنگیں" کا وہ حصہ ہے جو مثنوی سے متعلق ہے۔ "امتحانِ رنگیں" میں اپنے علامہ ہونے کے دعوے میں رنگین لکھتے ہیں کہ اصنافِ سخن کی تعداد ستائیس ہے اور ان میں سے ہر صنف کے مختلف طرز ہیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ان تمام ستائیس اصناف میں تمام مختلف طرز اختیار کیے ہوں۔ اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ صرف میں نے ہی یہ کمال حاصل کیا ہے۔ چناں چہ مثنوی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ میں نے حسبِ ذیل مثنویاں لکھیں:-

(۱) مثنوی فارسی بہ طرز حضرت مولوی روم و بیان حکایات در تصوف جس کا نمونہ یہ ہے ؎

یا الٰہ العالمیں ربّ الجلیل — برتری و بہتری از قال وقیل
قطرہ را گوہر نمودی در صدف — بر فلک انجم کشیدی صف بہ صف
طوقِ لعنت یافت از تو آں یکے — بر خلافت شد مقام دیگرے

---

[1] مجموعۂ رنگین، قلمی نسخہ ورق ۵/الف، ۵/ب، ۶/الف، ۶/ب، ۷/الف، ۷/ب، ۸/الف

توعطا کردی شکر درنی شکر   تاکسے را می خورانی کی شکر
از تو برپا شد زمین وآسماں   از تو رنگا رنگ شد خلق جہاں[1]

اس مثنوی کے اشعار کی تعداد رنگین چھ سو بتاتے ہیں۔

---

(۲) مثنوی درہندی بہ طرز حضرت فرید الدین عطار درتصوف و حکایت درحکایت گرہ بہم دیگر بعد بیان مدعا ایں قید درتمام مثنوی است

یہ مثنوی "ایجادِ رنگیں" ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

حمد ہوسکتی ہے کب اس پاک کی   پاک کی جس نے یہ صورت خاک کی

اس کے اشعار کی تعداد رنگین ایک ہزار بتاتے ہیں۔

(۳) مثنوی درتجنیس قافیہ درہندی بہ طرزِ اہلی شیرازی بہ پند و نصیحت"

اہلی شیرازی کی مثنوی "سحرِ حلال" ہے جس کے طرز پر رنگین نے چار سو اشعار کی ایک مثنوی کہی تھی۔ رنگین نے اس کا نمونہ یہ دیا ہے ؎

حمد اسے کہ جو کہ ہے جان آفریں   تاکہ کہیں سب تجھ کو ای جان آفریں
آدے پھر جس وقت باری نعت کی   نظم ہو مقبول باری نعت کی
مدح کہنے بس نہ ہو لاچار یار   تو مدد کر اپنی اب لاچار یار[2]
جس قدر اصحاب ہیں اس کے تمام   ان میں جو کم ہے وہ ہے مردِ تمام[3]
کام رکھ ان سے اور اس کی آل سے[4]   تا ترا منھ سُرخ ہوئے آل سے[5]

(۴) مثنوی درہندی بہ طرزِ میر حسن درجواب بے نظیر و بدر منیر کہ انتہائے مثنوی گوئیست نظم شدہ"

---

[1] اس کی تفصیل فارسی کلام کے سلسلے میں دیکھیے صفحہ ۲۶

[2] چار خلیفہ [3] کامل [4] آل بمعنی اولاد اور بیٹی کی اولاد کو خصوصاً بولتے ہیں۔
[5] رنگِ گل۔ رنگ سرخ، آل دراصل ایک سُرخ لکڑی ہے جس سے سرخ رنگ حاصل کیا جاتا تھا

اس مثنوی کا نام "فیرنگِ رنگیں" ہے جس میں ایک ہزار اشعار ہیں اور اپنے عشق کی کہانی نظم کی ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :ے

لکھوں پہلے حمد اپنے معبود کی | بنا جس سے ہے بود و نابود کی
و لے سوچ ہے یہ کہ حمدِ خدا | زبانِ بشر سے ہو کیوں کر ادا
مگر پھر یہ آتا ہے جی میں خیال | کہ خالق کے آگے نہیں کچھ مجال
بیان حمد مجھ سے تو کب ہو سکے | و لے وہ جو چاہے تو سب ہو سکے
اگر چاہے وہ میرا پروردگار | تو آنے لگے شاخِ آہو میں بار
جو وہ قدرت اپنی ہویدا کرے | تو ہر سنگ میں لعل پیدا کرے
اگر چاہے وہ خالقِ جز و کل | تو مہکے ہر ایک خار سے بوئے گل

---

(۵) مثنوی "بدھو گل فروش و وزیرن سبزی فروش یعنی کنجڑن کہ ہر دو خود ہا را در چاہ انداختہ مردند و ایں معاملہ در شاہ جہاں آباد بہ رؤیتِ چشم خود گزشتہ۔"

رنگین نے ۱۲۲۰ھ [1] میں شاہ جہاں آباد میں یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس مثنوی میں پانچ سو اشعار ہیں ابتدا اس طرح ہوتی ہے ے

الٰہی چاہ کی اس دل کو دے چاہ | بتا دے چاہ کی سیدھی اسے راہ
کہ تا یہ چاہ گر تجھ کو سراہے | ترے بن اور کو مطلق نہ چاہے
زباں پر لائے جب چاہت کا نام | بہ خیر آغاز سے ہو اس کا انجام
اسے کر عشق سے اپنے یہ ممتاز | کہ تجھ بن اس کا ہو کوئی نہ دمساز
مکانِ عشق از بس لامکاں ہے | رسائی عشق تک اس کی کہاں ہے
فلک سے عشق کا پایہ ہے برتر | رسائی عشق تک اس کی ہو کیوں کر

---

[1] دیباچہ "امتحان رنگین" انڈیا آفس لائبریری

اسے کر عشق کے معنی سے آگاہ | کہ رستہ چاہ کا سمجھے یہ گم راہ
اسے ایسا کر اپنا عاشقِ زار | کہ ہو تیرے سوا پھر کچھ نہ درکار
نہیں بن عشق لذت زندگی کی | بن اس کے زیست ہو شرمندگی کی
بغیر از عشق سب شی ہو فانی | یہ سچ ہو اور باقی ہو کہانی

---

(۶) "مثنوی بہ طرزِ مولوی جامی در بیان حکایات عجیب و غریب نظم شدہ" یہ مثنوی 'عجائب و غرائب رنگیں' ہو جس کی یہ حکایت رنگیں نے نقل کی ہو ؎

بادشاہ ایک نہایت تھا رحیم | حق نے تھا اس کو دیا خلقِ عظیم
حال مجنوں سے ہوا وہ آگاہ | کہ ہُوا پیچھے وہ لیلیٰ کے تباہ
اشتیاق اس کو ہُوا لیلیٰ کا | ایک دن اس کو بُلا کر دیکھا
بس کہ خوب اس کی نہ تھی کچھ صورت | بادشہ کو نہ ہوئی کچھ رغبت
بادشہ نے یہ کیا اس سے سوال | قیس ہو تیری ہی خاطر بے حال
تجھ سی کیا اور نہیں ہو پیدا | اس قدر کیوں ہو وہ تجھ پر شیدا
بادشہ سے یہ سخن سُن کر شتاب | دیا لیلیٰ نے اُلٹ کر یہ جواب
نہ زنی بار دگر حرف جنوں | بینیم گر تو بہ چشمِ مجنوں
جسے الفت ہو جس سے ای رنگیں | اس سے ہی دل کو ہو اس کے تسکیں

اس مثنوی کے اشعار کی تعداد رنگین نے نہیں لکھی۔

(۷) "مثنوی در ہندی بہ طرزِ نادرات در پند و نصیحت یک مصرع سادہ در مصرع دوم دستان ہندی یعنی کہاوت کہ در روزمرہ بر زبان ہر یک بر موقع تقریر آید" یہ مثنوی 'مثلثِ رنگیں' ہو۔ اشعار کی تعداد اور مثنوی کا نام ان اشعار میں بتایا:

بسم اللہ کو پہلے لکھ کر لکھ ای رنگیںؔ نعتِ پیمبر
پھر لکھ مدح چہار خلیفہ تھے جو نبیؐ کے یار خلیفہ
کہہ کے مناقب آلِ نبی کا بن تو محب اولادِ علیؑ کا
پھر آگے خاموش نہ رہنا مثنویاں ایک تین تو کہنا
ڈول ان کا پھر کچھ ایسا ہو ایک سے ایک کی طرز جُدا ہو
اِسم بھی ہاتھ آیا ترے ڈھب کا نام مثلّث ہو ان سب کا
اٹھا گہنہ کی نہ بھاری بہنگی سونے[1] سے ہی گھڑا[2] ون مہنگی
کر کچھ اب تا پاوے اُس دن تیل نکلتا[3] کب ہی تلو ل بن
مت کھا رزق کی خاطر چکر شکر خورے[4] کو ملتی ہی شکر
دُنیا کی سب شی ہی فانی کس برتے[5] پر تتا پانی

رنگیںؔ کی نظم کا یہ حصہ نہایت اہم ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ واقعی مثنوی گوئی میں انھیں ایسا کمال حاصل تھا جس کی مثال سوائے میر حسن کے اور کہیں نہیں مِل سکتی۔ لیکن میر حسن کا ایک طرز خاص ہی اور رنگیںؔ نے سات مختلف طرز کی مثنویاں کہی ہیں اگر ان کی تمام مثنویوں کو یکجا کیا جائے تو اشعار کی تعداد اور تنوّع کے اعتبار سے میر حسن بھی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس اعتبار سے رنگیںؔ کا شمار مثنوی گویوں کی صف اوّل میں کیا جاسکتا ہی۔

---

[1] اصل قیمت سے لاگت زیادہ یعنی روپلے کا سونا دس روپلے کی گھڑا ون [2] ہر چیز کا خرچ اسی میں سے نکالا اور اسی پر ڈالا جاتا ہی [3] تر مال کھانے والے کو تر مال ہی ملتا ہی ؎
حق شکر خورے کو دیتا ہی شکر (دولی) مجھ کو پہنچی اس شکر لب کی خبر
[5] کس بھروسے پر گرم پانی کی فرمائش یعنی کس حوصلے اور امکان پہ شیخی مارتے ہو۔

جنگ نامہ رنگین

رنگین کے کلام میں 'خمسۂ رنگین' کا پہلا حصہ جو 'جنگ نامۂ رنگین' کے نام سے موسوم ہے نہایت اہم ہے۔ رنگین کی یہ نظم ایک طویل بیانیہ ہے جس کی بنیاد تاریخی واقعات پر رکھی گئی ہے اور جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین اس قسم کی نظموں پر کیسی قدرت رکھتے تھے۔ یہ نظم ایک رزمیہ ہے اور اردو میں رزمیہ نظموں کی کمی کو دیکھتے ہوئے خاص طور پر مطالعے کے قابل ہے اس قسم کی نظموں کا تاریخی سلسلہ دکن کے ملک الشعراء نصرتی تک پہنچتا ہے جس نے علی عادل شاہ کی فتوحات 'علی نامہ' کے نام سے نظم کی ہیں۔ دکنی دور کا دوسرا مشہور رزمیہ کارنامہ کمال خاں کا 'خاور نامہ' ہے لیکن 'خاور نامہ' کی بنیاد محض داستان پر ہے اور سوائے حضرت علیؓ کے اس میں کوئی تاریخی شخصیت یا واقعہ مستند نہیں ہے۔ یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ ہندستان میں آئے دن کی جنگوں کے باوجود ایسی نظمیں کم ملتی ہیں جن میں رزمیہ کا انداز ہو۔ ان کی بہ جائے شہر آشوب اور نوحے بہ کثرت ملتے ہیں بلکہ ان جنگوں اور خوں ریزیوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ غزل تک میں نوحے کی کَے پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک سبب لوگوں کی ہزیمت خوردہ ذہنیت ہے۔ کیوں کہ رزمیہ نظم لکھنے کے لیے خیالات میں جوش اور بلند ہمتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں نہ صرف یہ کہ سپاہی جنگ لڑنے اور فتح پانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سرداروں میں بھی تنظیم کی کمی تھی اور عام طور پر امراء بہ جائے

جدوجہد کرنے کے راہِ عافیت تلاش کرتے تھے۔ سوداؔ کے قصیدۂ تضحیکِ روزگار،
اور میر تقی میرؔ کی بعض نظموں سے اس عہد کی عسکری حالت اور سپاہیانہ
جذبات کی کمی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں رنگین کا یہ جنگ نامہ
اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ اس میں بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لَو کی طرح ایک
لشکر اس طوفان کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے جو دکن سے مرہٹوں کی صورت میں نازل
ہوا تھا اور جو بہت بڑی حرکت اور اسباب کے ساتھ مل کر مغلیہ سلطنت کے زوال
اور انتشار کا باعث بنا۔ اس دَور میں انفرادی طور پر بعض سپاہی اور سرداروں
کی جدوجہد کا تذکرہ گرد و پیش کی تاریکی میں امید کی کرن نظر آتا ہے۔

یہ نظم رنگین نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھی۔ آخر کے دو اشعار حسب ذیل
ہیں؎[۵]

ہُوا ہے پچھتر کے یہ سن میں نظم	کیا ہے اسے پندرہ دن میں نظم
ہوئے پانچ سو شعر اس جا تمام	بس اب ختم کر لکھ کے تو والسّلام

رنگین کی ولادت ۱۱۷۰ھ میں ہوئی تھی اس حساب سے یہ جنگ نامہ
۱۲۴۵ھ میں نظم ہُوا اور معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پاٹن (۱۲۰۲ھ) کے بعد
تینتالیس سال گزر جانے پر بھی یہ واقعات رنگین کے سامنے تازہ تھے اور
اگر رنگین نے یہ نظم اس زمانے میں لکھی ہوتی جب کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا اور
تمام معرکوں کی یاد تازہ تھی تو شاید جذبے کی شدّت اور جذبات نگاری کے
اعتبار سے اس نظم کا پایہ اور بھی بلند ہو جاتا۔

اِس نظم کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے ضمنی طور پر اس عہد کے بہت
سے تاریخی واقعات اور اشخاص پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض
سرداروں کی جدوجہد کے باوجود بادشاہِ دہلی مرہٹوں سے اتنا خوف زدہ

---

[۵] قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری نمبر B 197

ہو چکا تھا کہ ان سے مقابلہ کرنا سودائے خام سمجھتا تھا اور ان حالات میں کہ بہت سے دوسرے رئیس اور راجے مرہٹوں سے تنگ آ چکے تھے یہ مہم محض اس لیے کامیاب نہ ہو سکی کہ مرہٹوں کی پشت پناہی بعض اور طاقتیں کر رہی تھیں جن میں فرانسیسی بھی شامل تھے۔ چناں چہ سندھیا مرہٹہ نے ایک فرانسیسی سردار ڈیباٹے کو چار پلٹنیں دے کر اس معرکے میں شریک ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ مرہٹوں کی فوجی طاقت بے شمار تھی اور تین لاکھ کی فوج میں دو لاکھ بارہ ہزار سوار شامل تھے نواب اسماعیل خاں کی فوج جس وقت گھیرے میں آئی ہے اس کی کُل تعداد چھ ہزار کے قریب تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نواب کی فوج جنگی چالوں سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھی۔ چناں چہ اس فوج نے مرہٹوں کا پیچھا کیا اور ان کے گھیرے میں آ گئی۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ مرہٹوں نے یہ خبر اڑائی کہ نواب مارا گیا اور نواب کے سپاہیوں کو چھ مہینے کی پیشگی تنخواہ دے کر اپنی طرف کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رنگینؔ کے بہ قول تقریباً پانچ ہزار آدمی ان کے لشکر کے مارے گئے۔ رنگینؔ کے اپنے دستے کے ایک سو پانچ سواروں میں سے صرف پانچ گھوڑے باقی بچے تھے اور پانچ سو سپاہیوں میں سے صرف ساٹھ جن میں سے چالیس زخمی تھے۔ اس طرح ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رنگینؔ صرف صاحبِ قلم ہی نہ تھے، صاحبِ سیف اور سپاہی بھی تھے ورنہ پانچ سو سواروں کی کمان ان کے سپرد نہ کی جاتی۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

پس از حمدِ حق اور نعتِ رسولؐ ۔۔۔ مری عرض یارو یہ کرنا قبول
کہ ہو جنگ نامہ جو یہ پڑھ کے شاد ۔۔۔ کرو فاتحہ خیر سے مجھ کو یاد
تم ایک مجھ سے نادر روایت سُنو ۔۔۔ مری آنکھ دیکھی حکایت سُنو

آگے چل کر کہتے ہیں کہ میں پاٹن کی لڑائی کا حال صحیح صحیح لکھوں گا۔

سن ہجری بارہ سو اور دو تھی یار ۱۲۰۲ | کہ ہریانے[1] میں فوج تھی بے شمار
اسمٰعیل خاں مردِ ہشیار تھا | وہ ہم سارے مغلوں کا سردار تھا

اسمٰعیل خاں نواب اولوالعزم انسان تھا۔ اس نے نجف گڑھ سے بیکانیر تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا اور دوسری طرف الور سے پانی پت تک سخاوت میں حاتم اور شجاعت میں رستم سے بڑھ کر تھا۔

ریاست کا فن خوب اسے یاد تھا | غرض اپنے ڈھب کا وہ اُستاد تھا

ہر شخص بے فکری سے کسی نہ کسی شغل میں لگا رہتا تھا کوئی کُشتی کے فن میں کوئی سپاہ گری میں۔ اس موقع پر رنگین نے جزئیات اور تفصیل نگاری سے کام لیا ہے جس سے اس عہد کے سپاہیانہ اور ورزشی مشاغل کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے مثلاً

کوئی پھینک کر لکڑی بن کر اچل[2] | اُٹھا سینہ چلتا تھا پنجوں کے بل
کوئی جھک کے کرتا تھا نالی کے ڈنڈ | کوئی لڑ کے کُشتی ہوا تھا گھمنڈ[3]
ہلاتا تھا لیزم[4] کوئی جھول جھول | کوئی جاتا گنتی تھا ڈنڈوں کی بھول
ہلاتا تھا مگدر ہی کے کوئی ہاتھ | کوئی ڈنڈ کرتا تھا بیٹھک کے ساتھ
کوئی پنجہ کرتا تھا کھا کے تاؤ | کلائی تھا کرتا کوئی بے لگاؤ
کوئی کرتا کشتی کے تھا داؤ پیچ | وہ گنتا تھا اپنے سے ان سب کو ہیچ
کسی سے کوئی شخص گجبیل کر | ہٹا پیچھے لے جاتا تھا پیل کر
کلائی کا تھا زور کرتا کوئی | شلنگیں[5] تھا میداں میں بھرتا کوئی

---

[1] پنجاب میں ایک مقام کا نام [2] جو اپنی جگہ سے چل نہ سکے [3] فربہ، جو فربہی کے باعث بدصورت معلوم دے [4] لیزم کی کثرت کرنا۔ لیزم: ایک قسم کی لوہے کی زنجیر والی کمان، پہلوان اور کثرتی آدمی اس سے جسمانی کثرت کیا کرتے ہیں [5] ڈگیں بھرنا، چھلانگیں مارنا۔

کوئی بانک[1] کے کر کے کہتا تھا پیچ   کہ سب کام ہیں بانک کے آگے ہیچ
غرض سب کو ہر وقت تھی ایک نوید   کہ شبِ قدر تھی رات اور دن تھا عید
سوا ان کے تھے شیخ، سید، پٹھان   ہزاروں ہی لشکر میں رستم جوان
سپاہی گری کے ہیں چھتیس بند   سو سیکھے تھے ہر ایک نے کر کر پسند

ایک دن لوگوں نے نواب سے کہا کہ اب ہند میں مرہٹوں کا زور ہوگیا ہے اور ہمارا چین اور اطمینان اٹھ گیا ہے لیکن اس کا ازالہ ناممکن نہیں ہے: ؎

زبردست ہے سندھیا گو پٹیل   تو ہم بھی نہیں ہیں کچھ اس کے ذیل

اگر اس کے پاس ملک زیادہ بھی ہے تو بھی ہم بالیقین چھین لیں گے ؎

وہ کافر ہے اور ہم مسلمان ہیں   بہ دل صاحبِ دین و ایمان ہیں
مغل ہم ہیں وہ مرہٹہ گنوار   جوان اپنے دس اور اس کے ہزار

چھوٹے بڑے افسر مرنے مارنے کو تیار ہوگئے تو آپ نے جواب دیا کہ مرہٹہ کو بادشاہ کا بہت سہارا ہے اس لیے وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتا: ؎

خزانے کی اس کو نہیں کچھ کمی   مطیع اس کے دو لاکھ ہیں آدمی
وہ کافر نہایت خبردار ہے   وہ دانا ہے عاقل ہے ہشیار ہے
تم اس کام میں مت شتابی کرو   مبادا کہ ناحق خرابی کرو

اگر بادشاہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھے تو پھر ہم اسے کھا جائیں پھر بادشاہ کو اس سلسلے میں ایک عرضی لکھی گئی کہ مرہٹہ کو مار کر پونا لے لیں ؎

کہا "گل محمد" کو عرضی یہ لے   شتابی سے جا بادشہ کو یہ دے

گل محمد دہلی روانہ ہوگیا۔ شاہ نے عرضی پڑھ کر کہا کہ نواب کو سودا ہے ایسا کرے گا تو خراب ہوگا۔ اگر سب راجے نواب کی مدد کریں تو کامیاب

---

[1] بنوٹ

ہو سکے گا۔ یہ بات سُن کر گل محمد چھٹے روز واپس آگیا۔

نواب نے جے نگر کے راجہ کو بادشاہ کا مشورہ لکھا۔ چوں کہ راجے بھی مرہٹے سے تنگ تھے اس لیے جودھ پور سے بیکانیر تک کے راجے سب نواب کی رائے سے متفق ہو گئے اور ستر ہزار سوار جمع کیے اور ان سے نصف پیادے بھی روانہ کر دیے۔

صندوق بھر بھر کے روپے بھیجے بے شمار ہاتھی اور اونٹ اور دوسو توپیں بھی جن میں جنگی کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ نواب کے اپنے سوار بھی تیس ہزار تھے۔ باون پلٹنیں ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ جب سب گنے گئے تو دو لاکھ کچھ ہزار تھے ؎

گِنا سب کو جب تب پیادے سوار　　ہوئے سارے دو لاکھ کتنے ہزار

نواب ان سب کو لے کر پاٹن پہنچے۔ سب لوگوں نے نواب سے یہی کہا کہ ہم یہیں لڑیں گے کیوں کہ یہ مقام ہماری سرحد کے قریب ہے ؎

یہ پاٹن[1] جو ہے سب ہی راجوں کا جی　　ہے سرحد ہمارے بھی یہ مُلک کی

آخر کوہ کے نیچے میدان میں لشکر کا ڈیرا لگا دیا۔ پاٹن کا کوہ فوجیوں کی پشت کی طرف تھا۔ جنگل دائیں طرف اور ندی بائیں طرف۔ اس کے بعد مرہٹہ کی داستان بیان ہوتی ہے۔ جن دنوں نواب اسمٰعیل خاں پاٹن میں تھے ان دنوں سندھیا بندرابن میں تھا۔ جب سندھیا نے نواب کے ارادے کے متعلق سُنا تو غضب میں آکر اپنی فوج روانہ کی اور فوج سے کہا کہ اس نواب کو ایسی سزا دو جس سے دوسرے بھی ڈر جائیں۔ مرہٹہ نے رانی خان بائی کو فوج کا سردار بنایا اور کہہ دیا کہ نواب کا نام تک نہ رہے۔ سندھیا مرہٹہ کا ایک سردار ڈبائی بھی تھا جسے چار کمپوڈے کر بھیجا ؎

---

[1] واقع قریب جے نگر

ڈیبائی فرنگی فرانسیسی تھا | ہیں انگریز اُنیس وہ بیس تھا

پہلے دن بندرابن کی فوج روانہ ہوئی۔ دوسرے دن مہابن کی رانی خان بائی نے چھے ماہ کی تنخواہ سب کو تقسیم کردی۔ اس کے بعد سوار دو لاکھ اور بارہ ہزار تھے۔ سب کمپو وغیرہ مل ملاکر تین لاکھ فوج ہوگئی۔ دونوں مخالف فوجوں کے درمیان چار کوس کا فاصلہ تھا۔ ماہ شوال کی چھٹی تاریخ کو لڑائی کا دن مقرر ہوا لڑائی کے دن دونوں مخالف گروہ کوہ کے نزدیک آکر مقابل ہوئے۔ لڑائی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرنگی ڈبائی نے اپنی چال بازی سے خوب کام لیا ؎

ہوئی جنگ کی صف جو آراستہ | تو نکلے جوانانِ نو خاستہ
قروٗلی سواروں میں ہونے لگے | دلوں سے کدورت کو دھونے لگے
کوئی اپنی بندوق بھرنے لگا | کوئی ہاتھ بھالے کے کرنے لگا
حریفوں سے کہنے لگا یوں پکار | کہ تم میں سے جو دل چلا ہو سوار
یہاں آئے گر سیر جینے سے ہو | کہ یہ پار اِنی اِس کے سینے سے ہو
لگا دیکھنے رُخ کماں کا کوئی | طرف اپنے خنجر کی جھانکا کوئی
کماں دار لا کان تک اپنی زہ | لگا کہنے یاروں سے ہنس ہنس کے یہ
مرے تیر کی چھوٹ پر کیجے دھیان | کہ گرتے ہیں ایک تیر میں دو جوان
کوئی اپنے پستول تھا تولتا | سپر پشت سے تھا کوئی کھولتا
قرابینؔ کو اپنی کوئی سنبھال | بڑھا آگے گر داغنے کا خیال
یہ کہتا چلا وہ کہ ایک دم میں جھٹ | ابھی دوں گا میں صف کی صف کو اُلٹ

؎ قرول: بندوقچی، وہ فوج جو لڑائی کے واسطے جگہ مقرر کرنے کو آگے جائے، سنتری، سپاہی ؎ قدیم املا ؎ (ت) اسم مونث: چوڑے منھ کا تفنگچہ جس میں بہت سی گولیاں بھر کر چھوڑتے ہیں۔ چھوٹی بندوق۔

میاں سے کوئی کھینچ تروار کو | جتا کر یہ کہتا تھا ہر یار کو
کہ اب تم سبھوں کو رجھاتا ہوں میں | ہنر آج اپنے دکھاتا ہوں میں
لگا کہنے یوں کوئی برچھے کو تول | کہ یارو ذرا دیکھنا آنکھیں کھول
کہ وہ مرہٹوں کا جو سردار ہے | یہ سینے کے وار اس کے یا پار ہے
وہ کٹ مرہٹوں کے جو آئے تھے سر | تو تودے پڑے تھے اِدھر اور اُدھر
اوچھلتے دھڑ اوس جا تھے بن سر کے یوں | کہ مچھلی تڑپتی ہے بن آب جوں
ہزاروں کی آ لب پہ لٹکی تھی جان | نہ ملتا تھا اک قطرہ پانی کا وہاں
ہر اک کو یہی دھیان تھا مجھ سے کام | بنے کوئی ایسا کہ ہو میرا نام
انھوں کی جو سنگیں تھی گولی بنی | تو وہ بیچ میں سے تھی پولی بنی
فرنگی نے حکمت کی کچھ چال سے | بھری تھی وہ پارے سنے اور رال سے
پھر اُن سب میں بارود بھر کر دو چند | کیے تھے شتابوں[1] کی بتی[2] سے بند
جہاں ٹپہ کھا پھوٹ جاتی تھی وہ | تو وہاں سینکڑوں کو جلاتی تھی وہ
وہ جس غول میں جا کے تھی پھوٹتی | وہ جانیں تھی اوس غول کی لوٹتی
چنوں کی طرح لوگ جاتے تھے بھن | ہر ایک جل کے جاتا تھا مر سر کو دھن
بس ان سے کسی کا جو چلتا نہ تھا | تو انساں نہ تھا وہ جو جلتا نہ تھا

مخالف کی طرف سے گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں

برستی تھیں اس طرح سے گولیاں | کہ جیسے برستے ہیں اولے گراں
نظر آتی رنجک[3] دھنوئیں میں تھی یوں | چمک جاتے جگنو ہیں ساون میں جوں
وہ ہوتی تھیں یوں توپیں آتش فشاں | کہ جوں برق ہو گہ عیاں گہ نہاں

---

[1] شتابا: وہ کاغذ جس کو بارود میں تر کر کے خشک کرتے اور فلیتہ بارود کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ بندوق چھوڑنے کی بتی [2] فلیتہ جس سے آتش بازی میں آگ دیتے ہیں [3] بارود

بنا تھا دھنواں ایسا ابرِ سیاہ — کہ آتے نظر وہاں نہ تھے مہر و ماہ

وہ گولے جو تھے چلتے زنجیر[1] کے — تو جاتے صفوں کو تھے وہ چیر کے

پس انسان و حیواں درخت اور سنگ — قلم اون سے ہوتے تھے سب بے درنگ

جو کچھ سامنے ان کے آتا تھا یار — قلم ہو وہ جاتا تھا مثلِ چنار

برستے تھے پھر چھرّے یوں بالیقیں — گرے ٹڈّی اوپر سے جوں بر زمیں

کڑکتے تھے اس جنگ میں بان[2] یوں — گرجتا ہو بادل میں ہو رعد جوں

کڑک بخش کا کنپو ایک تھا نجیب — وہ پہنچا ڈبائی کے جا کر قریب

ڈبائی جو اس پر پلا کچکچا — تو وہ کنپو یک لخت اٹھا بلبلا

یہ کہہ بھیجا نواب سے پھر شتاب — کہ لیجے خبر اب نہیں ہم میں تاب

نواب یہ سُن کر سواروں کو لے کر ہاتھی پر سوار ہو کر چل پڑا ڈبائی کے کنپو کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا اور بہت سے مرہٹے مارے گئے۔

مرے بے شمار ان کے جتنے جواں — شہادت کو نصف ان سے پہنچے یہاں

مرہٹے میدان سے ہٹ کر جانے لگے تو نواب بھی گھڑی دن باقی رہے اس جگہ سے لوٹا اور اپنے شہیدوں کو دفن کیا۔ مجروحین کو مرہم پٹی کا حکم دیا۔ مرہٹوں نے بھی صبح کو لاشیں جنگل میں جلائیں۔

مرہٹوں نے ہوشیاری کی کہ پیچھے ہٹتے چلے گئے اور نواب اور نواب کے سوار ان کے پیچھے ہو لیے جب چار کوس بڑھ گئے تو مرہٹوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نواب کے ساتھ چھ ہزار سپاہی تھے ۔

یکایک لیا اس طرح ہم کو گھیر — دبا صید کو جس طرح لیوے شیر

سواروں میں باہم لگی ہونے جنگ — ہوئی فوج نواب لڑنے سے تنگ

---

[1] زنجیری یعنی ایک قسم کا زنجیر دار گولہ [2] ایک قسم کی ہوائی جو پچھلے زمانے میں لڑائیوں میں دشمن پر چھوڑا کرتے تھے۔

ڈبائی کا کنپو بھی یہیں آگیا اور پھر لشکر پر حملہ بھی کر دیا نہ اُدھر سے کوئی لشکر کی طرف جا سکتا تھا نہ وہاں سے یہاں کوئی آسکتا تھا۔ مرہٹوں نے کمپو میں خبر پہنچا دی کہ تمھارا نواب مارا گیا تم ہم سے نہ لڑو اور روپے لے کر ہمارے نوکر ہو جاؤ۔ کمپو کے سواروں نے اپنی بدحواسی کی وجہ سے اس بات کو تسلیم کر لیا۔ چوں کہ نواب کی طرف سے نا امید ہو چکے تھے ؎

ڈبائی گیا ان کو ساتھ اپنے لے
وہیں چھ مہینے کی تنخواہ دے

جو سپاہی کمپو سے ٹوٹ گئے تھے انھیں سب کو لوٹ لیا ؎

یہاں کھیل لشکر کا پرچھا[1] ہوا
رہے ہم تو وہاں جنگ میں مبتلا

رہے مارتے اور مرتے رہے
ہم ایک رات دن جنگ کرتے رہے

بتاؤں تمھیں کیا کہ کتنے موئے
نہ آئے وہ گنتی میں جتنے موئے

شہید اس طرف کے ہوئے پانچ ہزار
کیا اس طرف کا جو ہم نے شمار

جب آٹھ سو باقی رہے تو اس گھیرے سے نکل جانے کی سوچنے لگے۔ کہ اب کل لڑیں گے جب ڈیرے پہ پہنچے تو دیکھا کہ لشکر کا نام ونشان بھی نہیں کسی نے نواب سے آکر کہا کہ مرہٹہ سب کچھ لوٹ لے گیا تو نواب نے سر پیٹ لیا۔ رنگین کہتے ہیں ؎

کہ اس کا تھا دامن مرا ہاتھ تھا
یہاں تک میں نواب کے ساتھ تھا

روانہ ہر ایک اس مکاں سے ہوا
جدا ایک سے ایک وہاں سے ہوا

آدھی رات تھی اندھیرا گھپ تھا سب اپنے اپنے رستے پر بھاگتے چلے گئے۔ رنگین کے ایک سو دس گھوڑے تھے کچھ لوٹ لیے گئے اور کچھ مارے گئے۔ ان کا رسالہ پانچ سو سواروں پر مشتمل تھا۔ گھوڑے صرف پانچ بچے تھے اور جوان پانچ سو میں سے کل ساٹھ۔ جن میں چالیس زخمی تھے۔

---

[1] پرچھا ہونا : فیصلہ ہونا ، بھیڑ چھنٹنا

اٹھا کر شب و روز دو دن الم سب آپہنچے گر پڑ کے جے پور میں ہم
غرض پہنچے جے پور میں جس وقت آ یہ راجہ نے نواب سے تب کہا
کہ کھائی نہیں تم نے مطلق شکست لڑانے کا پھر کیجیے بندوبست
دغا میں تمھاری سپہ آگئی فریب ان کے میں آکے گھبرا گئی

راجہ نے خواصوں کو حکم دیا کہ نواب کو جس چیز کی ضرورت ہو مہیا کردو

سلاح خانہ و فیل واسپ وشتر لگا توپ خانے سے تا لعل و دُر
قناتیں بڑی اور ڈیرے بڑے ہوئے جا کے جے پور کے باہر کھڑے

سامان اتنا مہیا کر دیا گیا کہ نواب پچھلے تمام غم بھول گیا اور خوب عیش کرتا رہا۔ ایک دن راجہ کو خبر پہنچی تو راجہ نے نواب سے جودھ پور جانے کو کہا اور کہا کہ وہاں کا راجہ راٹھور ہے تمھیں خوب مال وحشم سے خوش کرے گا اور مرہٹوں کو یقیناً شکست دے گا۔ نواب تو جودھ پور چل دیے اور رنگین نوکری چھوڑ کر بھرت پور چلے آئے ؎

شفیق اپنا راجہ کو پہچان کے بھرت پور میں نوکر ہوئے آن کے

اب ایک شنیدہ داستان رنگین بیان کرتے ہیں۔ کہ نواب اسمٰعیل جب جودھ پور روانہ ہوئے تو ہندو مسلمان پیادے ہزاروں تھے جودھ پور کے راجہ نے ان کی طرف کچھ التفات نہ کیا تو نواب نے ؎

کیا وہاں سے جو بھیلواڑے کا عزم مقرر کیا کو لیواڑے کا عزم
سفر جو ہوا بھیلواڑے کا تھا تو موسم گلابی سا جاڑے کا تھا
گئے متصل کو لیواڑے کے جب تو ایام گزرے تھے جاڑے کے تب
اٹھا کر یہ سب رنج دن رات کے یہ جا متصل پہنچے گجرات کے

اس داستان کو یہیں ختم کر کے اپنی بھرت پور کی کہانی شروع کرتے ہیں۔

غرض ہم بھرت پور میں تھے دو برس — نکالی ہر ایک اپنے دل کی ہوس
وہاں سے جو پھر دانا پانی اُٹھا — تو انس جا سے مَیں لکھنؤ کو گیا
رہا وہاں بڑی ہی فراغت سے مَیں — تھا آسودہ ہر ایک آفت سے مَیں
رہا نو برس شاہ زادے کے ساتھ — پہنچتا رہا وہاں ہر ایک شئی کو ہاتھ
جب آخر گیا آصف الدولہ مر — وہاں سے پڑا مجھ کو کرنا سفر
گیا وہاں سے پھر مرشد آباد میں — رہا ہو کے یک چند وہاں شاد مَیں
غرض ڈھاکے بنگالے کو دیکھ یار — رہا چھو برس آن کر گوالیار
وہاں کنھڈوجی[1] ایک سردار تھا — وہ سب مرہٹوں میں نمودار تھا
رکھا مجھ کو اس نے بڑے غور سے — مری قدر کی اس نے ہر طور سے
بنا مجھ سے جو کام پر کام خوب — ہوا میرا اس ملک میں نام خوب
کیا مجھ کو نوّاب کنپو[2] دیا — غرض مجھ کو مختار گھر کا کیا
وہ عاشق میری ذات کا تھا فقط — کیا پھر مجھے صاحب دستخط
ادھر "کونچ" سے لے کے "جھانسی" ملک — ادھر "دیوگڑھ" اور "ہانسی" تلک
اٹیر اور بھنڈ اور گجرہ تمام — سند لکھ دی اس ملک کی میرے نام
کہ کنپو کی تنخواہ اس میں سے لے — جو باقی بچے تجھ سے وہ مجھ کو دے
مہیّا جو یہ مجھ کو اسباب تھا — کہا تا مَیں اس جا پہ نوّاب تھا
زمانہ موافق ہُوا ایسا آ — کہ جو مَیں نے چاہا وہی ہو گیا
غرض چھو برس تک یہ اوقات تھی — کہ بنتی ہی تھی مجھ سے جو بات تھی

پھر یکایک رنگین کی طبیعت میں انقلاب پیدا ہوا تو وہ اس دنیا سے بیزار ہو گئے اور دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس نے کسی سے وفا نہیں کی جیساں چہ کہتے ہیں

---

[1] خاندوجی [2] کمپو : نوج، متعدد پلٹنوں کا مجموعہ۔

کیومرثؔ، کیخسرو، افراسیاب   ہوئے اس کے ہاتھوں میں کیسے خراب
فریدوں سے لے کے تا کیقباد   تجھے حال ان سب کا ہی خوب یاد
گئے پھنس جو گردش ہیں افلاک کے   وہ سب گھس گئے پیٹ میں خاک کے
کسی کا بھی باقی ہو ان سے نشاں   کہ تجھے کون وہ اور ہیں اب کہاں
پھر اس پر تو ہرگز سمجھتا نہیں   نہ کر فکر دنیا کا کر فکرِ دیں
اگر تو نہ اس سے اٹھا دے گا ہاتھ   تو پھر چھوڑ دے گی یہی تیرا ساتھ
یہ ہی بے وفا اس سے الفت کو توڑ   نہیں تو یہی جائے گی تجھ کو چھوڑ
جو عورت کسی مرد کو دے طلاق   تو یہ بات ہی بس نہایت ہی شاق
یہ ہی لطف جو مرد اسے چھوڑ دے   اگر حور ہو اس سے منھ موڑ دے
یہ سن دل سے میں نے دیا سب کو چھوڑ   لیا ساری ثروت سے منھ اپنا موڑ
برس تیس اس پر گئے ہیں گزر   نہیں حشمت و جاہ وہ دھیان پر
کسی شے کا ہرگز نہ پابند ہوں   گزرتی ہی جیسے میں خورسند ہوں
نہیں ہیں یہ کچھ اضطراری امور   یہ میرے تو ہیں اختیاری امور
نہیں بیٹھا میں پکڑ اک زمیں   کبھی ہوں کہاں اور کبھی ہوں کہیں
میں ایک جا پہ دل کو لگاتا نہیں   مجھے رہنا ایک جا کا بھاتا نہیں
پر اب ہاتھ سے ہی مرا بس گیا   کہ باندے میں ہوں آن کر پھنس گیا
یہاں کا ہی نواب ایک طرفہ چیز   نہایت وہ رکھتا ہی مجھ کو عزیز
مصاحب ہیں وہ اس کے جتنے رفیق   وہ سب جان و دل سے ہیں میرے شفیق
خواص ان میں ایک شمشیر خاں   کہ میں جن کی خاطر ہوں رہتا یہاں

۱؎ کیومرث: معرب ہی گیومرت کا جو کاف فارسی اور تائے فوقانی سے ہی۔ ترکیبی معنی اس کے مالک زمین کا اس لیے کہ گیو بمعنی زمین کے ہی اور مرت بمعنی پیشوا، یہ نام ہی ایک بادشاہ کا جس نے پہلی پہل دنیا میں بادشاہی کی ہی۔

میں الفت میں ان کی گرفتار ہوں	نکلنے نہیں پاتا ناچار ہوں
بن آتی نہیں کچھ نکلنے کی بات	مجھے ہے یہی فکر دن اور رات
برس دو سے اس جا پہ پابند ہوں	نہیں پابند ہوں لیک خورسند ہوں
کسی کی مجھے کچھ جو پروا نہیں	تو آنکھوں میں کوئی سماتا نہیں

آگے چل کر رنگین کہتے ہیں کہ زیادہ باتیں کرنا اچھا نہیں زبان کو بند ہی کرنا چاہیے۔ پھر کہتے ہیں ؎

جو کرنا ہے تو نظم تصنیف کر	پر اس میں تو اپنی نہ تعریف کر

نظم کے آخر میں رنگین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بڑی مایوسی اور افسردگی ہے۔ یہ بالکل قدرتی ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچھتّر سال کی ہو چکی تھی اور چھ سال بعد (۱۲۵۱ھ) میں ان کا انتقال ہو گیا اکیاسی سال کی طویل عمر میں انھوں نے ہندستان کی تاریخ کا ایک نہایت پُر آشوب دَور دیکھا تھا جو مسلسل زوال، انتشار اور افتراق کا دَور ہے انھوں نے دُنیا دیکھی تھی بڑے بڑے شہروں کا سفر کیا تھا۔ سیکڑوں امیروں اور رئیسوں کے متوسّل رہے تھے اور ان سب کے عروج و زوال کو نہایت قریب سے دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنی جوانی بڑی رنگینی، آوارگی اور عیاشی میں گزاری تھی۔ عمر کی اس آخری منزل پر پہنچ کر انھیں یقیناً اپنی بے راہ روی پر کچھ ندامت بھی ہوتی ہوگی۔ یہ اشعار رنگین کی انھیں کیفیات اور جذبات کے ترجمان ہیں اس لیے ان میں تاثیر اور سوز بھی پیدا ہو گیا ہے۔

'خمسۂ رنگین' کا تیسرا حصّہ 'نصابِ رنگین' ہے جس کا دوسرا نام نصابِ ترکی بھی ہے اسے رنگین نے ۱۲۳۵ھ میں لکھا۔

ہے یہ تاریخ اس کی اے عالی جناب	کہ دی اب رنگین نے ترکی کی نصاب

اس کا موضوع جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ترکی زبان کا لغت ہے۔ اُردو میں غیر زبانوں کے ایسے لغت جن سے اُردو جاننے والے یہ زبانیں سیکھ سکیں بہت قدیم رواج ہے۔ اس سلسلے میں عام طور پر حضرت امیر خسرو کو اس فن کا موجد اور خالق باری کو پہلا اُردو فارسی لغت بتایا جاتا ہے اگرچہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے لیکن نویں اور دسویں صدی ہجری میں بہت سی ہندی فارسی لغات لکھی گئی ہیں۔

ہندی فارسی کے لغات تو بہ کثرت موجود ہیں لیکن ہندی، ترکی کے لغات بہت ہی کم ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ترکی کا استعمال نہ تو فارسی کی طرح عام ملکی، سرکاری، علمی یا ادبی زبان کی طرح ہوتا تھا اور نہ ترکی نصاب میں شامل تھی۔ ترکی بولنے والے ترکی نسل کے چند خاندان تھے جو ہندستان میں آباد ہو گئے تھے اور وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی مادری زبان چھوڑ کر فارسی یا ہندی اختیار کر رہے تھے۔

مختلف زبانیں استعمال کرنے کا شوق ہمارے اکثر شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے لیکن ترکی کا نمونہ بہت کم ملتا ہے۔ رنگین کی اس تصنیف سے ایک طرف ان کی طبیعت کی ایجاد اور اُپج کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف لسانیاتی اعتبار سے ان کی اہمیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس منظوم لغت میں پانچ سو اشعار ہیں اگرچہ رنگین اس سے زیادہ لکھنا چاہتے تھے لیکن کچھ اپنی مصروفیت اور کچھ احباب کے تقاضے سے صرف پانچ سو اشعار پر اکتفا کیا ہے۔

اس میں بھی دیباچہ نہیں ہے۔ کتاب حمد سے شروع ہوتی ہے۔ حمد کے ستره

شعر ہیں۔ شروع ؎

حمد کا مجھ سے بیاں کب ہو سکے | اور جو وہ چاہے تو پھر سب ہو سکے
پہنچے وہم و فہم وہاں مقدور کیا | خواہش اس کی ہو تو پھر ہی دور کیا

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

غش ہو وہ خالق مراد و بات پر | دھیان اس کا سب کی ہو اوقات پر
شرک پر کرتا ہو وہ غصہ دو چند | اور عجز اس کو نہایت ہو پسند

اس کے بعد نعتِ رسول ہو ؎

وہ محمدؐ جو رسولِ پاک ہو | جس کے حق میں معنیٔ لولاک ہو

پھر مناجات بہ جنابِ باری جلِّ شانہٗ شروع ہوتی ہو۔ رنگین اپنے گناہوں کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

کٹ گئی لہو و لعب میں زندگی | ہو مجھے اس بات کی شرمندگی
غم رہا اپنے مجھے اوقات کا | وِرد تھا میرا یہی دن رات کا
فکر تھا پیدا کروں یہاں نام کچھ | اس میں بن آیا نہ وہاں کا کام کچھ
تو نہ پکڑے ہاتھ گر میرا وہاں | پھر بتا میرا ٹھکانا ہو کہاں

آگے چل کر دعا مانگتے ہیں ؎

جاں کنی میری مجھے آسان ہو | اور ثابت دولتِ ایمان ہو
بچ رہوں میں پھر عذابِ قبر سے | یعنی ایمن ہوں زمیں کے جبر سے

یہ کل ۲۱ شعر ہیں۔

اس کے بعد عنوان " در تمہیدِ کلام " ہو۔

رنگین کہتے ہیں بے کاری کی وجہ سے میں تنگ آ کر کوئی شغل چاہتا تھا۔ ایک رات خواب دیکھا ؎

میں نے دیکھا خواب میں ہو ایک کاں حضرتِ والد میرے بیٹھے ہیں وہاں
ان سے میں نے یوں کہا دعیں خواب دل میں ہو ترکی کی میں لکھوں نصاب

آگے چل کر کہتے ہیں اس ترکی نصاب کے لکھنے سے میں موردِ تحسین بھی ہوں گا اور میرے خاندان میں ترکی زبان بھی چمک اٹھے گی ؎

معدودں کی اس میں گنجایش نہ تھی میں نے اس خاطر نہیں تکلیف کی
آ سکے جو وہ کیے میں نے بیاں اس میں بالکل کی تھی گنجایش کہاں
پانچ سو ہیں شعر بس اس کے تمام اور رنگین کی نصاب اس کا ہو نام
حرف جو آتے نہیں ترکی میں جان وہ بتا دوں تا رکھے تو ان پہ دھیان
حرف وہ ترکی میں جو آتے نہیں ترک جن کو بر زباں لاتے نہیں
سو وہ تو ہیں گن لے تا و حا و صاد زا[1] و طا و ظا و عین و فا و ضاد
اصل جو ترکی ہو ترکوں کی زباں سو وہ رنگیں تین ہیں کل ترکیاں
پہلے ایک ترکی تو ہو توران کی اور ہو ترکی دوسری ایران کی
رومیوں کی تیسری ترکی ہو یار ان سوا چوتھی نہیں ہو زینہار
ہاں مگر آمیز انھیں کی ہو تو ہو لفظ پر ہوں گے یہی بولے گا جو
تھا مجھے تینوں زبانوں پر جو ربط نظم کرنے میں رہا مجھ کو نہ ضبط
ملتی جلتی سب زبانیں آ گئیں اپنی اپنی جا پہ بندش پا گئیں
فرق اس میں ہو یہ کیا امکان ہو دیکھ لے یہ گوشے یہ میدان ہو
جس کا تو چاہے اٹھا اس کا مزا اور جو ہیں تجھ کو مطلب ان سے کیا
جس کے چاہے لفظ اس کچھ چھانٹ لے جس کا جس کو سمجھے اس میں بانٹ لے
ہو یہ تاریخ اس کی اے عالی جناب کہہ دی اب رنگین نے ترکی کی نصاب
اب مزاج سامعیں گر ہو رجوع تو نصاب آگے سے رنگیں ہو شروع

---

[1] قلمی نسخے میں "ذ" ہو، لیکن "ز" ہونی چاہیے

لغت کے ابتدائی اشعار یہ ہیں : ؎

ایزی اور اوغان ہو یعنی خدا اور اوغاں کو برسانگوجی ہو مصطفےٰ
ایر کا لیک ہو بادشاہ اوتقائی وزیر تارے ایلدوز آئی ہو ماہِ منیر

باقی لغات پر مشتمل اشعار کی تعداد حسب ذیل ہو ؎

ردیف	الف	۹۳ شعر
"	البا	۲۸ "
"	الپا	۵ "
"	التا	۴۳ "
"	الجیم	۵ "
"	الچا	۱۷ "
باب	الخا	۲ "
"	الدال	۹ "
"	السین	۲۷ "
"	الشین	۴ "
"	العین	۲ "
"	القاف	۴۳ "
"	الکاف	۲۵ "
"	اللام	۲ "
"	المیم	۹ "
"	النون	۲ "
"	الواؤ	۲ "
"	الہا	۷ "

باب الیا ۴۵ شعر

باب الیا کے پینتالیسویں شعر کے بعد رنگین کہتے ہیں :-

یہاں تلک تو کہہ چکا ئیں مفردات اب میرے جی میں ہے ای رنگیں یہ بات
یعنی کچھ شعر اب مرکب مَیں کہوں تا ہر ایک کے وردِ تحسین ہوں
لیکن اس ڈھب سے کچھ ان کا ہو بیاں جس سے عقدے سارے ہو جائیں عیاں

اس کے بعد ۲۶ شعر مرکبات پر مشتمل ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:-

آت دی پیتر پھرا گھوڑے کو تو آت الیب یارلے کے جا گھوڑے کو تو

اس کے بعد ۱۳ شعر ایسے ہیں جن کا پہلا مصرع ترکی ہے اور دوسرا ہندی۔
چناں چہ رنگین خود کہتے ہیں :-

اب کچھ ایسے فقرے ای رنگیں لکھو ایک مصرع ترکی ایک ہندی میں ہو

پہلا شعر ملاحظہ ہو:-

یا تا من تو پراق کا دوشک نی سال سوؤں گا ئیں خاک پر توشک کو ڈال

خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:-

تھا ارادہ یہ مرا بے اختیار یعنی شعر اس کے لکھوں ئیں ایک ہزار
پر زمانے نے مجھے فرصت نہ دی اس سبب سے جلد ئیں نے ختم کی
اور تھا یاروں کا تقاضا بھی کمال مختصر پر اس لیے آیا خیال
پانچ سو بیتیں ہوئیں اس کی تمام ختم اسے کرتا ہوں ئیں اب والسلام

حکایاتِ رنگیں

مجموعہ 'شش جہتِ رنگیں' میں ایک مثنوی 'حکایاتِ رنگیں' کے نام سے شامل ہے جس کے مضامین کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ 'خمسۂ رنگین' کا آخری اور پانچواں حصہ بھی اسی عنوان سے ہے اور اس میں بھی مختصر حکایات نظم کی گئی ہیں۔ مثنوی کا ابتدائی حصہ 'شش جہتِ رنگین' کی حکایات سے مطابقت رکھتا ہے چناں چہ حمد و نعت کے بعد اس میں بھی رنگین نے بنارس کے سفر اور شریکِ سفر خواجہ محمود اور شیریں بیگ کا ذکر کیا ہے اور یہ کہ خواجہ محمود کس طرح الفو نام ایک طوائف پر عاشق ہو گئے تھے۔

'حکایت راجپوت و مرد مسلمان پوربی' ؎

راجپوت اور ایک مسلماں دوست تھے — گو وہ تھے دو مغز پر ایک پوست تھے
تھے لطیفہ بولنے میں دونو طاق — بولنا ہر ایک کو تھا اون سے شاق
راجپوت ایک روز سبزی[1] چھان کر — یوں لگا کہنے اسے ارمان کر
حیف ہے سبزی نہیں پیتا ہے تو — کیا جہاں میں بے مزہ جیتا ہے تو
جس کسی کو بنگ سے رغبت نہیں — مطلق اس کو زیست کی لذت نہیں
بولا وہ سُن کر یہ اس کی گفتگو — بھنگ پیوے وہ کوئی بھنگی ہو جو

---

[1] سبزی: بھنگ

اس کے منھ سے بات یہ سُن کر شتاب | اس نے اس کو یہ دیا رنگیں جواب
گوشت میں جھٹکے کا اب سے کھاؤں گا | جھٹکا اپنے رُو بہ رُو کرواؤں گا
بات یہ سچ ہی مجھے آیا خیال | جو کہ بھنگی ہوئے کھاوے وہ حلال[1]

اس مجموعے میں بعض حکایات رکیک بھی ہیں -

مثنوی کی تاریخِ تصنیف نظم نہیں ہوئی ہی۔ البتہ اشعار کی تعداد آخری بیت میں پانچ سو بتائی ہی ؎

پانچ سو بیتیں ہوئیں اس کی تمام | ختم اسے اب کر تو رنگیں والسلام

انڈیا آفس والے قلمی نسخے کی تاریخِ کتابت ۱۲۴۸ھ ہی جو رنگیں کی وفات سے تین سال پہلے کا زمانہ ہی۔ یہی زمانہ مثنوی کی تصنیف کا قریبی زمانہ قرار دیا جاسکتا ہی ؎

---

[1] بھنگی کو حلال خور بھی کہتے ہیں - حلال خور یعنی حق حلال کی کمائی کھانے والا -

سبع سیارۂ رنگیں

'سبع سیارۂ رنگیں' کا پہلا حصہ جو 'تصنیفِ رنگیں' کے نام سے مشہور ہی ایک مختصر منظوم رسالہ ہی جو دو سو ساٹھ[5] اشعار پر مشتمل ہی اس کے شروع میں نہایت مختصر دیباچہ نثر میں ہی جس میں رسالے کے ماخذ اور سببِ تصنیف کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہی ۔

"ایک رسالہ جناب حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ یعنی والد جناب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ نے واسطے اپنی آل و اولاد کے بطور وصیت کے فارسی نثر میں لکھا تھا۔ دریں ولا بندے نے اسے زبانِ ریختہ میں نظم کیا ہی۔ سو وہ اس بیان میں ہی کہ لڑکا لڑکی جس روز سے کہ پیدا ہوں اور بوڑھے ہوکر مرجائیں تو ان کے وارث ان سے اس عرصے میں رسم و رسوم بے ہودہ کو ترک کرکے کیا کیا معاملہ برتا کریں کہ وہ شرع شریف کے بموجب ہو اور وہ خود بھی بہ حدِ بلوغ پہنچ کر کس طور سے اوقات بسر کیا کرے کہ قیامت میں ماخوذ نہ ہو ۔ اللہ ہر ایک کو توفیق دے کہ اس پر دھیان دھرے اور میرے حق میں دعائے خیر کرے" شروع ہی ؎

یا الٰہی تو مجھ کو دے توفیق ۔۔۔ نیک توفیق ہوئے میری رفیق
تا بنے مجھ سے دین کا کچھ کام ۔۔۔ جی کو تسکیں ہو دل کو ہو آرام

نصیحتوں کا نمونہ حسبِ ذیل ہی :

"بیان رسم و رسوم بے ہودہ کے جو مشہور ہیں"

---

[5] دو سو اور ساٹھ اس کے ہیں اشعار ۔۔۔ بیش و کم ایک بھی نہ ہو زنہار

خلق میں ہے یہ رسم جس کا اسم — سو وہ ہے رسم ایک ہزاروں قسم
رسم ہو خوب یا کہ ہووے بری — پھیر دے تو گلے پہ سب کے چھری
کیوں کہ خرچ اس میں یا تو ہوگا مال — یا ہرج ہوگا تجھ کو اس کا کمال
ہیں بہ ظاہر یہ دو ترے نقصان — نفع کی بات ہے اسے تو مان
کر ارادہ پہلے تو تقوے کا — بن تو پھر پیرو اہلِ تقوے کا
اپنے تقوے سے کر بسر اوقات — لیک تقوے کا دھیان رکھ دن رات
میرا مذہب ہے مذہب حنفی — سب پہ روشن ہے یہ جلی و خفی
چاروں مذہب کو جانتا ہوں حق — لیک بھاتا ہے مجھ کو اس کا نسق[1]
سو میں اس کا بیان کرتا ہوں — خوب سا چھان چھان کرتا ہوں
پر تو سننے کے کان پیدا کر — دین و دنیا کی مان[2] پیدا کر
جب تو دار البقا کو جاوے گا — ثمر اس کا وہاں تو پاوے گا
کر سب احکام شرع کے تو قبول — تا کہ خوش تجھ سے ہوں خدا و رسول
اب سن احکامِ شرع کا تو بیان — تا کہ ہو جائیں سب وہ تجھ پہ عیاں

”بیچ بیان اس کے کہ جب لڑکا لڑکی پیدا ہو تب اس وقت کیا کیا کرنا چاہیے“

جس کے پیدا ہو آل یا اولاد — اس کو لازم ہے وہ رکھے یہ یاد
دے اذاں گوشِ راست میں اک بار — چپ میں تکبیر کو کرے اظہار
سات دن تک کرے کچھ اور نہ ذکر — ساتویں دن کرے عقیقے کی فکر
ہے جو لڑکا تو بکرے دو وہ لے — ذبح للّٰہ ان کو وہ کر دے
اور جو لڑکی ہے تو ہے یوں نیک — بکری بازار سے منگا دے ایک

---

۱ رونق، دستور ۲ عزت

نیک ثابت ہوں اس کے ناک اور کان　　کسی عضو اس کے میں نہ ہو نقصان
احتیاط اس کی مثل قربانی　　سنت انسان پر ہے اے جانی
شرط قربانی میں ہیں جو احکام　　انھیں شرطوں کو اس میں کر تو تمام
نر و مادہ کا کچھ نہیں ہے فرق　　کر تو اپنے چھرے کو خوں میں غرق
پہلے سنت عقیقہ تھا یہ صلاح　　اب اسے جان رکھ کہ ہے یہ مباح
گر تو اس کو کرے تو ہے یہ خوب　　نہ کرے تو نہیں ہے کچھ معیوب
اس کے سر پہ سے اتریں جتنے بال　　وزن چاندی کے ساتھ انھیں کر ڈال
دے فقیروں کو مستحب[1] اے جان　　کچھ یہ واجب نہیں ہے کہنا مان

"بیچ بیان بچہ کے اچھا نام رکھنے کے اور ذکر چھٹی کا"

ہو چکے جب کہ سب عقیقے کا قسم　　سوچ کر تب رکھ اس کا اچھا اسم
یعنی اچھوں کے نام پر ہو نام　　پر نہ ہو اس میں لفظ بخش و غلام
اور جو نام خدا کے ہو ہمراہ　　تو نہایت ہی خوب ہے واللہ
حق یہ بیٹے کا باپ پر ہے یقیں　　ہے یہ بے شبہ اس میں فرق نہیں
بس چھٹی ہے یہی شریعت کی　　بات کہہ تجھ سے دی حقیقت کی

"بیچ بیان سال گرہ کے"

ہے یہ بے ہودہ کرنی سال گرہ　　مت کر اس کو یہ ہے وبال گرہ
گھونگرو بچوں کے پاؤں میں مت ڈال　　دے گا شیطان اس پہ ناچ کی تال

"بیچ بیان مدت دودھ پلانے لڑکا لڑکی کے"

اور جو تو چاہے دودھ ان کا چھڑائے　　تو یہ لازم ہے اس سے تو نہ بڑھائے

---

[1] یہ فعل عبادت کا جس کا ثواب رسول اکرم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لڑکا لڑکی کا ایک ہے احکام — کہ پئیں پونے دو برس وہ مدام
یا پئیں دو برس تلک وہ شیر — ہے کتابوں میں یوں کیا تحریر
شادی اس کی بھی کچھ نہیں ہے ضرور — دل سے کر ایسی واہیات کو دُور

'بیچ بیان رسم بسم اللہ کے کہ جو بچوں کو پڑھاتے ہیں'

پانچویں سال میں گدا اور شاہ — طفل کو ہیں پڑھاتے بسم اللہ
شرع میں اس کا کچھ بیان نہیں — میں بیاں کیا کروں زبان نہیں
لیک مشہور خلق میں ہے یہ رسم — کرتے شادی ہیں اس کی ہر ہر قسم
شرع میں اس کو کہتے ہیں اسراف — بس تجھے کہہ دیا یہ میں نے صاف
کچھ کتابوں میں اس کا ذکر نہیں — اس لیے اس کی مجھ کو فکر نہیں
ہاں وہ جب طفل پڑھ چکے قرآن — تب ہوں خوش وقت سارے پیر و جوان
کھانا مقدور بھر پکا للہ — دیں کھلا خلق کو گدا اور شاہ
اور اس بن کریں نہ کچھ زنہار — کہہ دیا اور کہوں گا پھر سو بار

باقی نصیحتوں میں حسب ذیل عنوانات پائے جاتے ہیں :۔

(۱) بیچ بیان نصیحت کے مخاطب دل سے۔
(۲) بیچ بیان کرنے سنّت کے یعنی ختنہ
(۳) بیچ بیان اس کے کہ جب وہ خود لڑکا بعد بلوغ پہنچے تو کس طرح سے اوقات بسر کرے۔
(۴) بیچ بیان اصول نکاح کے۔
(۵) بیچ بیان مہر باندھنے کے۔
(۶) بیچ بیان مقاربت کرنے حیض کے۔

(۷) بیچ مقاربت کرنے کے عمل میں۔
(۸) بیچ بیان وصیّت کرنے کے۔
(۹) بیچ بیان حالت جان کندنی کے۔
(۱۰) بیچ بیان رونے پیٹنے کے۔
(۱۱) بیچ بیان غسل اور گور کفن دینے میّت کے۔
(۱۲) بیچ بیان خوش بو کرنے کفن اور جسم کے۔
(۱۳) بیچ بیان دفن کرنے کے۔
(۱۴) بیچ بیان مدت عدت اور سوگ کے۔
(۱۵) بیچ بیان تیجے کی عذر خواہی کے۔
(۱۶) بیچ بیان سوم اور چہلم اور شش ماہی اور دیوسے یعنی بعد سال اور فاتحہ درود۔
(۱۷) بیچ بیان پکّی رکھنے قبر کے اور گنبد اور چھت کرنے کے اور شامیانہ اور غلاف نہ چڑھانے کے اور چراغ روشن نہ کرنے کے۔

رسالے کا نام رنگین نے خود 'تصنیفِ رنگیں' بتایا ہے اور تاریخِ تصنیف ان اشعار میں کی ہے ؎

نظم دس دن میں اس کو کر کے تمام	رکھا 'تصنیفِ رنگیں' اس کا نام
اب جو تاریخ کا تجھے ہو خیال	تو تجھے کہ سناؤں میں فی الحال
غصے ہو کر تو مجھ پہ دانت نہ پیس	تھے ہزار اور دو سو اور تنتالیس
یہی تاریخ ہے تو شوق سے گن	گیارھویں تھی رجب کی پیر کا دن

؎ مجموعہ 'سیارۂ رنگیں' کا دوسرا حصہ 'گل دستۂ رنگین' چار سو اشعار پر مشتمل

ہے اس کے دو حصے ہیں۔ اس نظم کے متعلق رنگین ایک مقفیٰ اور مسجع نثر دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"حمد ہزاراں ہزار اس خدا کو کہ جو اس گل زارِ جہاں میں تخم ہر ایک درخت کا بو دیتا ہے۔ اور اس کو نشو و نما عطا کر کے پھل اور پھول کو اس کی انواع کے بو دیتا ہے۔ اس نے انسان کو یہ جو زبانِ گویا دی تو یہ عجیب ایک نعمتِ عظیم گویا دی۔ پس لازم ہے کہ ناحق زندگی کو بے ہودہ گوئی میں برباد بشر نہ کرے۔ بلکہ اپنے اوقات کو ایک دم لغو تقریر سے ضائع بہ[1] بشر نہ کرے۔ کس واسطے کہ یہ جتنی موجودات ہے اس کی آخر ایک دن موجودات ہے۔ اور درود بے پایاں محمد مختار اور آلِ اطہار[2] اور اصحابِ اخیار[3] کو کہ جن کے طفیل سے اس دنیا میں ہم سے دور بلا زحمت کی ہے اور دین میں انشاء اللہ تعالیٰ ان کے باعث سے امید رحمت کی ہے۔ بعدہ کم ترین شعرائے رنگین یعنی سعادت یار خاں رنگین عرض کرتا ہے کہ اکثر اپنے رفیق کہ جو بہ جان و دل شفیق ہیں کہا کرتے تھے کہ اپنے مرغِ طبیعت کی پرواز کر، تا وہ طرف آشیانہ معنی رنگین کے جاوے پرواز کر یعنی اس گلشنِ شعر و شاعری میں کچھ ایسا نیا دخل دے، کہ گلستانِ فکر تیرے کوئی تر و تازہ نخل دے۔ یہ سن کر طبیعت جو میری لہرا گئی[4]، تو میرے جی میں بھی یہ لہر آگئی[5]، الحمد للہ کہ بعد مدتِ بعیدہ بہ روزِ سعید درمیان دو عید یہ مثنوی گل دستہ رنگین زار ہم رنگ نامہائے ہزار[6] دو نسخہ ہو کر صنعتِ تجنیس میں نظم تمام ہوئی اور ان میں سے ایک بیٹھن اور دوسری جنس بن کر تمام ہوئی۔ ان میں سے پہلی جو بیٹھن ہے سو اس نے سات قسم کی تجنیس کے ساتھ نظم ہو کر گلستانِ عالم میں آپ کو جوں گل کھلایا[7]۔ اور دوسری جو جنس ہے اس نے فقط تجنیس تمام اور تجنیس مرکب کے پیرائے کو پہن کر بوستانِ جہاں کو

---

[1] بشرایت [2] حاضری [3] برگزیدہ [4] پریدہ [5] جنبش کرد [6] خیال آمد [7] بلبل [8] شگفتہ کرد

رشک سے گل کھلایا[1]۔ امیدوار ہوں کہ جو کوئی اس نسخے کو مطالعہ فرمائے وہ اس عاصی پُر معاصی کو بہ دعائے خیر یاد کرے اور واسطے آموزش اس گنہگار کے جناب کبریائی میں سرنگا کر کے نالہ و فریاد کرے۔ اس مزرع دنیا سے یہ حاصل[2] ہو کہ اوس کو یہ اجرِ عظیم حاصل ہو۔ شروع سے

حمد کہنے کی تجھے جب بار[3] ہو ۔ جب کہ تجھ پر رحمتِ جبّار ہو

اس نظم میں مختلف عنوانات سے دین داری اور پاک بازی کی تلقین کی ہے اور موضوعات کے اعتبار سے یہ عارفانہ نظم کے تحت میں آتی ہے۔ اس کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

'دربیانِ ترکِ دنیا'

تو جو دُنیا کے لیے بے تاب ہے	اوس کی خاطر تجھ کو پیچ و تاب ہے
ہے تو دُنیا کے پھنسا جنجال میں	کر لیا ہے تجھ کو اوس نے جال میں
لے تو اس شطرنج کی دنیا میں بُرد[4]	ورنہ ہو جاوے گی دم میں دستبُرد
جانتا محکم ہے گر اس کی اساس	تو تو کر تو زالِ دنیا سے ساس
مرد ہے تو اس سے دامن تر نہ کر	دیکھ اچھے کام کر ابتر نہ کر
زندگی تیری ہے دم کے تار سے	پر تو باز آتا نہیں پُستار[5] سے
ہے بگڑنا آخر ان اشکال کو	جان مت آسان اس اشکال[6] کو
نامۂ اعمال کے کاغذ کا تاؤ	ہے سیاہ تیرا تو کیوں کھاتا ہے تاؤ
ساری دنیا ہاتھ آئے گی نہیں	سوچ یہ مآل[7] ایک آنے کی نہیں
اس جگہ سے ترک کر آرام کو	گور نے چھوڑا نہیں بہرام کو
ڈر خدا سے میرا کہنا مان کر	یہاں سے کچھ چلنے کا تو سامان کر

---

[1] داغ کردے [2] نفع کشت [3] حصول [4] رسائی [5] نفع، جب شطرنج میں کوئی مہرہ بادشاہ کے ساتھ نہیں رہتا اور صرف بادشاہ ہی رہ جاتا ہے تو وہ بادبرُد کہلاتی ہے [6] پھیلاؤ [7] دشواری [8] کائنات، ہستی۔ چرخے کی مال۔

در بے وفائی اہلِ دنیا

کام آتے کس کے ہیں اہل وعیال   ہو فقط تیرا ہی یہ وہم و خیال
کوئی تیرا دوست ہی نے یار ہے   جس کو دیکھا بدتر از اغیار ہے
اس جگہ تیرا کوئی یاور نہیں   یہ سخن تیرا مجھے باور نہیں
یوں موافق تجھ سے ہم سایہ رہے   ساتھ تیرے جوں بہم سایہ رہے
تجھ سے ہیں یہ لوگ سب بیزار سے   تجھ کو کیا غم ہے تیری بیزار سے
مرشدِ کامل کا یہ ارشاد ہے   وہاں غمیں ہوگا یہاں جو شاد ہے
کب تلک سمجھاؤں تجھ کو اے عزیز   رکھ خدا بن تو کسی کو مت عزیز

در طلبِ دین

حق کے گر واقف نہیں انعام سے   تو تو بس بدتر ہے تو انعام[1] سے
گو ترا ہر سو جہاں میں شور ہے   تو کچھ شیریں نہیں ہے شور[2] ہے
سوچ جی میں نر ہے تو مادہ نہیں   کارِ دیں پر کیوں تو آمادہ نہیں
ہے ترے نزدیک راہِ دیں بعید   کام دنیا کا سمجھتا ہے تو عید
راہِ دیں میں یوں تو ہو جاتا ہے لنگ   جیسے گولی کھا کے چلتا ہے پلنگ[3]
حق تو یوں ہے تو اگر دیں دار ہے   تو ترے حق میں یہ دنیا دار[4] ہے
نیکیوں کی بھر کے گاڑی بھیج دے   اپنے چلنے سے اگاڑی بھیج دے

در بیانِ گریۂ شب

تجھ کو یہ لازم ہے در عینِ شباب   جاری آنکھوں سے رہے روز و شب آب
چشمِ انساں کا برسنا کام ہے   خشک گزرے جو برس ناکام ہے
یاد کر حق کو نہ کر یادِ صنم   گڑگڑا اور اپنی رکھ آنکھوں کو نم

---

[1] چارپایہ [2] کھار [3] پلنگ: چیتا۔ قلمی نسخے میں "ملنگ" ہے جس کے معنی بے خود کے ہیں، اس گروہ کا سلسلہ زندہ شاہ مدار سے چلا ہے [4] سُولی۔

رات دن گر چشم تیری تر رہے تو یقیں ہو سب سے تو بہتر رہے
جو ہنسے اوس دیدۂ نم ناک پر آوے حرف اس کی الہیٰ ناک پر

بعض عنوانات حسب ذیل ہیں :-

(۱) در طلب روزی زیادہ از مقدور کوششِ بے جا
(۲) در منع آرایش جسم و خواب بے ہودہ۔
(۳) در بیان مے نوشی
(۴) در بیان ظلم
(۵) در بیان نفس سرکش۔
(۶) در بیان جہانِ ناپائے دار۔
(۷) در منع صحبتِ ناجنس
(۸) در بیان مفلسی و منع بخل
(۹) در بیان ادب فقرا و منع غرور
(۱۰) در بیان یادِ حق و منع بد زبانی۔

پہلا حصہ اس قسم کے پچیس عنوانات پر مشتمل ہے جس میں دو سو اشعار ہیں اس کے بعد اسی انداز میں دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے اور اس میں بھی پچیس عنوانات ہیں اور دو سو اشعار ہیں۔ مثنوی کے خاتمے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ انشاء کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اور انشاء نے اسے پڑھ کر تعریف میں ایک رباعی لکھی تھی وہ بھی شامل کر دی گئی ہے۔

" در مناجات در[1] ختم ایں نسخۂ گل دستۂ رنگیں "

ہے تری رحمت میں جتنا میرا بخش یا الہیٰ اوس سے افزوں مجھ کو بخش
میں جو ہوں رنگیں ترا افسانہ خواں دے مجھے تو نعمتیں بھر بھر کے خواں

---

[1] جتنا

مانگتا ہوں کیا میں اس انشا سے داد	چاہتا ہوں اس کی میں انشا[1] سے داد
میں تو ہو سکتا نہ تھا یوں نغمہ ساز	ہو خدا سا زاب ہوا ہو یہ جو ساز[2]
کچھ طبیعت جو مری لہرا گئی	تو یکایک جی میں یہ لہر آگئی
طبع میری جب اِدھر راغب ہوئی	نظم مجھ سے تب یہ ای راغب ہوئی
صفحۂ کاغذ در افشاں کر دیا	اور زر معنی سے افشاں کر دیا
نظم یہ ڈنکا بجا میں نے کہی	بعد اہلی کے بجا[3] میں نے کہی
ہو بجا گر یہ کہوں نوبت بجا	آئی قسمت سے مری نوبت بجا[4]
مثنوی گل دستۂ رنگیں ہو یہ	نظم رنگا رنگ سے رنگیں ہو یہ
مثنوی رنگیں نے جو انشا یہ کی	سو تجھے ارسال ای انشا یہ کی

مثنوی گل دستۂ رنگیں، کے دونوں حصے باون عنوانات اور چار سو اشعار[5] پر مشتمل ہیں۔

'سبع سیارۂ رنگیں' کا تیسرا حصہ 'سبحۂ رنگیں' کے نام سے مشہور ہو۔ جس میں ایک سو ایک رباعیات ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا نام "سبحہ" رکھا ہو۔ یہ ایک نہایت دل چسپ مجموعہ ہو جس سے رنگین کی سیرت کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔ پوری ایک سو ایک رباعیاں معروف کی ہجو میں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہو کہ ابتداءً معروف اور رنگین میں دوستی تھی بعد میں کسی کے بہکانے پر یہ رنگین سے لڑ بیٹھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ رنگین نے ان کی ہجویات کے لیے اپنی ایک پوری تصنیف صرف کر دی۔ اگرچہ ان کا نام صراحتہً کہیں نہیں لیا گیا ہو لیکن معلوم ہوتا ہو کہ یہ شاعر ہیں، دلّی کے رہنے والے ہیں اور احمد بخش کے بھائی ہیں۔ ان امور سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ یہ الٰہی بخش خاں معروف ہیں جن کا ذکر رنگین نے اپنی اور تصانیف میں بھی کیا ہو۔

---

[1] انشاء اللہ خاں انشا [2] اتفاق [3] بہ موقع [4] نوبت بن بجا آمد [5] قیمع

بعض رباعیات حسب ذیل ہیں :-

رباعی (۱)

یارب ملے رنگیں کو تو نیکی کی جزا — معروف کو ہوئے اس کے فعلوں کی سزا
جس نے یہ بنا فساد کی پہلے رکھی — امید یہ ہو کہ چکھے وہ اوس کا مزا

(۲)

معروف اگر میرے مقابل اڑتا — تو زیورِ نظم میں بھی کچھ کچھ گھڑتا
روکش مرے ہو سکے وہ رنگیں کیا دخل — پردے میں وہ نامی کے ہو مجھ سے لڑتا

(۴)

معروف سمجھتا جو ہو خود کو دانا — کہتا ہو کسی نے نہ مجھے پہچانا
اوس کی وہ مثل ہوئی بقول رنگیں — چوہٹی[1] بھی کہے کہ مجھ کو گھی سے کھانا

(۶)

رنگین معروف نے بہت غم کھایا — پر نام نہ شاعری میں تھا پایا
جو لطفِ سخن ہو سو خداداد ہو وہ — ہر ایک کے حصّے میں نہیں وہ آیا

(۸)

معروف اپنے لیے ہو رنگیں سے لڑا — تا خلق کہے کہ یہ بھی شاعر ہو بڑا
جب پڑنے لگیں اودھر سے صابن کے مول[2] — سوئے کی طرح سے تب گیا خوب گھڑا

(۱۰)

معروف کا پاجامہ جو ہو سوسی[3] کا — اور کرتہ بھی ہو پارچۂ طوسی[4] کا
مطلب ہو یہ رنگیں تاکہ یہ دیکھ لباس — خلقت کو ارادہ ہو قدم بوسی کا

---

[1] کہاوت - ادنیٰ آدمی بھی بڑوں کی برابری کرنے کا طالب ہو -

[2] صابن کے مول پڑنا : بہت سی جوتیاں پڑنا - [3] سوسی : ایک قسم کا رنگین دھاری دار کپڑا [4] ایک قسم کا ادنیٰ نہایت ملائم دل دار کپڑا -

(۱۹)

رنگین معروف تلملانا ہی عبث اشعار پہ تیرے جی جلاتا ہی عبث
یہ لطفِ سخن خداداد ہی یار بے ہودہ یونھیں وہ رشک کھاتا ہی عبث

(۲۰)

معروف تو ہی شعر و سخن کا محتاج پر ہجو کو خلق کی وہ موجود ہی آج
اس کی وہ مثل ہوئی بہ قولِ رنگیں چوہا نہ سماوے بل میں اور باندھے چھاج

(۲۳)

معروف ترے بول سہوں میں کس طرح رنگیں ہوں زباں بند رہوں میں کس طرح
جب تیری طرف سے ہو بدی کا آغاز پھر ایک کی سو سو نہ کہوں میں کس طرح

(۲۶)

معروف کو خیرن نے جو بھیجا کاغذ رنگیں یہ کہا اس نے کہ دے جا کاغذ
انعام جو اس نے اس سے مانگا تو وہیں خط پھینک کے یوں کہا کہ لے جا کاغذ

(۲۸)

معروف کی مشق کو کیا ہم نے جو غور ہر ایک غزل کا اس کی ہی طرز اور
رنگین اس کا سبب یہ معلوم ہوا لوگوں سے کہا لیتا ہی اس کا ہی یہ طور

(۳۱)

معروف کے پاس ہی نہ سیم اور نہ زر اوقات بسر کرتا ہی وہ اپنی بشر
رنگین ہی ان دلوں یہ صورت اس کی کانا ٹٹو ہی اور بدھو ہی نفر

(۳۶)

معروف یہ چاہتا ہی کعبے جا کر حج کر کے یہاں کہائے حاجی آکر
سُن کر یہ قصد اس کا رنگیں نے کہا بلی چلی حج کو لاکھ چوہے کھا کر

(۳۸)

دلّی میں سلامت تھی طوائف مشہور[1] معروف تھا اس پہ جان اور دل سے چور
یہ تو مرتا تھا اوس پہ لیکن رنگیں وہ کہتی تھی اوس کو چل بے چل دوٗر ہو دوٗر

(۴۶)

جو خاک نشیں ہیں اون کا ہی گرد لباس فخر اپنا سمجھتے ہی نہیں مرد لباس
رنگیں فقرا میں زرد رؤ ہی[2] معروف اس واسطے بھاتا ہی اسے زرد لباس

(۵۷)

معروف میں باقی تو نہیں دم مطلق کہتا ہی کسی سے یہ نہیں کم مطلق
غم احمد بخش خاں کی ثروت کا ہی بس رنگین اس بن اوسے نہیں غم مطلق

(۵۸)

معروف ہوا ہی[1] خشک جوں سوکھے مُشک اور بہتے مدام اوس کے ہیں آنکھ سے اشک
رنگین خفقان[3] نہیں ہی مطلق اس کو یہ احمد بخش خاں کی دولت کا ہی رشک

(۶۰)

ناظم معروف کو سمجھتے ہیں ذلیل نثار بُرا کہتے ہیں از روئے دلیل
جو ہی دانا وہ جانتا ہی اسے پوچ رنگیں بھی سمجھتا ہی کچھ اون سب کے قبیل

(۶۸)

رنگین غصہ ترا کم از برق نہیں وہ کون ہی اس بحر میں جو غرق نہیں
معروف ہی شاگرد ترا اوس کو نہ چھیڑ شاگرد میں اور بیٹے میں کچھ فرق نہیں

---

[1] شرم سار [2] نواب الٰہی بخش خاں معروف مرزا اسداللہ خاں غالب کے خسر اور نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے والد مرزا عارف خاں تھے۔ معروف کا ایک دیوان اردو مولانا عبدالحامد بدایونی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہی۔ آزاد نے لکھا ہی کہ "پہلے شاہ نصیر اور سید علی خاں غمگین سے اصلاح لی پھر ذوق کے شاگرد ہو گئے۔" آزاد کی یہ رائے محل نظر ہی کہ معروف کا دیوان سارا ذوق کا عطیہ ہی [3] ایک بیماری کا نام جس میں دل کی حرکت بڑھ جاتی ہی۔

لازم ہو رباعی کہنے کا غم سہہ لوں | شغل اور نہیں اس میں رنگین بہ لوں
تقصیر معاف ہوئے معروف کی تب | جب ہجو میں پانچ سو رباعی کہہ لوں

شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہ رباعیات بہت اعلیٰ درجے کی نہیں ہیں لیکن ان سے یہ پتہ چلتا ہو کہ رنگین کی طبیعت میں کینے کو بڑا دخل تھا اور معمولی سے اختلاف کو بھی وہ معاف نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے اس دور میں اور شعراء نے بھی معاصرین کی ہجویں لکھی ہیں لیکن رنگین اکیلے شخص ہیں جو اپنے حریف کی ہجو میں پوری ایک تصنیف صرف کرتے ہیں۔ مجموعے پر تاریخ تصنیف نہیں ہو لیکن انڈیا آفس کا قلمی نسخہ ۱۲۴۱ھ میں لکھا گیا ہو۔

'سبع سیارۂ رنگیں' کا چوتھا حصہ 'مربع رنگیں' یا 'رنگین نامہ' کے عنوان سے ہو یہ ریختہ کا ایک دیوان ہو جس میں محمود نامہ کے طرز پر التزام یہ ہو کہ جس حرف سے غزل کا مطلع شروع ہو اسی حرف پر ختم ہو اور یہ بھی کہ غزل کے باقی شعروں میں پہلا اور آخر حرف وہی ہو۔ اور اس التزام کو الف سے یا تک کی ردیف میں نباہا ہو اور ہر ردیف میں پانچ پانچ شعر کی ایک غزل لکھی ہو اس قسم کے صنائع اور بدائع کا استعمال کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اس مجموعے سے اندازہ ہوتا ہو کہ صنعت کے التزام کے باوجود شعر میں بے ساختگی اور برجستگی کا قائم رکھنا اگرچہ دشوار ہو لیکن کاملانِ فن کے لیے ناممکن نہیں ہو۔ یہاں 'مربع رنگین' میں سے صرف چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں :-

احوال لکھوں کیا میں ترے جور و ستم کا | مقدور زباں کا ہو نہ مقدور قلم کا
آنا ہو تو آ جلد مری یار خبر لے | مہمان ہوں دنیا میں وگرنہ کوئی دم کا
ای آفتِ جاں پوچھے ہو کیا مجھ سے مرا حال | کیا تجھ سے کہوں میں تو ہوں مارا ترے غم کا
اب عفو ہو تقصیر مری ای مرے صاحب | بندہ یہ گنہ گار ہو محتاج کرم کا

آفاق میں کیا شاہ و گدا کوئی ہو رنگیں — درپیش ہے ایک روز سفر سب کو عدم کا

بھاتا ہوں میں مدام یہ اس گل بدن کا روپ — ہو بیچ میں بہار کے جیسے چمن کا روپ
پھیکا ہے میرے اور مرے پیارے کے روبرو — رانجھے کا اور ہیر کا اور نل دمن کا روپ
پہنچے گا اس کے ظلم کا شہرہ فلک تلک — اس سال کو زیادہ ہوا بانکپن کا روپ
باجی رقیب سونے لگا اس کے ساتھ پھر — ڈرتا ہوں گھٹ نہ جاوے اس سیم تن کا روپ
پھر گل بدن نہ تجھ کو کہے ہو کے منفعل — رنگیں کبھی جو دیکھے یہ تیرے بدن کا روپ

حیف ہے ہم کو نہیں آتی ہے جل جانے کی طرح — سیکھیے کس طرح سے اے شمع پروانے کی طرح
حال دل کی میں کہانی کس طرح اس سے کہوں — قصہ خواں مجھ کو بتا کوئی تو افسانے کی طرح
حسرت ساغر نہیں اب دل میں میرے ساقیا — گردش چشم اس کی دیکھی ہے جو پیمانے کی طرح
حسن کا شہرا نہ تھا تو تم ہمارے یار تھے — کس سے اب سیکھے ہو یہ بیگانہ ہو جانے کی طرح
حق بجانب ہے ترے رنگیں کہ تو نے سوچ سوچ — کی بہت پر بن نہ آئی دل کے سمجھانے کی طرح

سوچ کر بیٹھ دل اس عاشق غم خوار کے پاس — زلف کا دام ہے آمان نہ جا یار کے پاس
سخت عیار ہے وہ شوخ مرا دل لے کر — پاس سے اٹھ مرے جا بیٹھے ہے اغیار کے پاس
ستم و ظلم وہ اس دل پہ تو کرتا ہے بہت — پر یہ رہتا نہیں بن جائے جفا کار کے پاس
سیر کرتا ہوں بیاباں کی میں اس خاطر — عرض کرتے ہیں مرے آبلے کچھ خار کے پاس
سن لے رنگیں یہ گواہی مرا دل دیتا ہے — جا کے تو بیٹھ رہے گا مرے دلدار کے پاس

فصل گل ہے غنچہ لب آ انتظاروں کی طرف — رنجہ فرما یک قدم امیدواروں کی طرف
فاتحہ کو کب تو آوے گا کسی کے بعد مرگ — زندگی میں جو نہ آیا دل فگاروں کی طرف
فرق بھی کچھ دیکھنے میں ہے تجھے بے امتیاز — گل تو غیروں کی طرف اور خار یاروں کی طرف
فال ملا دیکھ کر ذرا خدا کے واسطے — کہہ تو کب آوے گا وہ ہم بے قراروں کی طرف
فیض سے حاتم کے اے رنگیں نہیں کچھ دور یہ — گر نگاہ لطف ہو ہم دوستداروں کی طرف

لہ غمزہ، طرز، انداز، عادت

گو پیارے ترے حُسن پہ قربان ہیں یہ لوگ — پر جان کوئی دن کے ہی مہمان ہیں یہ لوگ

گُل کی طرح یہ حُسن کوئی دن کا ہے ظالم — بر خود غلط اتنا نہ ہو نادان ہیں یہ لوگ

گردش میں زمانے کی سبک بار ہیں فقراء — ہر چند کہ یہاں بے سر و سامان ہیں یہ لوگ

گھر میں ترے آکر تجھے پھر کرتے ہیں بدنام — ہے جائے خطر تو وہ طوفاں ہیں یہ لوگ

گرد آکے بھٹکتے ہی نہیں وہ ترے رنگین — تو جن کو سمجھتا ہے مری جان ہیں یہ لوگ

نے آشیاں کے دیکھنے کی ہے ہوس ہمیں — صیاد بس ہے رہنے کو کنجِ قفس ہمیں

ناصحو شتاب چلو دیر مت کرو — کہتی ہے قافلے میں صدائے جرس ہمیں

نامے کو ایک عمر ہوئی ہے اوسے لکھے — گزرے ہیں انتظار میں یار و برس ہمیں

نے دن کو چین ہے نہ کہیں شب کو خواب ہے — آرام اس جہاں میں نہیں اک نفس ہمیں

ناحق کی شیخیاں تھیں کہ رنگیں کروں گا قتل — زخمی ہی کر کے چھوڑ دیا یار بس ہمیں

وحشت جو ہم کو ہے سو کسی کو خدا نہ ہو — یہ درد وہ ہے جس کی کسی سے دوا نہ ہو

واللہ گرچہ حضرتِ عیسیٰ کریں علاج — تیرے مریضِ عشق کو ہرگز شفا نہ ہو

واقف نہیں ہو خوب تم اس دل سے میری جان — یہ شیشہ وہ ہے ٹوٹتے پر اسے صدا نہ ہو

واعظ نہ بک کہ تیری جہنم کے خوف سے — ہم تب ڈریں جو سر پہ ہمارے خدا نہ ہو

وہ غنچہ کون سا ہے کہ رنگیں نہیں کھلا — دل کی گرہ ہے وہ جو صبا سے بھی وا نہ ہو

ہر شب آکر شمع مجلس میں جو جل جاتی ہے یہ — کس کو اپنا عشق اے پروانہ دکھلاتی ہے یہ

ہاتھ سے کاکل کے میری ناک میں آیا ہے دم — دل مرا اٹکا ہے رخساروں سے بل کھاتی ہے یہ

ہے کوئی دن کا گُل و گلزار کرلے چہچہے — ورنہ بلبل دیکھ پیچھے سے خزاں آتی ہے یہ

ہم سے کچھ اس شمع کو ایسی پڑی ہے آکے لاگ — یار کی مجلس میں ہم کو دیکھ کٹ جاتی ہے یہ

ہے عجب احوال رنگین دخترِ رز کا کہ اب — آخر سب کو دیکھ کر مجلس میں شرماتی ہے یہ

---

* رنگین نامہ میں جس کا دوسرا نام مربع رنگین بھی ہے تاریخ تصنیف نہیں ہے لیکن انڈیا آفس الاکم نسخہ ۱۲۱۴ھ میں لکھا گیا ہے۔ یہ تاریخ کتابت ہے۔

'سبع سیارۂ رنگین' کا پانچواں حصّہ 'ساقی نامہ' ہے جس کے آخری شعر سے اشعار کی کُل تعداد ڈھائی سو معلوم ہوتی ہے ؎

ہوئے ڈھائی سو شعر کر لے شمار — بس اس کو یہاں ختم کر میرے یار

'ساقی نامہ' کے شروع میں نعت، حمد، مدح چار یار اور منقبت حضرت علیؓ کے بعد بیان مدح سخن و سخن گو اور بیان شکوۂ فلک و دنیائے دوں کے عنوانات ہیں۔

'ساقی نامہ' اِن اشعار سے شروع ہوتا ہے ؎

پلا ساقیا برف میں مے لگی — فنا تا کہ ہو شدّتِ تشنگی
وہ مے دے کہ شیشے میں ہو جوں پری — ترنگِ خوشی سے لبالب بھری
دیے جا وہ صہبائے مے دم بہ دم — کہ پہنچے لبِ تشنہ کو جس سے نم
سُن اے ساقئ محفلِ عاشقاں — سُن اے والئ محفلِ عاشقاں
سُن[1] اے دردمندوں کے دل کی دوا — ؟ ______
چمن میں قیامت ہے جوشِ بہار — گئے ہیں سب آپس میں مِل مِل کے ہار
بہم کرتے پھرتے ہیں گلشن کی سیر — ولیکن ستم مجھ پہ ہے تجھ بغیر
قیامت گلستاں میں ہے آج دھوم — غضب ہر طرف خلق کا ہے ہجوم
عجب جا بہ جا درمیانِ چمن — نرالی ہے ہر ایک کی انجمن
کہیں بیٹھے پیتے ہیں باہم شراب — کسی سَمت بجتا ہے چنگ و رباب
کسی جا ہے مینائے خالی کا غم — کہیں دَورِ ساغر کا ہے دم بہ دم
لبِ جُو پہ مِل کر کہیں خوب رُو — جھکولیں ہیں بیٹھے ہوئے آب کو
تماشے میں مصروف ہیں مستِ ناز — عجب دھوم ہے آج یا بے نیاز
کہیں غنچہ لب برگِ گُل توڑ توڑ — بہاتے ہیں پانی میں سر جوڑ جوڑ

[1] دوسرا مصرع ... نسخے میں نہیں ہے

گل و لالہ کی ہر طرف دید ہے　　جدھر دیکھیے اُوس طرف عید ہے
میسر ہے بلبل کو گل کا وصال　　مبارک ہو اس کو نہایت یہ سال
ہر ایک جا پہ ہے جمع دوستاں　　گلوں سے بھرا ہے یہ سب گلستاں
جو آتا ہے آ ورنہ مر جاؤں گا　　غرض جان سے میں گزر جاؤں گا
جہاں ساقیا گھر کے آتا ہے ابر　　مرے دل میں رہتا نہیں آہ صبر
جہاں جس نے مے سے صراحی بھری　　بھر آیا وہیں دیکھ کر اپنا جی
بہ وقتِ ترشح تو پھر کیا کہوں　　مری آنکھوں آگے برستا ہے خوں
غرض شیشہ مے کسی کے حضور　　جو دیکھوں تو سنگِ جفا سے ہوں چور
عجب زندگانی ہے مجھ پر عذاب　　پئیں یار مے اور میں ہوں کباب
مرا تو پیام اتنا پہنچائیو　　ضرور اس طرف کو کبھی جائیو
یہ کہیو صبا اس مہ عید سے　　یہ کہیو تو اس رشکِ خورشید سے

اِس طویل بیان کے بعد ساقی کو قسمیں دلائی ہیں کہ وہ اس پر رحم کرے۔ پچیس اشعار ان مختلف قسموں پر صرف ہوئے ہیں جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں ؎

ارے تجھ کو بادِ صبا کی قسم　　ارے تجھ کو اپنے خدا کی قسم
قسم ہے تجھے جانِ من ناز کی　　قسم ہے تجھے اپنے انداز کی
قسم ہے تجھے تیرِ مژگاں کی یار　　قسم ہے تجھے زلفِ پیچاں کی یار
قسم ہے تجھے چشمِ مخمور کی　　قسم ہے تجھے دخترِ انگور کی
قسم ہے تجھے اس اشارات کی　　قسم ہے تجھے اپنی ہر بات کی
قسم ہے تجھے اپنے پیمانے کی　　قسم ہے تجھے اپنے مے خانے کی
قسم تجھ کو قمری کے ہے طوق کی　　قسم تجھ کو بلبل کے ہے شوق کی

پیالے کے بھرنے کی تجھ کو قسم		سبو خالی کرنے کی تجھ کو قسم
قسم ہے تجھے اپنے نسیان کی		قسم ہے تجھے اپنی ہی جان کی
قسم تجھ کو شبنم کی پرواز کی		قسم تجھ کو بلبل کی آواز کی
قسم ہے تجھے سوز پروانے کی		قسم شمع کے تجھ کو جل جانے کی
قسم ہے تجھے گُل کے انداز کی		قسم تجھ کو مطرب کی آواز کی
قسم ہے تجھے چشمِ خوں ریز کی		قسم ہے تجھے خنجرِ تیز کی
قسم پر قسم تجھ کو دیتا ہوں میں		قسم دے کے تجھ کو یہ کہتا ہوں میں
کہ آ چھوڑ دے بے وفائی کو یار		نہ کر بے مزہ آشنائی کو یار

ان قسموں کے بعد شاعر اس اندیشے کا اظہار کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ساقی نہ آئے اور اجل آ پہنچے جیسا کہ اس عاشق کا حال ہوا تھا جو اپنے محبوب سے جُدا تھا اس کے بعد رنگین نے اس عاشق کی داستان نظم کی ہے جو ایک پری رو پر عاشق تھا اور عرصے تک دونوں ایک دوسرے سے جُدا رہے یہاں تک کہ مدت کے بعد جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو عاشق کی روح پرواز کر گئی اور اس کی محبوبہ جس کشتی میں سوار اس سے ملنے آئی تھی وہ بھی وہیں دریا میں غرق ہو گئی۔ اس مختصر قصے میں رنگین نے غالباً دو مثنویوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ دریا میں ڈوب کر عاشق و معشوق کے باہمی وصال کا مضمون میر نے "دریائے عشق" میں اور مصحفی نے "بحر المحبت" میں بھی اختیار کیا ہے۔ اگرچہ رنگین نے میر کے قصے کو بہ جنسہٖ اختیار نہیں کیا ہے تاہم آخری حصے سے شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کی اس مثنوی سے ضرور استفادہ کیا ہے۔ میر حسن کی مثنوی کا اثر محبوبہ کے سراپا اور اس کے گھر کے نقشے کے بیان میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ صرف ہمارا قیاس ہے۔ ممکن ہے

رنگین نے یہ مضامین اپنی طبیعت سے خود پیدا کیے ہوں لیکن ان کے حسبِ ذیل اشعار پڑھ کر میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' یاد آجاتی ہو۔ رنگین نے مختلف مناظر اور کیفیات جس طرح بیان کیے ہیں ان کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہو

سراپا مَیں اس کا بیاں کیا کروں — عیاں تھا عیاں کو عیاں کیا کروں
وہ چوٹی کہ تھی جس کا ہر ایک بال بال — سدا گردنِ حور کا ہووے بال
فتح پیچ وہ جس میں جو دل پھنسے — تو اس کے قضا سر پہ آکر ہنسے
وہ آنکھیں سیہ اور وہ ترچھی نگاہ — وہ مکھڑا چمکتا ہوا مثلِ ماہ
وہ جوبن کا غرّہ وہ دل کی اُمنگ — وہ آنکھوں سے ظاہر نشے کی ترنگ
چمکتا وہ اس کا رُخ مہروش — کہ جس پر رہے شعلۂ شمع غش
ادھر کو اگر آنکھ ڈالے قمر — تو اوس کا بھی ٹکڑے ہو تارِ نظر
وہ عارض کہ دیکھے اگر اون کو حور — تو سمجھے کہ ہو یہ تجلّیٔ طور
وہ لب پر مسّی کی تھی رہتی دھڑی — کہے تو کہ مہ پر ہو بدلی اڑی
وہ تصویرِ گردن جو پُر نور تھی — تو وہ غیرتِ گردنِ حور تھی
وہ اُٹھتی جوانی وہ موسم نیا — کچوں کے وہ جوبن کا عالم نیا
کمر کا کروں وصف کیا مُو بہ مُو — کہ یہ ماجرا ہو عجب گو مگو
ہوئی آگے کچھ کہنے کی جو ہوس — تو وہیں حیا نے کہا مجھ کو بس
غرض سر سے لے پاؤں تک وہ پری — نزاکت سے اور حُسن سے تھی بھری
کروں اس کی پوشاک کا کیا بیاں — کہ ہو کانپتی میرے منھ میں زباں
وہ پوشاک سُرخ اور بھبھو کا سا رنگ — وہ چہرے کی شوخی سے ظاہر ترنگ
چمکتی بنت[1] اور چمکتے حباب — چمکتے وہ گوٹے بہ صد آب و تاب

[1] بنت: زری کراہت کی توئی (زردوزوں کی اصطلاح) زردوزی کام میں مختلف قسم کی خوش نما توئیاں بنائی جاتی ہیں۔ جب قسم کا پھول۔ پتّا یا بیل۔ توئی پر بنائی جاتی ہو اسی کے نام سے اس توئی کو موسوم کیا جاتا ہو جیسے چمپا کی توئی وغیرہ۔

چمکتے ہوئے لہر[1] اور گوکھرو[2] — کہ جن کے نہ ٹھیرے نظر روبرو
وہ گوٹا کناری چھلکتا ہوا — بدن پر وہ زیور چمکتا ہوا
وہ گہنا پہنتی تھی وہ خوش نما — نہ پہنچے جسے آب چشم ہما
وہ بازو پر اوس کے جو تھے نورتن[3] — چھلکتا تھا جس سے وہ تن اور بدن
زبس تھے وہ الماس کے نونگے — ستاروں سے چوچند تھے جگمگے
انگوٹھی تھی ایسی ہر ایک آب دار — جڑاؤ بنی تھی جواہر نگار
وہ دُر اور جواہر چمکتے ہوئے — وہ موتی کے بالے لٹکتے ہوئے
جڑاؤ وہ ہیکل[4] جو تھی خوش نما — تو اوس کی لٹک میں عجب تھی ادا
وہ اس باغِ سینہ کی تازی بہار — جھلکتے وہ سینے پہ موتی کے ہار
کڑے اس کے دوہرے تھے بجتے ہوئے — جوانی کے بادل گرجتے ہوئے
عجب اس کے گھر کا تھا انداز وہاں — کہ ہو سکتا اوس کا نہیں کچھ بیاں
طلائی تھا ہر ایک دیوار و در — بنایا تھا گویا وہ سونے کا گھر
اور اس میں تھیں ایجاد طرحیں[5] نئی — وہ چھجے سفید اور منڈیریں نئی
عجب طرح کی کچھ وہ تعمیر تھی — طلائی ہر ایک جس کی تحریر تھی
طلائی وہ ازبس کہ تھی آب دار — کہیے تو کہ تھی رشکِ باغ و بہار
وہ در اور وہ زہ[6] اور وہ صفّہ[7] تمام — کہیے تو کہ تھے رشک دیوانِ عام
سہ دریاں تھیں اس میں جو بنگلی بنی — تو زیبِ مکاں اون سے تھی چوگنی
کہیں جانشیں اور کہیں شہ نشیں — کیا تھا طلا ہر جگہ تہ نشیں

۱؎ کشیدے کی دھاری، بیل ۲؎ تکونیا موڑا ہوا گوٹا۔ کان اور ہاتھ کے ایک زیور کا نام ۳؎ قیمتی پتھر۔ رتن نو ہیں لعل، موتی، پکھراج، زمرد، مونگا، لاجورد، نیلم، ہیرا، گومند، یہاں نورتن ایک زیور کا نام ہے جو بازوؤں پر باندھا جاتا ہے۔ اسے [illegible] بھی کہتے ہیں ۴؎ گلے کا زیور ۵؎ طرحیں؛ طرز ۶؎ منڈیر، کنگنی ۷؎ ایوان خانہ دالان جس کی چھت پٹی ہوئی ہو۔

سفیدی کی اوس کے یہ تھی آب وتاب | خجل ہو جسے دیکھ کر ماہ تاب
چمک اس کی وہ تھی کہ جس پر نگاہ | اُتارے یہ سیم و زر و مہر و ماہ
لگے تھے کئی جا کٹہرے کئی | روپہرے کئی اور سنہرے کئی
وہاں اس میں رہتی تھی وہ دل رُبا | تھی اقلیمِ خوبی کی فرماں روا

اسی طرح عالمِ فراق میں جو نقشہ کھینچا ہے اس سے بدرِ منیر کے عالمِ فراق کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اشعارِ ذیل سے اس کی تائید ہوتی ہے ؎

گزرتا تھا دن رات روتے اسے | نہ پاتے کبھی شب کو سوتے اسے
غمِ یار میں بے خور و خواب تھا | غرض شکلِ سیماب بے تاب تھا
پھرے تھا اسے ڈھونڈتا کو بہ کو | رہے تھی اسی کی اسے جستجو
کبھی جا نکلتا اگر سوئے باغ | دِکھاتا دِل اپنے کا لالے کو داغ
طرف گُل کی گر دیکھتا وہ نزار | تو آتی اسے یادِ رخسارِ یار
اگر سوئے نرگس وہ کرتا نگاہ | تو یاد آتی اس کو وہ چشمِ سیاہ
نظر آتی گر کبک کی اس کو چال | تو رفتارِ دل دار کرتا خیال
دُعا سرو کو دیکھ یہ مانگتا | کبھی یا الٰہی وہ قامت دِکھا
کبھی جا کے جنگل میں رہتا مدام | کبھی جا کے بستی میں کرتا مقام
کبھی ساجدِ[1] کعبہ و دیر تھا | کہ ہو جائے حاجت کہیں سے رَوا
کوئی ہو کے مضطر جو مانگے دُعا | قبول اس کو کرتا ہے جلدی خدا

عاشق کا انجام بیان کرنے کے بعد رنگین لکھتے ہیں: ؎

گیا ساتھ ایک حسرتوں کے وہ ڈوب | نہ دیکھا کچھ الفت کا انجام خوب
تمنا ترے ہاتھ کے جام کی | کسی دن کرے گی یہی مجھ سے بھی

[1] سجدہ کرنے والا

اس کے بعد "ساقی نامہ" کا انداز بدل جاتا ہے اور "شراب" مے دو آتشہ کی بجائے شرابِ معرفت بن جاتی ہے اور وہ جامِ کوثر کی طلب کرنے لگتے ہیں۔ آخری اشعار حسب ذیل ہیں :-

مری دو جہاں بیچ حرمت رہے — مرے ہاتھ میں جامِ عشرت رہے
ترحم سے ساقیٔ کوثر ادھر — مری تشنگی کو ذرا دیکھ کر
طپش میرے دل کی بجھا دیجیو — مرا حشر میں تر گلو کیجیو
پلانا مجھے جامِ محشر کے روز — بجھانا مری آتشِ دل کی سوز
کہ ہوں جان و دل سے میں ترا غلام — تجھی سے مجھے کام ہے والسّلام
کسی کا یہاں ہوں نہ محتاج میں — خوشی سے جہاں میں کروں راج میں
نہ ہو مجھ کو تکلیف آزار کی — رہے تن درستی مجھے جیتے جی
فراغت میں عمر اپنی جاوے گزر — نہ ہو نیک و بد کی مجھے کچھ خبر
جہاں میں بہ نیکی ہوں مشہور میں — رہوں خورم[1] و شاد و مسرور میں
مری آل و اولاد بھی خوش رہیں — نہ دیں کے نہ دنیا کے کچھ دکھ سہیں
مری نظم کو پڑھ کے ہر ایک بار — دعا مانگے حق میں مرے لاکھ بار
رہے نظم کا میری ڈنکا مدام — بہ حقِ محمدؐ علیہ السّلام
مری رات دن ہے یہی آرزو — کہ رنگیں کو دو جامِ کوثر کے دو
برے جتنے مطلب ہیں بر آئیں وہ — شجر میں اجابت کے پھل[2] لائیں وہ
ہوئے ڈھائی سو شعر کر لے شمار — بس اس کو یہاں ختم کر میرے یار

"ساقی نامہ" ایک پرانی صنف ہے لیکن اس میں ایک صنفی داستان داخل کرکے رنگین نے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے اور جس انداز کی جذبات نگاری اور منظر نگاری طویل عشقیہ مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا نمونہ ڈھائی سو اشعار

---

[1] خرّم : شاد [2] پھل

کی اس مختصر سی مثنوی میں پیش کر دیا ہے جس سے ان کی شاعرانہ ندرت، مشاقی طبیعت کی ایجاد اور کلام کی بے ساختگی کا ثبوت ملتا ہے۔

"سبع سیارۂ رنگین" کا آخری حصہ "کلام رنگین" کے نام سے ہے یہ ایک مثنوی ہے جس میں چھوٹی چھوٹی حکایات لکھی ہیں اور یہ التزام کیا ہے کہ ہر حکایت کی بحر الگ ہو اور مضامین بھی الگ الگ ہوں۔ یہ حکایات مختلف لوگوں کی فرمائشوں پر لکھی گئی ہیں اور ان کی کل تعداد گیارہ ہے پہلی حکایت بادشاہ عیاش کے عنوان سے ہے ؎

بادشاہ ایک بڑا تھا عیاش — عیش میں کاٹتا تھا وہ معاش
اس نے اپنے مشیر سے یہ کہا — یعنی اپنے وزیر[1] سے یہ کہا
کہ مرا ایک ہے تجھ سے یہ سوال — دے جواب اس کا کر ادھر کو خیال
رنڈی ہوتی ہے کس طرف کی خوب — کہہ دے ہوتی ہے جس طرف کی خوب
اور بُری جس طرف کی ہے بتا — سوچ کر اپنے دل میں خوب جتا
سُن کے یہ اُس نے دونوں جوڑ کے ہاتھ — عرض کی جھک کے یوں ادب کے ساتھ
رنڈی ہوتی ہے سب طرف کی خوب — مگر ایک ہے پہاڑ کی معیوب
یعنی ہوتی ہے عقل ان میں کم — امتحاں کر چکے ہیں اس کا ہم
شہ نے سن کر کہا کہ ای دستور — ہے مجھے امتحان اس کا ضرور
شاہ کے امتحان کی خاطر — ہوئیں سب طرح کی رنڈیاں حاضر
غرض انعام خوب سا کچھ پا — شہ کی چوکی[2] میں سب لگیں یک جا
آخرِ شب کھلی جو شاہ کی آنکھ — پہلے پوربن پہ ڈال چاہ کی آنکھ
کہا شہ نے کہ شب ہے کتنی بتا — اس نے رنگیںؔ وہیں دیا یہ بتا
سرد موتی ہوئے ہیں نتھ کے اب — اس سے میں جانتی ہوں کم ہے شب

---

[1] وزیر [2] چھوٹا تخت، پاس بانی، خدمت

پھر کے دکھنی کی سمت کر کے خیال | کیا اس سے بھی شہ نے پہلا سوال
سُن کے یوں اس نے شہ کو سمجھایا | گہنا پھولوں کا سب ہے کملایا
اس سے مجھ کو بھی یہ یقیں ہے بات | کہ نہایت ہی کم رہی ہے رات
شاہ نے یہ جواب سُن دو کا | تھی جو پنجابن اس سے پھر یہ کہا
یعنی پُوچھا یہ اس سے کھول کے لب | رات کتنی رہے ہے باقی اب
بولی وہ اب ہوا ہے چلتی سرد | اور لَو شمع کی ہوئی ہے زرد
اس سے بے شک مجھے بھی ہے یہ یقیں | کہ گھڑی بھر بھی رات باقی نہیں
وہ جو چوتھی پہاڑ والی تھی | جو کہ عقل و خرد سے خالی تھی
اس سے شہ نے کہا کہ تو اب کہہ | رات کا دے جواب مت چپ رہ
عرض یوں اس نے کی بہ صد دقت | کہ مجھے اب ہے دست کی حاجت
جاتی شدت سے اس کی میں ہوں موئی | اس سے میں جانتی ہوں صبح ہوئی
سُن کے یہ شاہ ہو گیا خاموش | لیک لگوائیں اس کو سو پاپوش

حکایات کے عنوانات درج ذیل ہیں :۔

(۱) حکایت بادشاہ عیّاش۔
(۲) " مردِ ظریف و حکیم دانا۔
(۳) " دہ مردِ فقیر گرسنہ و بادشاہ محمود غزنوی۔
(۴) " مردِ شہدہ۔
(۵) " مردِ مُغل و زنِ فاحشہ۔
(۶) " مردِ زاہد و قحط کہ در لاہور افتادہ بود بہ موجب فرمایش نواب امیر خان بہادر۔

(۷) حکایت مردِ تاجر و غلام بہ موجب فرمائش حضرت میاں حق رسا صاحب
(۸) " مردِ امیر
(۹) " مردِ کم شہوت و زنِ فاحشہ حاضر جواب۔
(۱۰) " مردِ پوربہ بے عقل
(۱۱) " دربیان عیب ہائے ذاتی خود و عبرت گرفتن۔

اس کی بھی تاریخِ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا لیکن انڈیا آفس والا نسخہ ۱۲۴۸ھ میں لکھا گیا۔ یہ تاریخِ کتابت ہے صحیح سنِ تصنیف کا اس سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

کلامِ فارسی

(۱) حدیقۂ رنگین

(۲) مثنوی بہ طرزِ مولانا روم (از خمسۂ رنگین)

(۳) مجالسِ رنگین

(۴) اخبارِ رنگین

'حدیقۂ رنگیں'

رنگین کی فارسی شاعری

رنگین کا فارسی دیوان 'حدیقۂ رنگین' ہی جو 'نورتن رنگین' کا پانچواں حصہ ہی۔ اس کے خاتمے پر تاریخ لکھتے ہوئے رنگین کہتے ہیں :ے

چو شد باغ دیوانم ای دوستاں — تر و تازہ از نظم چوں بوستاں
ہزار و دو صد سال و سی بود و شش — ملقب من از 'نورتن'، کردمش
چو طومار فکرم بپایاں رسید — بہ خود ایں خیال از دلم سر کشید
کہ آخر دریں باغ رنگینِ من — بیایند یارانِ گل چینِ من
نشینند و گل گشت و باغم کنند — نظر در فروغِ چراغم کنند
بہ دستیست کاغذ بہ دستے قلم — کنم عذرہا بہرِ یاراں رقم
دگر بر لب آمد مرا متصل — صدائے پر از درد رنگیں ز دل
کہ گر بر در خانہ دل کس است — ز گفتار سعدیش حرفے بس است
مبادا کہ از نظم آید ملال — بہ تضمین سعدی کنم عرضِ حال

ان اشعار سے تاریخ تصنیف ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتی ہی۔

آخر میں اپنی شاعری کی مدت اور 'نورتن رنگین' کی تاریخ میں یہ گیارہ شعر کہے ہیں ے

کنوں بہرِ تاریخ آں بر محل — بدیہی رقم گشت رنگیں غزل

بحمد اللہ از نظمِ رنگینِ من — پُر آشوب گشتہ زمین و زمن
ز سرہند من، والد از روم بود — کنوں شہر دہلی ست مارا وطن
ز دل از سن پانزدہ سالگی — سوئے شعر شد رغبت طبع من
چو شد جودت طبع مائل بہ نظم — کشیدم بسے درد و رنج و محن
قلم کردم انگشت و دل رادوات — سیاہیش کردم ز مشک ختن
بسر شد دریں فکر پنجاہ سال — شگفتند مضموں چمن در چمن
بسفتم دُرِ معنئ بے بہا — بسے بہتر از سلکِ دُرِّ عدن
دریں باغ ہر سمت بشگفتہ است — گل و لالہ و نسترین و سمن
الٰہی بود تا زمین و زمن — ز گل گشت حظ برد مرد و زن
چو تاریخ جستم ز پیرِ خرد — بہ گفتا قلم بند شد لو رتن

۱۲۳۶ھ

دیوان کی پہلی غزل حافظ کی مشہور غزل کی زمین میں ہے جس سے حافظ اپنے دیوان کا آغاز کرتے ہیں ؎

شنیدم ساقیٔ کوثر توئی آں قبلۂ دل ہا — دم آبی کہ ہستم تشنہ ای حلّالِ مشکل ہا
بہ بنیادم[1] بہ عشقت آں چناں افتاد است مشکل ہا — نہ گویم زاں کہ لو گرد دغبارِ خاطرِ دل ہا
مسرت گردم بیا و سیر روز عید قرباں کن — کہ می رقصد بہ شکل مرغ بسمل نیم بسمل ہا
میسر آیدت گر صحبتِ کامل غنیمت داں — کہ اکثر ناقصاں کامل شوند از فیض کامل ہا
دلا ہر قطرۂ اشکم بہ جیحوں می زند پہلو — بہ عشقش دارمی خواہد لبِ خشکم ز ساحل ہا
کریما، خالقا، پروردگارا قدرتت نازم — چہ گل ہائے کہ پیدا کردۂ از آب در گل ہا[2]
رساں راحت بہ دل ہا از حصولِ مزرعِ دنیا — کزیں حاصل نہ شد ای دل دگر لغو اند حاصل ہا

---

[1] قلمی نسخے میں "نہادم" ہے [2] قلمی نسخے میں "دلہا" ہے لیکن قرینہ "گلہا" کا ہے۔

کنم پا و سر خود گم طلب گزراں طرف باشد برایش پا ز سر سازم کنم طی راہ منزل ہا
دلا راز من و او طشت از بام است افتادہ
بسانِ شعر رنگیں بر زبان اہلِ محفل ہا

فارسی اور اُردو غزل میں عشق و عاشقی کے مضامین متحد ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صنائع اور بدائع یا تکلفات اور ایجادات کا جو شوق رنگین نے اُردو کلام میں دکھایا ہے فارسی میں ویسا انداز اختیار نہیں کیا ہے ؎

به جز ہجر تو دیگر غم مبادا به جز عشق تو ام ہم دم مبادا
کسے کو پاے بند عشق نبود نشانِ او دریں عالم مبادا
اگر یک دم فراموشت نمایم نصیبِ دشمناں آن دم مبادا
بجانم آتشِ عشقت الٰہی ہمیشہ بیش بادا کم مبادا
کند طوفاں بپا ایں چشمِ رنگیں ہمیں ترسم کہ گردونم مبادا

شنیدم از طبیبانِ محبت کہ اصلا نیست پایانِ محبت
مکن روزِ سیاہم را منور توئی شمع شبستانِ محبت
چہ آفت ہا کہ آمد بر سرِ من فدائے عشق و قربانِ محبت
بہ یک لحظہ جہانے غرق گردد بترس اے دل ز طوفانِ محبت
کنم دعوائے خوں در روزِ محشر من و دست و گریبانِ محبت
بہ یادِ گل رخے اے غنچۂ دل کنم گل گشت بستانِ محبت
دلم صاف است چوں آئینہ ہم دم منم از بس کہ حیرانِ محبت
بخواں یک چند شعر نغز دیگر
توئی رنگیں غزل خوانِ محبت

بہ دردِ عشق درمانِ محبت کہ پیدا نیست پایانِ محبت

به جز غم نیست اصلا جنس دیگر — به بازار و به دوکانِ محبت
نه شد خورشید و مه ہم سنگ حسنت — چو سنجیدم به میزانِ محبت
به صد غمزه دل مارا نهانی — خراشیدی به سوہانِ محبت
بود ہر لحظه جولاں گاہِ عشاق — به میدان و بیابانِ محبت
چو فرہاد ار کنی کوه غمِ دل — بر آید لعل از کانِ محبت

نیاساید به دہر آں را که رنگیں
خلد در سینه پیکانِ محبت

اشک خوں چکیده را ماند — سینه جیب دریده را ماند
خطِ پشت لب تو ای نو خط — سبزهٔ نو دمیده را ماند
پیرہن بر تنم ز دستِ جنوں — چند تارِ تنیده را ماند
در چمن برگ گل ز شبنم صبح — لبِ دنداں گزیده را ماند
دل شکار کسے تواند شد — که غزال رمیده را ماند
تیرِ مژگاں او که در دلم است — خار در پا خلیده را ماند
دل افگار من به سیل سرشک — صید در خوں تپیده را ماند
سیب رخسارت ای بہارِ چمن — میوهٔ نو رسیده را ماند
نیست در بحر دہر ہیچ گہر — که به آب دو دیده را ماند

ای شه حسن بر درت رنگیں
بندهٔ زر خریده را ماند

در غمِ یار نه دانم چه کنم — ای دلِ زار نه دانم چه کنم
سبقِ اوّل عشق است مرا — مشق ایں کار نه دانم چه کنم
دم به دم گریهٔ طوفاں زایم — ہست بسیار نه دانم چه کنم

چشمِ مخمور تو چشم بد دور　　کرد بیمار نہ دانم چہ کنم
طبع موزوں نہ دارم رنگیں　　فکر اشعار نہ دانم چہ کنم

فلک گردد نہ گردد گر بکامم　　سرو کارست باعشقت مدامم
فراغت نیست از ہجر و غمِ وصل　　چہ می پرسی ز حالِ صبح و شامم
بہ یادِ چشمِ مستِ شیشہ بازے　　ہمی رقصد بہ روئے دست جامم
نہایت تشنہ ام ای خنجرِ یار　　چکاں یک قطرۂ آبے بکامم
دگر بر دست و پایم نیست بندے　　فقط زنجیر زلفے ہست دامم
بہ جز لخت دل و خونِ جگر آہ　　مپرس از اکل و از شرب مدامم
سراسر مثل نور العین واقف
بود رنگیں ہمہ طرز کلامم

می سوزم ای ماہ از نالہ و آہ　　واللہ باللہ باللہ و اللہ
کشتی بہ تیغم خوردی دریغم　　ای واہ ای واہ ای واہ ای واہ
در خلق یک سر شد شورِ محشر　　چوں آمد آں ماہ در بزم ناگاہ
از غصہ و غم تا چند میرم　　ہر گاہ و بے گاہ ای آہ جانکاہ
اقلیم دل را کردی تو یغما　　الملک[1] للہ والحکم[2] للہ
گردیدہ رنگیں از ہجر غمگیں
افتاد گم راہ دانستہ در چاہ

---

[1] لہ لہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" سے ماخوذ ہے۔ پارہ ۲۷ سورۃ الحدید۔ رکوع پہلا (اسی کے لیے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا)

[2] اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ سے ماخوذ ہے۔ پارہ ۱۲ سورۃ یوسف رکوع پانچواں (حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے) اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا اللہ اور ما الْحُکْمُ اِلَّا اللہ خوارج کے نعرے تھے۔

آں گل بہ مزار ما نیاید — ایں مرگ بہ کار ما نیاید
روز و شب تار ما نیاید — آں مہ بہ کنار ما نیاید
ہیہات کہ بے خلل شبِ وصل — در لیل و نہار ما نیاید
ماندہ است بہ گویش ایں قدر کا — از مشتِ غبار ما نیاید
آمد بد عہد باش ای آہ — لیکن بہ قرار ما نیاید
ما خاک شدیم و بس بر آں خاک — آں شاہ سوار ما نیاید
رفتند بسے مگر کسے آہ — از شہر و دیار ما نیاید
آمد بر عنبرے یار لیکن — در قرب و جوار ما نیاید
می کرد بہ بوسۂ دلم شاد — ایں کار نزیار ما نیاید

قربان سرش کہ گفت از ناز
رنگیں بہ نثار ما نیاید

یہ آٹھ غزلیں مجموعی طور پر فارسی میں رنگین کے عام انداز کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ فارسی غزل کے جو مضامین اُردو میں آئے ان میں ایک نہایت اہم مضمون تصوف کا ہے۔ ایرانی صوفیہ کی تعلیم اور صوفی شعراء کے کلام نے اس مُلک کی شاعری اور فلسفے پر جو اثر ڈالا ہے وہ نہایت ہی گہرا ہے۔ ہر دَور اور ہر زمانے میں قلی قطب شاہ سے لے کر اقبال تک اس کا ثبوت ملتا ہے۔ رنگین کے اُردو کلام میں ایسے مضامین کم ہیں جس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ رنگین کے لکھنوی دَور میں تصوف کو اُردو میں وہ اہمیت نہیں دی گئی جو میر و میر درد کے عہد میں حاصل تھی صرف کہیں کہیں ناسخ یا آتش کے یہاں بعض اشعار مل جاتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی لکھنوی شعراء کا کلام اس سے عاری ہے۔ رنگین کا اُردو کلام عام مجلسوں،

محفلوں اور مشاعروں میں پڑھا جاتا تھا، فارسی کا زور ٹوٹ چکا تھا اس لیے اب صرف خواص ہی فارسی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ رنگین کے یہاں ایسے مضامین بہ کثرت ہیں ؎

بے حجاب از پردۂ عصمت بہ بازار آمدی — بس کہ شکر است ایں کہ با تسبیح و زنار آمدی
کلمۂ توحید ای خالق گواہ ذاتِ تست — زاں کہ تو در پردۂ انکار و اقرار آمدی
حسرتِ دیدار دارم بس کہ مشتاق توام — گو بہ آغوشِ دلم از غمزہ صدبار آمدی
گاہ گفتی خلقتِ انساں ضعیف است و نحیف — گاہ چوں منصور[۱] انا الحق گوے بر دار آمدی
صاحبِ خانہ توئی ہر مسجد و بت خانہ را — ای کہ صدرہ در دل ہر مست و ہشیار آمدی
از رقیبِ روسیاہ پوشیدہ ای جانِ نگاہ — چوں بسر در خانۂ چشم سبکسار آمدی
تو نہ محتاجی بہ وحدت نی بہ کثرت پائے بند — لیک از وحدت بہ کثرت دہ چہ بسیار آمدی
ہست دایم وردم از دل آہ لاتقنطوا — در کلام از بس ز لطف خود گہربار آمدی
دوش در گوش دلم از غیب آمد ایں ندا — غم مخور ہر چند ای رنگیں گنہ گار آمدی

من از خواب عدم بیدار گشتم — گزر کردی بہ خاک من چہ کردی

قدرے نورش بہ چشم مردم نیست — ہست مارا ہوائے عریانی
کس چہ داند کہ میانِ من و او — ماجرائیست کہ من می دانم
نقش آبی ست بنائے ہستی — ایں بنائی ست کہ من می دانم
نیست آساں گزر از دہر کہ ایں — تنگنائیست کہ من می دانم
خاک ساری بہ جہاں ای رنگیں — کیمیائی ست کہ من می دانم

شوق دارد بہ وحدت و کثرت — پس ہر پردہ رازہا دارد
شمع ہر محفل است ای گل رُو — سوز دارد، گدازہا دارد

دل برم از نظر انداخت مرا — شکل آئینہ خود ساخت مرا

---

[۱] حسین ابن منصور

ز طوف کعبہ و بت خانہ ہا کے تنگ می گردد　　دل دیوانۂ من مائل ہر سنگ می گردد
بہ رنگ زلفش آشفتہ نہ گردد چوں دل جمعم　　کہ گرد دل بر سر من با ہزاراں رنگ می گردد

دوسرا مضمون عشق و عاشقی کا ہے۔ اردو کے مقابلے میں فارسی اشعار تعداً میں بہت کم ہیں لیکن ان میں جذبات نگاری کی بعض نہایت اعلیٰ درجے کی مثالیں موجود ہیں ؎

بیابانِ ہجر امکانے نہ دارد　　کہ ایں سرحد و پایانے نہ دارد
علاجش را چو پرسیدم ز بقراط　　بہ گفت ایں درد درمانے نہ دارد
مارا کہ دل ہمیشہ بہ سوئے تو می کشد　　بے اختیار جانب کوئے تو می کشد
بے تو اے ماہ چہ می باید کرد　　نالہ یا آہ چہ می باید کرد
ناصح نیست کلامت دل چسپ　　ای دل آگاہ چہ می باید کرد
دارم بہ ذوقِ وصل او در دل تمنائے دگر　　می خواہم ایں شب بہ گزرد خوش تر ز شب ہائے دگر
بارہا دیدہ سزا یافتۂ　　باز سویش نگرانی ای دل
می کند جور و جفا چوں بر ما　　غافل از دردِ نہانی ای دل
تو کہ در پہلوئے رنگین آہ　　سنگ و سنگین گرانی ای دل
دور از تو جفا کشیدم　　دیدم در ہجر آں چہ دیدم
بر وعدۂ وصلت ای جفا جو　　دی شب ہمہ شب نہ آرمیدم
در گلشنِ دہر ہم چو سبزہ　　خشکیدم و بارہا دمیدم
الٰہی بگزرد دامن کشاں یار از مزار من　　مبادا دامنش آلودہ گردد از غبار من

بعض مضامین ایسے ہیں جو فارسی غزل سے مخصوص ہیں اور جو اردو میں اس ذریعے سے داخل ہوئے۔ ایسے مضامین رنگین کے کلام میں اس طرح کے ہیں :؎

اگر صاف است آئینہ رخ دل بر شود پیدا | کہ تا صیقل نہ گردد تیغ کی جوہر شود پیدا
دلے کو سوخت در ہجر بتاں ہرگز نشگفت ہرگز | مخور بے ہودہ غم کو گل زخاکستر شود پیدا

خویشتن را مکو تو پستہ دہن | پستہ خود در خورد ہاں تو نیست
لعل ہم سنگ آستان تو نیست | لامکاں بہتر از مکان تو نیست
ابر ہم سر بہ سائیاں تو نیست | کہکشاں نصف نردباں تو نیست
ہر کہ آئینہ داد در دستت | ہرگز آں کس ز دوستاں تو نیست

چشم حارص راز خواہش سیر کردن مشکل است | بے دوا سیماب را اکسیر کردن مشکل است

خطِ سبز ش اگرچہ رُستہ دیر است | دلے صد شکر سیر و نیم سیر است
کہکشاں نیست مگر آہِ من است | کہ سر سقف فلک زینہ کشید

اس مجموعے میں ایک غزل نئے انداز کی بھی ہو جسے وہ اپنی ایجاد بتاتے ہیں اور جس کا عنوان "غزل خود بہ طورِ ایجاد" ہو۔

صد ظلم از حد افزوں کردی | سرگشتہ دستِ جنوں کردی
چوں بودم واکنوں چوں کردی | ای عشق مرا مجنوں کردی

بر لالہ رخاں مفتوں کردی

سنجیدہ رختِ پریشانی | پوشاندہ لباسِ حیرانی
بدریدہ جیب ہمہ دانی | وزدیدہ قبائے عریانی

بر قامتِ من موزوں کردی

بودست مرا نی رنج نہ غم | چوں الفتِ خوباں شد ہمدم
در عین شدائد درد و الم | از زلف بہ بستی دست دلم

پابستہ بہ دامِ جنوں کردی

از جور و جفا ہا بیختیم | با زلف دوتا آویختیم

در خاک بہ خوں آمیختیم   از خنجرِ غم خوں ریختیم
گلگوں کردی ممنوں کردی

ماراست تمنا سرو نہ گل   نی رغبتِ فاختہ و بلبل
نی ذوق کشیدن ساغر مُل   جز خواہش وصل بتاں بالکل
از سینۂ من بیروں کردی

جنبا ندی رشتۂ صدکیں را   آزردی چرا من مسکیں را
اکنوں تو بہ گو آں بے دیں را   ہر قطرۂ اشک رنگیں را
سیحوں کردی جیحوں کردی

غزلوں کے علاوہ پانچ مخمس، دو مربع اور دو مثلث بھی شامل ہیں ان کا نمونہ یہ ہے ۔

"مخمس غزل خود"

ہر چہ می گویمت آنی ای دل   دل نئی بلک تو جانی ای دل
منظہرِ دردِ نہانی ای دل   نہ چنیں نہ چنانی ای دل
تو مجسم خفقانی ای دل

یا رب بے مہر و وفا یا فتنۂ   بانیٔ ظلم و بلا یا فتنۂ
موجدِ جور و جفا یا فتنۂ   بارہا دیدہ سزا یا فتنۂ
مار سولیش نگرانی ای دل

عشق ہر کس کہ بہ خواہد ورزد   لیک حاصل نہ شود وصل بہ کد
ایں سخن ہست ز استاد سند   بے اثر فائدہ ہرگز نہ کند
خوں اگر از دیدہ فشانی ای دل

از من ای دل تو کہ دل گیر شدی   عشق ورزیدی و تسخیر شدی

طوق پوشیدی و زنجیر شدی در غمِ عشقِ بتاں پیر شدی
کردہ برباد جوانی ای دل
از غمِ عشق تو غمگینی آہ پُر ز بغض و حسد و کینی آہ
ایں سخن نیست ز خودبینی آہ گو کہ در پہلوئے رنگینی آہ
سنگین و سنگ گرانی ای دل

مربع غزل تصنیف خود

از جوشِ جنوں سرشار شدم رسوا بسرِ بازار شدم
با سیم براں چو یار شدم
آوارہ شہر و دیار شدم
جانا کردی غمخواریٔ من ایں است عیاں عیاریٔ من
در نشہ بہ بیں ہوشیاریٔ من
بے خود کردی ہشیار شدم
کی طالب ساغرِ مُل بودم فارغ ز گُل و سنبل بودم
ہر چند سبک از گُل بودم
در چشمِ رقیباں خار شدم
او دست ز من افشاندہ چشم در غم کدہ ام بہ نشاندای چشم
چوں گوہرِ اشک نہ ماندای چشم
منعم بودم نادار شدم
اصلاست خیال ہند و نہ چین دارم ہوس دنیا و نہ دیں
در خواہشِ وصلِ بتاں رنگین
از ہر دو جہاں بیزار شدم

مثلث غزل تصنیف خود

نیست کم از بہاری اشک ہست ز چشم جاری اشک
رشک ابر بہاری اشک

خشک شدی رفتی از کار چشم اثر زنہار مدار
گر ای چشم نہ داری اشک

بس کہ کشیدم رنج والم سینہ بسوزد ز آتشِ غم
گر نہ کند غم خواریٔ اشک

روز و شب چوں ابر بہار چشمۂ چشم را تر دار
گو بے کار و بہ کاری اشک

ہر جا سبزہ دمد ای چشم ابر خجل گردد ای چشم
گر بہ غم او باری اشک

خوردی زہرِ ہجرِ بتاں در غم عشق سبز خطاں
رنگین شد زنگاری اشک

رباعی

چشمے دارم کہ صد تماشاست درو اشکے دارم کہ موج دریاست درو
رنگیں دارم دل پُر از خونِ جگر یک سر دارم ہزار سوداست درو

در تعریف مسجد جامع شاہ جہاں آباد

ایں مسجدِ جامع چہ صفائے دارد جان دہلی ست خوش ہوائے دارد
ای کعبہ مناز برلواح حرمت ایں تازہ اساس ہم فضائے دارد

قطعہ تاریخ وفات خود کہ از عجائبات است

گفت ہاتف بہ گوش رنگیں دوش سال موت و حیاتش از سر ہوش

یعنی ہشتاد سال در عالم — زندگانی بہ کن نہ بیش و نہ کم
بہ ہزار و صد و یک و ہشتاد[1] — اتفاق تولدت افتاد
بہ ہزار و دو صد و یک[2] و پنجاہ — گردد ت کشتئ حیات تباہ
گفتہ تاریخ ہیچ کس نہ چنیں — توفیں دان و نظم کن رنگیں
نظم کردم غرض بہ تو بخش — لفظ تاریخ گشت تاریخش
غور تاریخ نظم چوں کردم — لفظ تاریخ آمد از دردم
در ہزار و دو صد و یک و دہ سال — گفت ہاتف بہ گوش ایں احوال
چوں شنیدم من ایں ز ہاتف غیب — شد یقینم ز صدق دل لاریب
غور بر معنیش چو کرد خیال — پیش تر گفت ہاتفش چل سال

حصۂ چہارم خمسۂ رنگیںؔ مثنوی بہ طرز مولانا روم

فارسی دیوان کے بعد فارسی شاعری میں رنگینؔ کا دوسرا قابلِ ذکر کارنامہ فارسی میں ایک مثنوی ہے جو مولانا روم کی مشہور مثنوی معنوی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ مولانا رومؔ کی مثنوی ان کتابوں میں ہے جس نے بلاشبہ فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعراء کو متاثر کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسے "قرآن در زبانِ پہلوی" کہا جاتا ہے اور صوفیانہ ادب میں جو مرتبہ اسے حاصل ہے وہ بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کا یہ فیض اب تک جاری ہے۔ چناں چہ عصر حاضر میں علامہ اقبال جو مولانا کو اپنا پیرو مرشد بتاتے ہیں ان سے بے حد متاثر ہیں اور اپنے کلام میں جا بہ جا مثنوی کے اشعار نقل کرتے ہیں۔

مثنوی مولانا روم کا موضوع تصوّف و حقیقت اور سلوک کے منازل

[1] یہاں رنگینؔ اپنا سال ولادت سنہ ۱۱۷۱ھ بتاتے ہیں لیکن اور تمام شہادتوں سے ۱۱۷۰ھ ہے۔
[2] یہ تاریخ وفات صحیح نکلی۔

ہیں۔ اس میں حکایات بھی ہیں اور پند و نصائح بھی۔ فلسفیانہ اور حکیمانہ نظریات اور افکار بھی ہیں اور عارفانہ رموز و نکات بھی۔ ان تمام مسائل کے بارے میں مولانا روم کا ایک خاص نقطۂ نظر ہی جس کا مقصد تزکیۂ نفس، روحانی اصلاح، اخلاقی تربیت اور انسان کی تہذیبی ترقی ہی۔ مولانا روم کا عارف اقبال کے مردِ کامل یا مردِ مومن کی طرح جلال اور جمال کا پیکر ہی۔ اس کی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہی جو صرف مادیات تک محدود نہیں ہی۔ یہ بات بڑے تعجب کی ہی کہ سعادت یار خاں رنگین جیسا انسان جس کی ساری زندگی عیش و عشرت اور لہو و لعب میں گزری ہو وہ ان اعلیٰ اقدار کی طرف کس طرح مائل ہوسکا۔ ممکن ہی کہ رنگین کو کچھ تو اپنے اعمال پر ندامت ہوئی ہو کچھ لوگوں کے اعتراضات یا طعنوں سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی پر معرفت شناسی کا پردہ ڈالا ہو۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہی کہ وہ مثنوی کے شروع میں ایک بزرگ مولوی نظام یحییٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

مولوی یحییٰ کہ جانِ علمِ دین است — بے شک و شبہ کانِ علمِ دین است
چوں بیاں سازد زحمدِ کبریا — می نماید راہِ پاکِ انبیا
کافرے گر بہ شنود تقریرِ او — گردد از اسلام دامن گیرِ او
فیضِ روحانی بہ جانش طاری است — کلمۂ حق بر زبانش جاری است
کن دلا تحصیل علمِ دیں از او — بہ گزر از الفاظ معنی را بہ جو

مثنوی کا آغاز حسب دستور حمد و نعت سے ہوتا ہی۔ بعض اشعار حسب ذیل ہیں ؎

تو کریمی و رحیمی ای خدا — تو دلِ رنجور را ہستی دوا
تو عطا کردی شکر در نیشکر — ناکسے را می خورانی کز شکر

آں یکے را تاج شاہی می دہی وان دگر را تو تباہی می دہی

آگے چل کر کہتے ہیں کہ اے خدا تو ہی جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت۔ پھر اپنے لیے التجا کرتے ہیں :-

روشنیٔ نورِ ایماں کن عطا باز دار از ظلمتِ جہل و خطا

رزق من از خوانِ وصل خویش دہ دہ دلے لیکن دلے پُر ریش دہ

خاطرم از قربِ شیطاں کن نفور دُور تر ہرگز مفگن از حضور

تو رہاندی از بلا ایوبؑ را شادماں کردی دلِ یعقوبؑ را

نوحؑ و یونسؑ را رہاندی از بلا ابنِ مریمؑ را کشیدی از جفا

ایں زماں از فضل عام تو ای الٰہ بر مرادِ خود رسد ایں روسیاہ

اس کے بعد نعتِ رسول ہے جس کے کُل پانچ شعر ہیں شروع

یا رسول اللہ بہ حالم در نگر تا چو محروماں نہ گردم در بہ در

حمد و نعت کے بعد اصحاب کی تعریف ہے اور پھر اصل مثنوی شروع ہوتی ہے۔ حکایات کی کُل تعداد ۲۳ ہے۔ ان کا عام انداز حسب ذیل نمونے سے ہو سکتا ہے:-

"حکایت در بیان ملاقات لیلیٰ با مجنوں کوہستان و بیان مقام عرفان"

ناقۂ لیلیٰ جدا شد از قطار اتفاقاً رفت سوئے کوہسار

ہر درخت انجا خیال عشق داشت غیر عشق آں جا یکے خارے نہ کاشت

ہر چہ آں جا از غبار و خاک بود در خیال یار خود غم ناک بود

بود لیلیٰ در تلاشِ رہ برے غیر مجنوں بد نہ آں جا دیگرے

ناگہاں از دورِ مجنوں را بہ دید در لباسِ خاک ساری ناپدید

لیلیش نہ شناخت کیں جانِ من است در غمِ من خاک بر سر افگن است

در فراقم شد زخانؔ و ماں جُدا — سلطنت بہ گزاشت شد مسکیں گدا
گفت لیلیٰ ای فلاں تو کیستی — در بیاباں از چہ صورت زیستی
گفت انا لیلیٰ انا لیلیٰ انا — غیر لیلیٰ از نگاہم شد فنا
گر ز دریا سر بروں آرد حباب — باز خود گم می شود بر روئے آب
ہم چنیں عاشق کہ از خود گم شود — بیخ مائی و توئی از دل برکند
آں چناں نورش در آید در نظر — از انا لیلیٰ نماند بے خبر
چوں نمودہ خویش را مجنوں فنا — آں زماں گفتہ انا لیلیٰ انا
ایں رموزِ عشق چوں لیلیٰ شنید — آہ سردے از دلِ خود برکشید
از سرِ ہودج فگندہ خویش را — از تعشق بوسہ زد بر دست و پا
گفت ای مجنوں کجائی تو کجا — ای دلِ بیمار لیلیٰ را دوا
گاہ لب بوسید گاہے موئے او — گہ نہادے روئے خود بر روئے او
گہ ز مقنعؔ جسم او را پاک کرد — گہ بر احوالش بر آورد آہ سرد
بعد دیرے چشم را مجنوں کشاد — دید لیلیٰ را و بر پایش فتاد
گفت از حیرت کہ ای رشکِ بہار — چوں رسیدی درمیانِ کوہسار
ایں مکاں از بہرِ ہم چوں من کس است — کس چو من ہرگز نہ شد صحرا پرست
دل ز خویش و اقربا برداشتم — خاکیم در خاک مسکن ساختم
در بہ در گشتم بہ عشقت مبتلا — کو بہ کو انگیختم رنج و بلا
ہر طرف خوردم ز طفلاں سنگ و خشت — دوستاں دیدند مارا خوئے زشت
زیں سخن لیلیٰ بر آورد آہ سرد — گفت با مجنوں بہ صد فریاد و درد
ایں زماں در پہلوئے تو حاضرم — ہرچہ خواہی کن مکن ای دلبرم
من قناعت کردہ ام بر نام تو — داں کنیز خود مرا دیگر مگو

سلہ خانماں — سلہ مقنعہ۔ ۶ چادر باریک جو ایک عرض کی ہو۔ ایک پٹی اوڑھنی

جان و دل از تیر عشقت دوختم | یعنی سرتاپا بہ عشقت سوختم
ای تو معشوقی منی من عاشقم | برقرارت از دل و جاں صادقم
گفت مجنوں لیلیا آہے مکش | بر تپش دیگر مدہ چندیں تپش
ہر چہ می گوئی ہمہ یک یک بجاست | لیک دزدی پیش صادق ناروا ست
در نصیبم از ازل بود ایں مکاں | کردۂ معبود بے حکمت مداں
عاشقاں را خاک ساری زیب داں | قاقم و سنجاب بہر مہ رخاں
بود در ہر دو بہم ایں ماجرا | ز اقربا ئیش آمد و بر دش بجا
ای دل ای دل قدرتِ صانع ببیں | گونہ گوں صنعت نمودہ برزمیں
آں یکے را بخش ملک و مال داد | دیگرے بر تنگئ قسمت بزاد
ایں یکے شاد است بر فعلِ حرام | واں دِگر در اِتقا شد نیک نام
ایں یکے خود و عظامی گوید بلند | واں دگر با دل ربا شد بہرہ مند
در حقیقت گرچہ از نسل یک اند | لیک از حکمت جدا گونہ شدند
گر بہ یک صورت ہمہ پیدا شدے | دوزخی و جنّتی یکساں بودے
در جہاں گر جملہ گشتندے عزیز | کے شدے در مومن و کافر تمیز

بعض اور حکایتیں حسب ذیل ہیں :

"حکایت حضرت بایزید روزِ عید" کے عنوان سے ہے جس کے ۲۸ شعر ہیں یہ پہلی حکایت ہے۔

عید کے روز بایزید مسجد سے نکلے تو ایک شخص نے ان کے سر پر خاک ڈال دی۔ بایزید نے سلام کرکے آہستہ سے کہا کہ میں تو اس سے بھی بدتر ہوں۔ میں خاک تھا تو نے بھی مجھ پر خاک ڈال دی۔ یہ بات سُن کر اس شخص نے شرمندہ ہو کر آہ سرد بھری اور جاں بحق ہو گیا۔ شروع ہے

آں شنیدستی کہ روزے روز عید | از درِ مسجد بروں شد بایزید
طشت خاک افگند شخصے بر برش | گشت آلودہ سرو دوش دبرش
کارِ نخوت بطوقِ لعنت می دہد | عجز درجنّت مکانت می دہد
جامۂ صوف ریائی چاک کن | خلوت دل را زغیرے پاک کن

پھر خاک ساری کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

خاک ساری پیشہ کن بے باک باش | در تلاشِ وصل او چالاک باش
ہر کرا خواہد سلیماں او کند | ہر کرا خواہد پشیماں او کند
لطف او عام است وفضلش بے شمار | عاجزاں را می دہد عزّ و وقار

اس کے بعد انسان کو بغض وحسد سے دل پاک رکھنے کی تلقین کی ہی :-

کینہ را از سینۂ خود دور دار | زرم جوئی از ہمہ منظور دار
منّت احساں مفگن بر فقیر | طعنہ وبغض وحسد بر خود مگیر
کارِ مجہولاں دل افگاری بود | رسمِ مقبولاں کرم کاری بود
عشرتِ دنیا ہمہ بے راہی است | محنتِ عقبیٰ ہمہ آگاہی است

آخر میں فرماتے ہیں :-

بوئے گُل دادن نہ کارِ ہر خس است | ناخدا بودن نہ رسم ہر کس است

دوسری شکایت بھی ۱۸ اشعر پر مشتمل ہی جس کا عنوان یہ ہی :-

' حکایت دربیاں ایں کہ '

شروع :-

عُجب ونخوت را بہ طرفے کن نہاں | تخمِ عبرت را بہ کشتِ دل فشاں

آگے چل کر کہتے ہیں کہ ذات پات کا خیال ترک کرکے اپنی ذات میں

خوبیاں پیدا کرے

پردۂ بے ہودگی را چاک کن   در تلاشِ ذات بر سر خاک کن

تیسری حکایت میں ۴۲ شعر ہیں جس کا عنوان ' حکایت در بیان احوالِ دہقان ضرب المثل برائے انسان ' ہے۔

کسان زمین جوت کر بیج بوتا ہے پھر اس کی حفاظت جاں فشانی سے کرتا ہے جب اُگنے کے بعد کھیت میں چور آتا ہے تو وہ کسان اس چور کے تیر مارتا ہے یا شور مچاتا ہے اور جب ژالہ باری ہوتی ہے تو اللہ سے فریاد کرتا ہے کہ اس کی کھیتی آفت سے محفوظ رہے۔ اسی طرح ای انسان تو بھی ؎

کشتِ خود را ہم چوں آں دہقان پیر   ہاں بکار و سبز کن نقصاں نگیر

اس چوتھی حکایت میں ۱۲ شعر ہیں جس کا عنوان ' حکایت در بیان احوال کسانے کہ دنیا دار اند و دنیا را نہ می گزارند ' ہے۔

شروع ؎

اہلِ دنیا را بہ دنیا در گذار   در طویلہ بستہ بر پائے حمار

دنیا دار سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو گورستان جا کر عبرت حاصل کر کہ بڑے سے بڑے دنیا دار کے اعضا خاک میں رلے پڑے ہیں :؎

گو قبائے اطلسِ چین و حریر   گو شراب و لقمۂ نان و پنیر

نی ز بام و صحن و دالاں پیش رو   نی ز مال و گنج و خبثِ مادلو

پانچویں حکایت ' در بیانِ تعلیم یافتن عالم با تدبیر از درویش روشن ضمیر ' ۔

ہو جس کے ۸ اشعر ہیں۔ شروع

دوستی می داشت عالم با فقیر ہر دو در علم و طہارت بے نظیر

گر یکے را مشکلے پیش آمدے دیگرے مقصود کارش می شدے

نزد عالم داں دگر چوں آفتاب زیرِ ظلِ فقر او خود ماہ تاب

کتاب میں کل چھ سو اشعار ہیں جنھیں دس روز میں نظم کیا گیا ہو ؂

شعر در دہ روز شد شش صدبیاں از برائے خاطر شمشیر خاں

مثنوی کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں ہو لیکن مذکورہ بالا شعر کے مصرع ثانی سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ مثنوی شمشیر خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی یہ وہی شمشیر خاں ہیں جو نواب باندہ کے مصاحبِ خاص تھے اور جن کی وجہ سے رنگین باندہ میں مقیم تھے[1] رنگین ۱۲۴۳ میں باندہ پہنچے تھے۔ قلمی نسخہ موجودہ انڈیا آفس میں اس مثنوی کی تاریخ کتابت ۱۲۴۸ھ ہو اس حساب سے مثنوی کو ۱۲۴۳ سے ۱۲۴۸ تک کسی سن میں تصنیف کیا ہوگا۔

مجموعی طور پر رنگین کا فارسی کلام جتنا کہ 'حدیقۂ رنگیں' میں موجود ہو مقدار یا فنی حیثیت سے اُردو کلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس میں رنگین کی طبیعت کی ایجاد کا مادہ یا ان کی قادرالکلامی یا دوسرے فارسی گو شعراء کے مقابلے میں ان کی ترجیح کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لیے اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تاریخی کہی جاسکتی ہو۔ یا یہ کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں جنھوں نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں رنگین کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

---

[1] قصیدہ خوشیہ کی تمہید کلام کا یہ شعر ؂

کہ باندے شہر میں جو میں ہوں آیا مجھے شمشیر خاں نے ہو بلایا

مجالسِ رنگیں

اسی سلسلے کی دوسری اہم کتاب "مجالسِ رنگیں" ہے جس میں رنگین نے مختلف شاعروں اور اپنی گزشتہ صحبتوں کا حال تحریر کیا ہے۔ رنگین سیاح قسم کے آدمی تھے چناں چہ انھوں نے شاہ جہاں آباد کے علاوہ اکبر آباد، لکھنؤ، نجیب آباد، کٹھیر، ہردوار، جگادھری، سرہند، امرت سر، لاہور، بیکانیر، جودھ پور، کوٹہ بوندی، اودھے پور، اجین، بندیل کھنڈ، الہ آباد، عظیم آباد، راج محل، کلکتہ، ڈھاکہ، پلنیاں، ترائی نیپال، فیض آباد، پیلی بھیت، فیروز پور جھرکہ، پالی پاکھر، پرگنہ نوح، بادشاہ پور، رام پور، پاٹن، اجمیر، جہاں گیر آباد، سہارن پور، گوالیار، نارنول، پرگنہ بادل[1]، کالوڈ، فرخ آباد، بنارس، مرشد آباد، روداڑی اور کوہ شہروں کی سیر کی تھی اور طرح طرح کے لوگوں سے ملے تھے ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ بعض شاعر تھے، بعض سپاہی پیشہ۔ بعض سخن فہم بعض درویش، ان میں سے بعض رنگین کے ہم عصر اور ہم طرح تھے اور بعض ان کے شاگرد ان لوگوں کی صحبتوں میں جو جو دلچسپ باتیں گزری ہیں ان میں سے بعض "مجالس رنگین" میں نقل کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:-

"مجالسِ رنگیں" یقیناً نثر کی پہلی کتاب ہے جو رنگین کے قلم سے نکلی اور ان کی تصنیفات کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے

---

[1] رنگین نے مجلس ہفدہم میں ذکر کیا ہے کہ یہ پرگنہ روداڑی کے قریب ہے، اس میں اسی گاؤں ہیں اور یہ میرے والد کی جاگیر میں تھا۔

کہ یہی نثر کی آخری کتاب بھی ہے۔ ان کی کسی دوسری نثر تصنیف کا پتہ اب تک نہیں چلا ان کی فارسی نظم بھی سیدھی سادھی ہوتی ہے۔ چند غزلیں اس کتاب میں جا بہ جا درج ہیں ان سے ان کی فارسی شاعری کا انداز معلوم ہو سکتا ہے۔"

اگرچہ اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن انڈیا آفس میں رنگین کے جو نسخے موجود ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رضوی صاحب کا یہ قول درست نہیں ہے کہ 'مجالسِ رنگین' نثر کی پہلی کتاب ہے جو رنگین کے قلم سے نکلی اور یہی نثر میں ان کی آخری کتاب بھی ہے؛ کیوں کہ نثر میں کئی اور کتابوں کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً "اخبارِ رنگین"، "امتحانِ رنگیں"، اور "تجربۂ رنگیں"، نہایت اہم کتابیں ہیں اور ان کا ذکر بھی کیا جاچکا ہے البتہ "مجالسِ رنگیں"، اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں رنگین نے جس قدر ذاتی واقعات و حالات لکھے ہیں وہ ان کی اور تصانیف میں کہیں نہیں ملتے۔ حسبِ ذیل مجلسیں خاص طور پر نہایت اہم ہیں:۔

مجلسِ اوّل

از پنجاہ سال معمول حضرت شاہ حاتم شاہ صاحب کہ حاتم تخلص می فرمودند در شعر استادِ بندہ بودند مدام چہار گھڑی روز باقی ماندہ در تکیہ شاہ تسلیم شاہ کہ زیر قلعہ مبارک بادشاہی است تا شام نشستہ می مانند اگر شاگرداں و مردماں دیگر کہ در خدمتِ اوشاں ارادت داشتند آں جا حاضر می شدند روزے در ایام نو مشقی بندہ دراں تکیہ بہ خدمت شاہ صاحب موصوف نشستہ بود۔ محمد امان خاں نثار تخلص و مردے اکبر علی اکبر و لالہ مکندرائے فارغ

---

[1] مطبوعہ میں نام مکند رائے ہے۔

ومیاں غلام علی شاہ غلامی و مرزا عظیم بیگ عظیم وغیرہ چند شاگردان و مردم دیگر حاضر بودند حضرت شاہ فرمودند کہ شب در خواب ایں شعر گفتہ بودم چوں بیدار شدم یاد ماند ؎

سر کو پٹکا ہی کبھو سینہ کبھو کوٹا ہی — رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہی

چوں کہ عالمِ جوانی بود در مزاج چالاکی بسیار و شعور کم بود بے تکلف گستاخانہ عرض کردم کہ اگر مصرع ثانی را چنیں ارشاد فرمایند بہتر است ؎

سر کو پٹکا ہی کبھو سینہ کبھو کوٹا ہی — ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہی

بمجرد شنیدن دست بندہ را گرفتہ قریب خود کشیدہ دست بر سر و سینہ کردانده فرمودند کہ آفرین و تحسین انشاء اللہ تعالیٰ بعد چندے مشق ایشان نہایت ترقی خواہد کرد سبب ایں کہ در اوّل مشق ایں حالت است و بطرف دیگراں مخاطب شدہ فرمودند مثل ہندی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ "لیکن[1] باز بہ وقتِ تنہائی بہ بندہ ارشاد کردند کہ در دیوان خود ہمیں قسم خواہم نوشت لیک باز ایں قسم حرکت نہ خواہند کرد از آداب نہایت دور است در تنہائی اظہار می کردند ایشان برائے تربیت در ایں جامی آیند ازیں جہت آگاہ کردہ شد"

مجلس چہارم در شاہ جہاں آباد

در محفلِ شادی شخصے برادر مہربان انشاء اللہ خاں و سبحان قلی بیگ راغب و برادر مہربان مسیح الزماں حکیم محمد اشرف خاں خلف الرشید حکیم شریف خاں صاحب و دیگر مردم نشستہ بودیم ذکر رباعیات فارسی بود ہر کسے رباعی خوب از ہر استادی خواند مرزائے موصوف فرمودند کہ استاد من یعنی مرزا باقر شہدی

---

[1] یہ عبارت مطبوعہ میں نہیں ہے

درجنگ خود نوشتہ اند کہ بہتر ازیں رباعی شنیدہ و دیدہ نہ شدہ ؎

مجنوں بہ ہوائے لیلیٰ در دشت — در دشت بہ جستجوے لیلیٰ می گشت
می گشت ہمیشہ بر زبانش لیلیٰ — لیلیٰ می گفت تا زبانش می گشت

ہمہ را بسیار پسند کردند بندہ عرض نمود کہ واقعی رباعی بسیار عمدہ و نادر است لیکن دو جا قافیہ می گشت بہ یک معنی است معنی دیگر در عقل نہ می گزشت است۔ چوں ہمہ صاحباں غور کردند معنی دیگر سوائے گردیدن از "می گشت" پیدا نہ شد بعد آں بندہ بہ قدر حوصلہ خود بدیہہ ایں رباعی در ہندی زباں بہ ہماں طرز عرض کرد لیکن دراں رباعی مضمون لیلیٰ و مجنوں بود بندہ مذکور شیریں و فرہاد بیان کردہ خواند ؎

فرہاد کو شیریں جو بہت آتی یاد — یاد اس کی سے اپنے دل کو وہ رکھتا شاد
شاد اس کا ہمیشہ ذکر رکھتا اس کو — اس کو کر یاد شاد رہتا فرہاد

بعد شنیدن ایں رباعی حاضران مجلس تحسین و آفریں کردہ مجوز گشتند کہ چند رباعی دیگر از تصنیف خود بہ خوانند بہ پاس خاطر اوشان دو سہ رباعی دیگر خواندم۔

رباعی مستزاد[1] رنگین

ایک وضع پر گزارا نہ ہوا — دنیا میں آہ
گزرا جو کچھ وہ پھر دوبارا نہ ہوا — ہر شام و پگاہ
چاہا ہم نے بہت نہ چاہا اس نے — مجبوری ہے
چاہا اس کا ہوا ہمارا نہ ہوا — اللہ اللہ

---

[1] مطبوعہ نسخے میں مستزاد کا ذکر نہیں نہ مثالوں میں مستزاد کا ٹکڑا ہے۔ حال آں کہ رنگین اپنے اس اضافے اور ایجاد پر بڑا زور دینا چاہتے ہیں۔

زاہد کہتا ہی بُت پرستی کو چھوڑ ۔ ای بندۂ حق
راہب کہتا ہی دل سے مستی کو چھوڑ ۔ لے مجھ سے سبق
رنگین کہتا ہی تو نہ سُن دونوں کی ۔ گر عاقل ہی
تجھ سے جو ہو سکے تو ہستی کو چھوڑ ۔ اُلٹا دے ورق

ہر چند جورِ گردوں سہیے ۔ پیہم پیہم
لیکن لازم یہی ہی چپکے رہیے ۔ بس کھنیچ کے دم
سُنتا ہی نہیں کسی کی مطلب کی کوئی ۔ گوشِ دل سے
کس کی سنیے اور اپنی کس سے کہیے ۔ حیران ہیں ہم

کوشش میں تو نے تقصیر نہ کی ۔ در عینِ شباب
وہ کام نہیں کہ جس کی تدبیر نہ کی ۔ کر دیکھ حساب
لیکن افسوس ہی کہ ناداں تو نے ۔ بے عقلی سے
کچھ خانۂ آخرت کی تعمیر نہ کی ۔ ای خانہ خراب

بجتے ہوئے جن کے آگے تاشے دیکھے ۔ رنگین دن رات
نہلائے ہوئے پھر ان کے لاشے دیکھے ۔ آخر ہیہات
اب چاہیے خلق آکے دیکھے ہم کو ۔ اور عبرت لے
ہم نے یہاں کیا کیا تماشے دیکھے ۔ کھو کر اوقات

مجلس ششم در شاہ جہاں آباد

روزے[1] بہ خانہ سبحان قلی بیگ راغب بندہ و مرزا لکھو بیگ کہ شور تخلص می کردند و بندہ و چند اشخاص دیگر نشستہ بودیم یکے گفت کہ شعر صاف خوب می باشد دیگرے اظہار کرد کہ شعر تلاشی و دقیق معنی دار بہتر می شود ہمہا

[1] اس مجلس سے شاعری کے بارے میں رنگین کے ایک خاص نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

بندہ را منصف نمودند گفتم اگر در تذکرہ ہا دیدہ ام کہ قدما تعریف شعر صاف نوشتہ اند کسے وصف دقیق نہ نوشتہ و اکثر بر زبان مردم شعر ہا صاف می آید واز ہر استاد شعر ہائے صاف مشہور اند سبب ایں کہ شعر صاف خاص پسند و عام فہم می باشد چناں چہ ایں شعر خاقانی وسعدی در ہر تذکرہ دیدہ شدہ واز زبان مردم شنیدہ شدہ ؎

ہم سایہ شنید نالہ ام گفت خاقانی را دیگر شب آمد.

سعدی از داغ جگر پنبہ مکش مکشا روزنِ آتش کدہ را

اظہار نمودم کہ انتہائے شعر این است کہ صاف باشد ولئے بران شعر کہ درخواندن چند بار معنی در فہمید آیند وسوائے در شعر صاف عشق محاورہ و اصطلاح و معنی ہرگز نہ می شود۔ سبب ایں کہ در فہم ہر کس معنی شعر بہ آسانی می آید آں چہ دراں قباحت می باشد جلد دریافت می گردد ازاں جاست کہ شعر صاف گفتن دشوار است و در شعر دقیق کہ خلل می آید مردم عام قصور فہم خود دانستہ خاموش می مانند و مردم خاص می فہمند کہ شاید شاعر بہ جائے خود استعارہ کردہ باشد کہ بہ کنہ آں نہ رسیدہ ایم خصوص در شعر ہندی کہ دقیق باشد بجلد قباحت معلوم می شود وجہ ایں کہ دریں زباں کار لغات نیست شعر صاف اگر ہم راہ محاورہ و اصطلاح و معاملہ بندش یابد بے کیفیت زنہار زنہار نہ خواہد بود۔ اہلِ محفل فرمایش غزل صاف از بندہ کردند ایں غزل مسجع خواندم ؎

عشق میں تیرے مرا رنگ زعفرانی ہے ضعف ہے رفیق اپنا یار ناتوانی ہے

کس سے میں کہوں یہ بات دل نہیں بلا ہیہات اس گلی میں ساری رات خاک ہم نے چھانی ہے

آئے گا وہ یاں شب کو مجھ سے تو کہے ہے جو نامہ بر قسم کھا تو اس کی یہ زبانی ہے

دیکھیو قیامت ہے یا بلا ہے آفت ہے قد نہیں قیامت ہے قہرِ آسمانی ہے

کہہ چکا ہوں میں سو بار بیا ردست کر و تکرار اس کی ابروئے خمدار تیغِ اصفہانی ہے
یوں سمجھے ہے وہ بے درنگ تیغ کو چھپا کر سنگ کیجیے مجھے چورنگ اب یہ جی میں ٹھانی ہے
ہمنشیں نہ کر تاخیر جلد کر مری تدبیر پھر ہوا جنوں گریباں گیر عالمِ جوانی ہے
کب تلک رہوں غمناک اس بن ای دل صد چاک زندگی ہے اپنی خاک، خاک زندگانی ہے
سن کے اس نے رنگیں آہ تیرا قصۂ جانکاہ ہنس کے یوں کہا ای واہ زور کی کہانی ہے

مرزا سبحان قلی بیگ صاحب فرمودند کہ میاں نصیر صاحب نصیر تخلص شعر ہندی دقیق و مشکل و تہ داری گویند گفتم بلے دریں کار یگانہ بیدل اند۔ فرمودند کہ یک مطلع اوشان می خوانم چیزے قباحت اگر بہ توانند بر آرند۔ گفتم مشفق من یکے خود اوشان شفیق بندہ اند و دویم مشق اوشان ایں قسم نیست کہ کسے جائے سخن دراں بیابد، سوائے ایں از اوشان و ربط بسیار دارم مبادا حرکتے بعمل آید کہ ناخوش شوند چوں بسیار مجبور شدہ ایں مطلع اوشان خواندند ؎

چرائی چادرِ مہتاب شب مہ کش نے جیحوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

ناچار شدہ گفتم کہ ایں مطلع بہتر از مطلع آفتاب است لیکن مرا اندک دریں تامل است کہ چادر مہتاب را مہ کش از چہ صورت بر جیحون دزدید اگر جائے مہ کش لفظ ابر می بود یعنی بادل بسیار خوب بود ؎

چرائی چادرِ مہتاب شب بادل نے جیحوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

سبب ایں کہ ہر گاہ ابر بر ماہ می آید البتہ چادرِ مہتاب را گویا دزدمی برد زبرائے رعایت آب و شب ماہ لفظ مہ کش آوردہ شعر را برباد کردند و بطور لطیفہ ایں چند کلمہ دیگر بر زبان آوردم یعنی مضمون عالم بالا بود دزد ہم آسمانی بایستے یعنی ابر کہ دزد آسمانی است دویم ایں کہ دزد کہ از عالم بالا بود کٹورہ ہم باید بفلک بگردد نہ کہ دزدی از چادرِ مہتاب بر زمیں بشود و کٹورہ بر آسمان

سلہ ق۔ن۔ ریاحت

بہ دود لازم بود کہ قطعۂ زمین بر سر زمین شخصے ایں تقریر را بہ میاں نصیر صاحب رسانید
او شان شنیدہ چندے از بندہ کشیدہ خاطر ماندند بارے باز رفع کدورت ہا
شد لیکن از بس کہ مزاج منصف دارند لفظ بادل را پسند فرمودہ در دیوان نوشتند۔

مجلس ہشتم در شاہ جہاں آباد۔

روزے[1] در مسجد حکیم شریف خاں صاحب نزد برادر مہربان مسیح الزماں حکیم
محمد اشرف خاں صاحب کہ حکیم تخلص داشتند نشستہ بودم کہ یک مرد عمدہ
در پالکی سوار و چند سوار و دہ بیست نفر پیادہ ہمراہ کہ از سادات کٹاہہ
برائے کدام کار در حضورِ بادشاہ آمدہ بودند و از برادر صاحب موصوف ربط
داشتند برائے ملاقات در مسجد تشریف آوردند بعد نشستن از احوال بندہ
پرسیدند۔ چوں میر صاحب موصوف مرد شاعر بودند و فارغ تخلص داشتند
برادر صاحب مذکور اوّل ذکر شعر و شاعری بندہ کردہ فرمودند کہ چیزے از
کلام تازہ خود بخوانند۔ ازاں جا کہ میر صاحب مرد بزرگ صورت و ثقہ[2]
در ظاہر معلوم می شدند بندہ ایں فرد حکایت مثنوی ایجاد رنگین را خواند۔

ایک نے بچھو سے کی یہ گفت و گو ۔۔۔ ڈنک بے تقصیر کیوں مارے ہے تو
سن کے بچھو نے کہا ناداں ہو تم ۔۔۔ ہے یہ سیدھی بات کیوں حیراں ہو تم
تم نہیں سمجھے ہو اس کو کیا ہے یہ ۔۔۔ مقتضا میری طبیعت کا ہے یہ
حق ہے رنگیںؔ جس کی جو خلقت میں ہے ۔۔۔ اس کی بس دایم وہی نیت میں ہے
پاک رکھ نیت تو اپنی پاک رہ ۔۔۔ جب ہوا تو پاک تب بے باک رہ
کام نیت سے ہمیں دن رات ہے ۔۔۔ حکم "الاعمال بالنیات"[3] ہے

---

[1] یہ مجلس مطبوعہ میں نہیں ہے۔ [2] ق۔ ن۔ ثقہ [3] بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے۔

عیشِ دنیا چند روزے بیش نیست حاصل از کردم بغیر از نیش نیست
ترکِ دنیا کن بہ کنجے در نشیں دیگر از کس حرف مشنو گر نشیں
آج کر لے کام کی اپنے کشود پھر نہیں کرنے کا کچھ افسوس سود
کھائے گا ارمان کل تو اس طرح کرتی مرتے میں تھی بلی جس طرح

حکایت سگ و گربہ :-

ڈالا ایک کتے نے ایک بلی کو چیر سانس ٹھنڈی بھر کے بولی وہ حقیر
رحم کھاتی میں اگر جو ہے یہ گاہ تو مرا یوں حال کیوں ہوتا تباہ
جو کیا تھا اس کا پھل مجھ کو ملا آپ میں اپنا کروں کس سے گلا
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں ناؤ کاغذ کی کہیں چلتی نہیں
ظلم مت کر تا سزا اس کی نہ پائے تو ستا مت تا ستایا تو نہ جائے
ایک پر ہے ایک بالا دست یہاں کوئی اونچا ہے کوئی ہے پست یہاں
چشمِ دل کو کھول تو سینے کے بیچ سوجھتی تجھ کو رہے تا اونچ نیچ
ظلم اے رنگین بہت معیوب ہے عاجزوں پر رحم کھانا خوب ہے

بعد شنیدن ایں فرمودند کہ ایں چہ کلام است اشعارِ حریفانہ ظریفانہ بخوانند عرض کردم کہ بندہ وضع جناب را دیدہ اشعار خواندہ بود۔ خیر معلوم شد کہ خود غلط بود انچہ من پنداشتم۔ فرمودند کہ مرا اشعار شوخ پسند می آید ایں غزل خواندم

مرے دل میں سے یوں ہو کھا تر ایکاں نکلتا ہے کہ جوں کا خانۂ مفلس سے جوں مہمان نکلتا ہے
کہیں آوا[1] اگڑتا ہے یہاں بگڑا ہے کھندانا[2] کہ جو اشک آنکھ سے نکلے ہے سو طوفان نکلتا ہے

---

[1] آوا :- کمھار کی بھٹی کو کہتے ہیں جو بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ آوا بگڑنا۔ کسی کام کے کرنے والے سب کے سب غلط کار ثابت ہوں تو کہتے ہیں آوے کا آوا بگڑا ہے' اور جب بہت ہی بڑا کام بگڑ جائے تو کہتے ہیں آوا نہیں پجاوہ (یا پجاوا) بگڑا ہے' اسی لحاظ سے شاعر نے یہاں "آوا" کے مقابلے میں "کھندانا" (یعنی پجاوا یا بڑا اوا) کہا ہے۔

[2] کھندانا :- گڑھا (دھونا) خاص کر پڑاوے کے گڑھے کو کہتے ہیں' جس مقام سے مٹی کھود کر اینٹیں تھاپتے ہیں وہ ایک بہت بڑا گڑھا ہو جاتا ہے اور اسی سے متصل بہت بڑی بھٹی لگاتے ہیں۔ خاندان کا کنایہ کھندانا میں ہے۔

عجب حسرت بھری آنکھوں سے تک رہتا ہوں منھ اس کا — بُلانے کو کسی کے اس کا جب درباں نکلتا ہے
نہ نکلی جی لیے بن دل سے اپنے الفتِ جاناں — کوئی بھی اپنے گھر سے بے سر و ساماں نکلتا ہے
مرے سینے کے تودے میں خدنگ اس کی یہ لوٹے ہے — کہ ہر مُو کی جگہ ایک تیر کا پیکاں نکلتا ہے
خدا جلنے مرے سینے میں کیسی آگ بھڑکی ہے — کہ جو لختِ جگر نکلے ہے سو طوفاں نکلتا ہے
قسم تیری ترے دیوان کی کیا بات ہے رنگیں — غزل جو اس میں نکلے ہے وہ ایک دیوان نکلتا ہے

تمام غزل را شنیده فرمودند که غزل صاف است شوخ نیست به مجرد شنیدن این کلام رگِ بشریت به جوش آمد۔ دانستم که بے حقیقت اند عرض کردم که جناب از خوبی و بدی شعر چه آگاهی دارند به قول صائب : ؎

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را — تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

فرمودند که من شاعر زبردست فارسی گوام ۔ گفتم خیر ایں گل دیگر شگفت

تو کار زمیں را نکو ساختی — که بر آسماں نیز پرداختی

هنوز جناب زبان هندی را که زبان بزرگان خود است اں را درست ناکرده گفتن شعر فارسی شروع کرده اند ۔ گفتند چگونه گفتم که از خواندن اشعار که جناب هم راه برادر مهربان محمد اشرف خاں صاحب که گفتگو می کردند ایں چند حرف غلط بر زبان آورده بودند یکے سایان را سرواں دوئم دیوار را دوال سوم خوان را خون چهارم با دام را بے دام پنجم آفتابه یا لوٹا را بدھنه، همه را شنیده جناب را از قسم مردم دہقانی پنداشته خونِ جگر خورده ذہن خود را کند نموده صبر کرده بودم حال آں که جناب کاوش کردند۔ به قول نظامی

زبانم ز گرمی بر آشفته شد — سخن هائے ناگفتنی گفته شد

جناب را لازم نه بود که درایں مقدمه تکرار نمایند به قول مرزا رفیع سودا

تم کو یہ لازم نہ تھا آن کے اس شہر میں — اُلجھو تم اُس شخص سے طاق ہو جو دہر میں

ہاں مگر اس واسطے مجھ سے ہوا آکر اڑے — تا کوئی جانے تمھیں تم بھی ہو شاعر بڑے
ہوتے ہیں وہی بڑے جن کو بڑا حق کرے — اپنے تئیں کو بڑا آپ سے احمق کرے

چوں ایں سخن بہ ایں جا رسید برہم شدہ ایں چند شعر خود خواندہ دا د طلب شدند۔

غزل ؎

من کہ قیدی بہ دام چشم تو ام — بے خریدن غلام چشم تو ام
من بہ خاطر نیاورم مے را — جرعہ نوش مدام چشم تو ام
ہیچ گونہ نمی شوم آزاد — بندۂ صبح و شام چشم تو ام

عرض کردم کہ دماغ شنیدن ایں اشعار نہ دارم۔ خاموش مانند جناب فرمودہ بودند کہ شعر فارسی می گویم و ایں اشعار ہندی خواندند۔ فرمودند کہ ایں اشعار ہندی اند۔ گفتم شعر فارسی را آں قبلہ نہ خواہند فہمید۔ بندہ شعر فارسی می خواند جناب معنی آں ارشاد فرمایند۔ فرمودند بسیار خوب بندہ ایں شعر خواندہ معنی پرسید ؎

مونمک خوردہ را منظور مودارم خوجہ حسن — جفلہ قحطہ کہ مغفش زنم اسمٰعیل را
موکہ در عشق تو چوں موش دو پا در مو جوہم — وزیں درمو تو لم تُن وہوا در مو جوہم

رباعی ؎

زلفت کہ بہ دلبری سیہ منصور است — ابروت قلیچیی و بہ خود مغرور است
رخسارہ بہار لو فراگو ز لو چشم — در تیرہ شا ملو خطط مشہور است

ایں اشعار و تقریب بے ہودہ بندہ را شنیدہ حیران شدہ از محمد اشرف خاں صاحب پرسیدند کہ ایں مرد کیست سخت علامہ بے محاباست اوشاں از احوال بندہ آگاہ فرمودند از سر نو برخاستہ بغل گیر شدہ فرمودند کہ تقصیر من معاف فرمایند از مدت اشتیاق ملاقات سامی داشتم بر وقت موقوف بود چوں بہ راہ آمدند بندہ ہم عذر

بسیار بسیار ادبے ہودہ گوئی ہا و گستاخی ہا نمود۔

مجلس دہم در شاہ جہاں آباد

در محفل شادی میر سید علی[1] صاحب پسر حضرت میر سید محمد صاحب کہ شاگرد بندہ اند و غمگیں تخلص می نمایند وارد بودم او شان ایں مطلع میاں جرارت راخواندند ؎

گھر جو یاد آیا کسی کا اپنے گھر میں آن کر ٭ چپکے چپکے روتے ہیں منھ پر دوپٹہ تان کر

وازبندہ فرمایش جواب آں کردند فی الفور ایں مطلع و حسن مطلع موزوں کردم و بعد غزل را تمام رسانیدم غزل ایں است ؎

یوں کہوں اس بت کو آیا ہوں یہ جی میں ٹھان کر ٭ چین دے مجھ کو کہیں اپنے خدا کو مان کر

بازگشتی تیر ہی پھر کر یہ تیرا دیکھنا ٭ صدقے تیرے اس ادا پر سے مجھے قربان کر

کھوئی غفلت[2] میں جوانی دیکھ پیری میں تو سوچ ٭ صبح صادق ہو گئی چلنے کا کچھ سامان کر

دیکھ مجھ کو دور سے دینے لگا تھا گالیاں ٭ جی میں کیا گزرا تھا کل تیرے ادھر تو دھیان کر

سوچ جی میں میرے ہوتے غیر کو گردن مار ٭ قتل کرتا ہے تو کر ظالم دلے پہچان کر

آج آتا ہے نہیں آتا تو دے مجھ کو جواب ٭ بھیج کر پیغام جھوٹے روز مت حیران کر

دل بغل سے لے گئی رنگیں وہ دزدیدہ نگاہ ٭ ورنہ دل دیتا ہے کون اپنا کسی کو جان کر

تمام اہل مجلس بر بدیہہ گفتن من آفریں کردند۔

مجلس بیست و دویم

از کابل شاہ جم جاہ تیمور شاہ بادشاہ در ۱۲۰۵ ایک ہزار و دو صد و پنج ہجری اسد اللہ خاں درانی را کہ سردار یک دستہ یعنی دوازدہ ہزار سوار بود و قابلیت و دانائی

---

[1] مطبوعہ میں نام نہیں ہے [2] ق۔ ن۔ غلفت

ازحد زیاده داشت ایلچی کرده مع تحائف بسیار نزد بادشاه یعنی حضرت شاه عالم بهادر بادشاه غازی در شاه جہان آباد فرستادند خان موصوف بعد ملازمت حضور سه ماه در شاه جہاں مانده رخصت کابل خواست۔ بادشاه والد بنده یعنی محکم الدولہ طہماس بیگ خاں اعتقاد جنگ را قابل این خدمت فہمیده مع تحائف این جا ازطرف خود ایلچی کرده ہم راه خان موصوف رخصت فرمودند ۔ و عزیز از جان محمد یار خاں و بنده نیز ہم راه روانہ شدیم لیکن از حضور بادشاه ارشاد شد کہ نزد وکیل مطلق حضور یعنی سیندھیا بہادر پٹیل مرہٹہ کہ از دو لکھ سوار پیاده ہم راجپوتانہ در پیش دارد شده بروند و به پٹیل سندھیا بہادر شقہ بادشاہی بہ این مضمون صادر شد کہ ما بہ دولت محکم الدولہ بہادر نواب طہماس بیگ خاں اعتقاد جنگ بہادر را نزد شاه جم جاه تیمور شاه بادشاه کابل ازطرف خود ایلچی کرده روانہ فرموده ایم۔ آں چہ اسباب دیگر بہ مشار الیہ منظور باشد سرانجام کرده خواہند داد۔ ہرگاه از شاه جہاں آباد روانہ شده در نواح کوٹہ بوندی رسیدیم در تمام ملک از تاخت و تاراج مرہٹہ ہا بے چراغ شده بود۔ ہزار ہا سوار مرہٹہ ہا قزاقی[1] می کردند و اہل آں ملک ہنگامہ عظیم برپا کرده بودند۔ روزے اسد اللہ خاں بہ والد بنده گفت کہ در راه خطره بسیار است۔ لازم کہ از راجہ جہلاہہ دبولی والہ کہ بہادر سنگھ نام دارد مردم بہ طریق بدرقہ ہم راه بہ گیرند بنده اظہار کرد کہ چہ ضرور است۔ جمعیت مایاں ہم از فضل الہی کم نیست احسان ناحق برداشتن لطف ندارد۔ خاں موصوف بر آمد سخن ضرب المثل این شعر خواند؎

بے پیر مرو تو در خرابات   ہرچند سکندرِ زمانی

مدعا ازیں شعر اوشان این بود کہ در راهِ خطرناک بے بدرقہ رفتن بعید از دانائی است بنده گفت لفظ خرابات دریں بے مصرف است

[1] ق۔ ن۔ قضاقی۔ اس سے اس تباہی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو مرہٹوں نے پھیلا رکھی تھی۔

اگر ایں قسم بہ خوانند بہتر باشد ؎

بے پیر مرو بہ راہِ ظلمات — ہر چند سکندرِ زمانی

لفظ ظلمات ازیں جہت مناسب است کہ ہرگاہ سکندر قصد ظلمات کرد۔ فرمود کہ مرد پیر ہم راہ نہ رود جوانے از پدرِ خود عشق داشت در صندوق بند کردہ ہم راہ برد چوں نزدیک ظلمات رسید بادشاہ حیران شد کہ ہرگاہ بہ تاریکی رفتم چگونہ باز از ہموں راہ برگردم۔ ہر یکے تدبیر آں بہ قدرِ حوصلہ خودمی کرد۔ تشفی بادشاہ نہ می شد مرد جواں صورتِ حال را با پدرِ خود اظہار کرد۔ پیر مرد تدبیرے نشان داد کہ ازاں تشفی بادشاہ شد و پسندِ خاطر ہم کنار افتاد از ظلمات بہ ہماں تدبیر بیروں آمد۔ پس اگر شاعر دریں مقدمہ لفظ ظلمات بہ جائے خرابات بہ کار می برد خوب می بود و نیز لفظ ظلمات برائے سکندر مناسب است اسد اللہ خاں نہایت پسند کرد۔

مجلس بیست و ششم در لکھنؤ

بندہ و برادر مہربان انشاء اللہ خاں انشاؔ خلف الرشید حکیم میر ماشاء اللہ خاں در سرکار مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر سلیمان تخلص ملازم بودیم۔ یک جا بہ کمال فراغت و آرام بسر می بردیم باہم ایں قدر دوستی و اختلاط داشتیم کہ نوشتن نہ می آید چناں چہ شعر اوشان در حق ایں عاجز است ؎

عجب رنگینیاں ہوتی تھیں تب باتوں میں اے انشا — ہم جب لکھنؤ میں تھے سعادت یار خاں اور ہم

الغرض روزے خان موصوف در حضور حاضر گردیدہ غزل تازہ خود خواندند مطلعش

ایں بود ؎

دیکھ اس کی پری خاتم یاقوت میں انگلی   ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

ازبس کہ باہم شوخی بسیار بود۔ گفتم کہ اگر بہ جائے مصرع ثانی، ایں مصرع بہ دارند نہایت چسپاں است۔ مطلع

دیکھ اس کی پری خاتم یاقوت میں انگلی   ؎[1]

ازاں جا کہ باہم ربط و شوخی زیادہ از حد بود از خندہ بسیار در خود نماندیم۔

باسٹھویں[62] مجلس میں کلکتہ سے حج کے لیے روانہ ہونے کے حالات مفصل لکھے ہیں۔ سمندر کی گہرائی کا ذکر بھی کیا ہے اور جہاز کی لمبائی چوڑائی بھی تفصیل سے بیان کی ہے جہاز سے متعلق ہر ہر چیز کا ذکر وضاحت سے کیا ہے۔ اس سمندری سفر میں جو جو تکالیف انھیں برداشت کرنی پڑیں ان کا بھی پورا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ مجلس ساڑھے تین صفحوں پر مشتمل ہے۔

مجلس شصت و پنجم در ڈھاکہ یعنی جہانگیر آباد

مرزا عزیز الدین صاحب و شیخ ہدایت اللہ صاحب و میر جاگن ولالہ سدانند و مرزا عظیم بیگ و قدرت اللہ خاں صاحب مع چند شخص دیگر یک جا نشستہ بودیم و صحبتِ شعر و شاعری گرم بود۔ مرزائے موصوف از بندہ پرسیدند کہ در شاہ جہاں آباد جناب چند شاگرد دارند۔ گفتم مذکر و مونث[63] الغرض چہل پنجاہ کس خواہند بود نام مونث را شنیدہ تعجب کردہ فرمودند کہ سبحان اللہ جل شانہ، شاہ جہاں آباد چنیں شہر است کہ دراں زن ہائے قابل و شاعر اند و باز ارشاد کردند کہ از فضل حافظہ خوب دارند چیزے بہ چیزے از کلام آں ہا کہ

---

[1] یہ مصرع بہت ہی فحش ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں شہزادوں کی محفلوں میں بھی کس قسم کی فحش گفتگو اور مذاق کا رواج تھا [52] ق۔ن۔ معتبر

یاد باشد جدا جدا از ہر یک بہ خوانند۔ اوّل ایں اشعار میر سیّد علی صاحب غمگین تخلص خواندم ؎

یہ داغِ عشق نہ ہو دُور اپنے سینے سے — کہیں مٹا ہی کھُدا نام بھی نگینے سے
جنوں نے چاک کیا ہی پھر اس گریباں کو — نہیں ہی فائدہ ناصح اب اس کے سینے سے
جو خاص بندے ہیں اس کے انہیں سوا اس کے — نہ کام مال سے ہی اور نہ کچھ خزینے سے
سوا تمھارے مجھے اور سے نہیں کچھ کام — یہ تم سے غیر لگاتے ہیں آ کے کینے سے
اب اس قدر ہمیں اس عشق نے ستایا ہی — کہ تنگ آئے ہیں غمگیں ہم اپنے جینے سے

ولہ

بغیر تیرے نہیں کوئی یار آنکھوں میں — پھرے ہی تو ہی تو لیل و نہار آنکھوں میں

ولہ

مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا — آخر اس شوخ نے جلا مارا

ولہ

شمع ترا یہ مکھڑا ہی اور دل میرا پروانہ ہی — داغِ جگر پہ عشق میں تیرے مثلِ چراغِ خانہ ہی

ولہ

میرے صیاد نے ایک ظلم یہ ایجاد کیا — بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا

ولہ

مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ زعفرانی ہی — نکلتا آنکھ سے جو اشک ہی وہ ارغوانی ہی

بعد اتمام ایں اشعار ان چہ کہ از مشق لالہ بسنت سنگھ نشاط تخلص یاد آمد خواندم ؎

دل اٹک کر زلف میں اٹکا ترے بالے کے ساتھ
جز سیہ بختی پھرے گا وہاں سے وہ کیلے کے ساتھ

جا لگا دل شاید اس آفت کے پرکالے کے ساتھ
آگ کے شعلے نکلتے ہیں جو ہر نالے کے ساتھ

ہو تصور میں ذقن کے دیکھ ڈانوا ڈول دل
مت کر اتنی کھینچ اپنے چاہنے والے کے ساتھ

وادیٔ غربت ہوئی رشکِ ہزاراں گلستاں
کی یہ کاوش خار نے ہر پاؤں کے چھالے کے ساتھ

چل دِلا منظور ہو کر سیر کچھ پنجاب کی
مستعد چلنے پہ ہیں انبالے کے ساتھ

دیکھتے ہی اس کے سوجھی ہم کو سیرِ لامکاں
عالِم بالا نظر آیا ترے بالے کے ساتھ

پیچ مت کھا حلقۂ گیسوئے مشکیں کا نشاط
ناگہانی حادثہ ہو کھیلنا کالے کے ساتھ

ترے کوچے میں ہو گرم آج ہنگامہ قیامت کا ۔ کوئی تڑپے ہے مارا چشم کا اور کوئی قامت کا

کہ نا نوشتہ ہی بہتر ہو مدعا دل کا ۔ پیام بر سے کہوں کیا یہ ماجرا دل کا

پری ہو، حور ہو، تصویر ہو، محبوب صورت ہو ۔ جسے چاہے ہو یہ دل وہ نہایت خوب صورت ہو

جو کیا تم نے سو تم پاؤ خدا سے اپنے ۔ ہم تو اب تک نہ پھرے پاسِ وفا سے اپنے

اس دلِ وحشی کی کچھ بے ڈھب ہو دامن گیر زلف
دام تھا ہی، سبزۂ خط اب ہوئی زنجیر زلف

بعد ازیں از مشق خواجہ آفتاب خاں منیر خواندم

ہو ہمارے یار کو اوروں سے اکثر اختلاط ۔ ایک ہم سے ہی نہیں رکھتا ستم گر اختلاط
اس طرح تجھ سے محبت دل کو ہو اے شعلہ خو ۔ جس طرح آتش سے رکھتا ہو سمندر اختلاط

آتشِ حسرت سے ہوجاتا ہے دل جل کر کباب　　اس لب مے گوں سے جب کرتا ہے ساغر اختلاط

اس کے ملنے سے ہوا رسوا جہاں میں اے منیر　　ہم نہیں کہتے تھے تجھ کو اب تو مت کر اختلاط

آرۂ غم سے جگر ہوتا ہے میرا چاک چاک　　کرتی ہے شانے سے جب زلفِ معنبر اختلاط

یار کا گر وصف خط کر نہ سکے گا رقم　　کیسا ہی اپنے تئیں گو کہ تراشے قلم

جی چاہتا ہے زلف کا تیری بیاں کرے　　کنگھی کے دانت توڑ کے اپنی زباں کرے

مکتب میں تجھے دیکھ کسے ہوش سبق ہے　　ہر طفل کا یہاں اشک سے آلودہ ورق ہے

بعد اں از مشق محمدی خان خان تخلص خواندم

یاد جس وقت تری آتی ہے　　مجھ کو ہچکی وہیں لگ جاتی ہے

قدر انسان کی تب آتی ہے　　جان جب اس کی نکل جاتی ہے

بولتے مجھ سے نہیں وہ ہیہات　　وصل کی شب یہ چلی جاتی ہے

غیر سب آتے ہیں پردہ نہیں کچھ　　مجھ کو یہ خو تیری کب بھاتی ہے

قتل کرتی ہے دہیں ہجر کی شب　　جب وہ صورت مجھے دکھلاتی ہے

گردشِ دہر اس ہولی میں خان　　سوانگ اب دیکھیے کیا لاتی ہے

دنیا میں ہم جو آئے تو کیا کام کر چلے　　ناحق میں اپنے نام کو بدنام کر چلے

دل ہمارا جو اس پہ مرتا ہے　　کوئی ایسا بھی کام کرتا ہے

بعد آں اشعار ہمشیرہ زادہ کلاں بندہ است ابراہیم بیگ و خرم تخلص می کند[1]

ہم بہت سا ہی تجھ کو چاہ چلے　　دوستی تجھ سے لیں نباہ چلے

جنسِ دل کھو کے اے ستم گر آہ　　مفت میں ہو کے ہم تباہ چلے

یوں زمیں پر چلا وہ رشکِ قمر　　جس طرح سے فلک پہ ماہ چلے

---

[1] مطبوعہ مجالس رنگین میں خرم کا کہیں ذکر نہیں صرف نو شاگردوں کے نام ہیں۔ ان میں بھی بعض غلط ہیں۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ اسماء الرجال صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ نسخہ مسعود حسن رضوی میں جو نام ہیں وہ صفحہ ۳۲۷، ۳۲۸ پر ملاحظہ ہوں۔

کچھ نہ ہم کو ہوا حصول ای دوست
تیرے ہاتھوں سے دادخواہ چلے
لخت دل رشک میں ہے یوں خورم
فوج میں جس طرح سے شاہ چلے

یار کے کوچے میں جائیے ہی بنے
گھر میں اپنے اس کو لائیے ہی بنے
بے قراری روز و شب کی آہ اب
اس ستم گر کو جتائیے ہی بنے
خون دل چشموں سے اُمڈا ازدرہو
قصر دل کو اب ڈبائیے ہی بنے
مجھ سے آنے کی قسم کھائی تھی
جان من اب تم کو آئیے ہی بنے
عشق سے ناچار ہے خورم تیرا
جان کو اس سے بچائیے ہی بنے

اگر بوسہ دینے سے گھبراؤ گے تم
تو پھر وصل کی کیوں کہ ٹھیراؤ گے تم
خبر اپنی مجھے بھجواؤ جی
یا کبھی آپ ہی تم آؤ جی

بعد اں اشعار راجہ کدار ناتھ صاحب کہ نسیم تخلص می کنند خواندم

آتی ہیں یاد جس دم اس ماہ رو کی چاہیں
لیتا ہوں سانس ٹھنڈے بھرتا ہوں گرم آہیں
مشکل ہوا ہے ہم کو اب دیکھنا بھی اس کا
لڑتی تھیں اپنی جس سے دن رات وہ نگاہیں
کیوں کر ہو چین اس بن صحبت ہو جس سے ایسی
چھاتی سے لگتی چھاتی باہوں کے ساتھ باہیں
آساں نہیں قدم کو اس سرزمیں پہ رکھنا
ہے سخت منزل عشق اس کی کڈھب ہیں راہیں
امید وصل ہی میں ہوگا وصال ایک دن
کب تک نسیم اس کی فرقت میں ہم کراہیں

مستی مالیدہ دانت اس یار کے اکثر چمکتے ہیں
تعجب ہے کہ تارے ابر میں کیوں کر چمکتے ہیں

کیوں آپ ہم سے ناحق ان دنوں خفا ہیں — چاہت کے ہم ہیں بھوکے الفت کے آشنا ہیں

ہو جب سے چھپا ہم سے وہ آرام ہمارا — پاتا ہی نہیں تب سے دلِ آرام ہمارا

گھٹا کیوں کر نہ اب اس دیدۂ گریاں سے گھبرا وے

وہ برسے ایک پل یہ رات دن برسات برسا وے

گرم الفت دل ہو اس آفت کے پرکالے کے ساتھ

آہِ سوزاں دم بہ دم نکلے ہو ہر نالے کے ساتھ

بعد آں از مشق راجہ شنکر ناتھ کہ صبا تخلص می کنند خواندم ؎

بیاں کیا کیجیے جو کچھ کہ ہم کو درد و غم ہوگا — اجی جاتے ہو تم یہاں سے عجب برپا الم ہوگا

تمھاری یاد میں گزرے گا مجھ کو رات دن روتے — نہیں معلوم اس دل پر پڑے کیا کیا ستم ہوگا

اگر تو مبتلا ہوتا کسی پر تو سمجھتا کچھ — تری جانے بلا جو کچھ کہ مجھ پر اے صنم ہوگا

تو ہو بے رحم تجھ کو رحم کچھ آتا نہیں مطلق — جو کوئی اور دیکھیے گا مجھے وہ چشم نم ہوگا

غلط سمجھا ہو تو پیارے رہے یہ یاد کیا امکاں — قرار اس دل کو میرے آہ تجھ بن ایک دم ہوگا

ہمیشہ داغ پر یہ داغ کھاتا ہو مرا سینہ — کوئی دن میں جو دیکھوگے تو یہ رشکِ ارم ہوگا

صبا کس واسطے مرتا ہو مضطر اپنے دل میں تو — لکھا لایا ہو جو قسمت میں کب وہ بیش و کم ہوگا

کیا پوچھتے ہو جور و ستم مجھ سے یار کا — دیکھو نہ حال میرے دلِ بے قرار کا

باغ میں جب وہ نوجواں گیا — سرو کا قد پر اس کے دھیان گیا

کوئی دم باقی تھا اس کا سو اٹک کر رہ گیا — تیغ ابرو کا تری گھایل سسک کر رہ گیا

بے سبب ہرگز نہیں ہو پیار کرنا یار کا — دیکھیے کیا ہو ارادہ اس بتِ عیار کا

دل تو حاضر ہو آیئے لیجے — پر ذرا منھ دکھایئے لیجے

بعد آں از مشق عالم النساء کہ خانم جان نام و پنہاں تخلص می کند خواندم۔

اس آہ نے ہماری آخر یہ کی رسائی — ظلم و ستم وہ بھولا اور ہم سے کی صفائی

---

۵۱ محبوب

کچھ شک نہیں ہے اس میں یہ ہم سمجھ رہے ہیں ایک روز پھر کرے گا آخر کو بے وفائی

قطعہ

بوسہ جو ہم نے مانگا کہنے لگا وہ ہنس کر چل دور تو نے ہی بکواس کیا لگائی
یہ سن کے آئی وحشت ہم گھر سے بھاگ نکلے زنجیر پاؤں پڑ کر پھر اپنے گھر میں لائی
کہتے تھے لوگ مجھ کو دینا نہ دل تو زنہار جیسا کیا تھا میں نے ویسی سزا بھی پائی

غزل

دل ہم نے دیا تھا تجھے دل دار سمجھ کر تھا ہم نے لیا عشق کا آزار سمجھ کر
ایسا ہے وہ ظالم کہ عیادت کو بھی گاہے آتا ہی نہیں یہاں مجھے بیمار سمجھ کر
تو ایک ہی مچلا ہے کہ قابل ہیں ترے ہم سنتا نہیں پھر بات کو ایک بار سمجھ کر
یہ پہلا ثمر ہے جی محبت کے شجر کا روتے جو ہیں یہ دیدۂ خوں بار سمجھ کر
تو عشق کے پھندے میں پھنسنا کہیں نہار نادان نہ ہونا کبھی زنہار سمجھ کر

غزل

تجھ بن تڑپ رہا ہے یہ بیمار بے طرح ہے غم سے آج دل کو سروکار بے طرح
یارب یہ درد کیا ہے کہ جس کا ہے نام عشق دل کو لگا ہے اپنے یہ آزار بے طرح
دل دار اس کو سمجھتے تھے ہم خوب سوچ کر آخر کو نکلا آہ وہ دل دار بے طرح

قطعہ

محفل میں اس کی میں نے جو جا کر کیا گزر دیکھا تو ہے نشے میں وہ سرشار بے طرح
مذکور میں نے پھر جو کچھ اس بات کا کیا بگڑا بہت ہی مجھ سے وہ خوں خوار بے طرح
یارو خدا ہی خیر کرے ان کی جان کی پنہاں ہوئے ہیں اب کے گرفتار بے طرح

بعد ازیں عرض کردم کہ شخصے از عالم نساء[1] لاڈو بیگم نام دبے غم تخلص دارد در مزاج آں شوخی بہ درجۂ کمال است و شعر خوب می گوید و عبارت نثر بسیار

[1] ق - ن - عالم شا

تحفہ می نویسد و خط شکستہ و نستعلیق[1] خوب می نویسد روزے چند غزل خود برائے اصلاح نزد بندہ فرستاد۔ چند غزل ریختی از تصنیف بندہ طلبیدہ بود۔ بندہ ایں غزل کہ دراں ایام تازہ مشق کردہ بودم نوشتہ فرستادم ؎

ٹیس پیڑو میں اُٹھی اوہی مری جان گئی ۔۔۔ بس زیادہ نہ ستا ای ترے قربان گئی

قطعہ

ئیں ترے پاس دوگانا ابھی آتی تھی چلی ۔۔۔ میرے گھر میں تو عبث کرنے کو طوفان گئی

زہر لگتی ہی مجھے یہ تری چھیچھل[2] بازی ۔۔۔ یہاں ترے آنے سے باجی تجھے پہچان گئی

تیری رنگیں سے کہیں آنکھ لڑی ہی سچ کہہ ۔۔۔ کچھ تو گھبرائی سی پھرتی ہی تو اوسان گئی

درجواب ایں غزل بندہ فورًا از راہ شوخی ایں غزل نوشتہ فرستاد غزل ریختی لاڈو بیگم بے غم تخلص درجواب غزل ریختی رنگین ؎

کبھی کہتا ہی تو دل اور کبھی جان گئی ۔۔۔ جھوٹی باتیں ہیں مری جان یہ میں جان گئی

ہیجڑا پن کو ذرا چھوڑ کے مردی پکڑ د ۔۔۔ کچھ یہ بولی ہی کہ ای اوئی میری جان گئی

جی میں کچھ اور نہ لے جائیو واری تیرے ۔۔۔ تو تو شاعر ہی بڑا ایں تجھے پہچان گئی

تیر کی طرح تری بات مرے دل کو لگی ۔۔۔ تری رنگینی پر ان شعروں کی قربان گئی

جان بے غم کو تو بس اپنی ہی لونڈی رنگیں ۔۔۔ صدقے ہر دم ترے واری ترے ہر آن گئی

ہرگاہ ایں غزل بہ بندہ رسید ہموں وقت بر پشت آں کاغذ غزل در جواب آں نوشتہ فرستادم غزل رنگین درجواب غزل لاڈو بیگم صاحب بے غم

کس نے لکھا تھا تمھیں دل گیا او جان گئی ۔۔۔ مجھ کو کیوں کہتی ہو تم میں تجھے پہچان گئی

ہیجڑا مجھ کو تو کہتی ہو خبردار رہو ۔۔۔ وقت پر کہیو نہ بس گر ترے قربان گئی

جس کو رکھتا ہوں اسے دیتا ہوں سب کچھ خرچی ۔۔۔ نخرہ پھر کر کے یہ کہتا ہوں مری جان گئی

پڑھ کے اس شعر کو تیرے تو ہوا تھا میں خفا ۔۔۔ کچھ یہ بولی ہی کہ ای اوہی مری جان گئی

---

[1] ق-ن۔ نستعلیق [2] چھیچھل بازی، نخرہ، مسخرہ

پردے میں ہنس پڑا جب میں نے پڑھا یہ مصرع   تری رنگینی پر ان شعروں کی قربان گئی

روزے در جواب غزل بندہ جواب نوشتہ بود چناں چہ آں ہم نوشتہ می شود غزلِ بندہ ایں بود ؎

تا حشر رہے یہ داغ دل کا   یارب نہ بجھے چراغ دل کا

اس رشکِ چمن کی یاد میں ہو   شاداب ہمیشہ باغ دل کا

ہم سے بھی تنک مزاج ہو یہ   پاتے ہی نہیں دماغ دل کا

جینے کی جہاں میں اس کو لذّت   جس شخص کو ہو فراغ دل کا

معلوم نہیں کسی کو رنگینؔ   دے کون ہمیں سراغ دل کا

غزل لاڈو بیگم بے غمؔ

ملتا ہی نہیں سُراغ دل کا   ہو عرش پر اب دماغ دل کا

گر عشق میں بے کلی نہ ہو دے   سرسبز رہے یہ باغ دل کا

جینے[1] کی جہاں میں اس کو لذّت   جس شخص کو ہو فراغ دل کا

ہو مغتنمات سے تو بے غمؔ   بخشے تجھے حق فراغ دل کا

روزے بہ خانۂ بندہ در چلون لاڈو بیگم نشستہ بود۔ انشاء اللہ خاں از راہ شوخی ایں مطلع خود بہ کنایہ خواندند ؎

کیا فائدہ خالی جو ملاقات کی ٹھیرے   تب خوش ہو مرا دل کہ جب اس بات کی ٹھیرے

بعد ایں چند شعر از مشق عزیزن خاگی کہ عزیز تخلص می کرد یاد آمدند خواندہ تمام کردم ؎

جب کہ باغ و بہار دیکھیں گے   ایک گُل کیا ہزار دیکھیں گے

تم نہ دیکھو گے گر ہمیں ایک بار   ہم تمھیں لاکھ بار دیکھیں گے

"مجالس رنگینؔ" میں رنگینؔ کے حسب ذیل ممدوحین، احباب اور متعلقین

[1] قلمی نسخے میں یہ شعر رنگینؔ اور بیگم دونوں کی غزلوں میں ہے۔

کا ذکر آیا ہے۔ مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی "مجالس رنگیں"، مرتبہ مسعود حسن رضوی سے لیے گئے ہیں :-

(۱) شاہ حاتم اُستاد رنگین
(۲) محمد امان خاں انصار شاگرد حاتم
(۳) مکند رائے فارغ شاگرد حاتم
(۴) اکبر علی اکبر شاگرد حاتم
(۵) مرزا سبحان قلی بیگ راغب (شاہ جہاں آباد) مجلس دوم
(۶) انشاء مجلس سوم
(۷) کھورے خاں آشفتہ مجلس ششم (شاہ جہاں آباد)
(۸) میر سیّد علی شاگرد رنگین
(۹) حکیم محمد اشرف خاں حکیم شاہ جہاں آباد مجلس ہشتم
(۱۰) ثناء اللہ خاں فراق " "
(۱۱) بسنت سنگھ نشاط شاگرد رنگین مجلس نہم شاہ جہاں آباد
(۱۲) سیّد احمد مہر خاں صوبے دار شاہ جہاں آباد مجلس دوازدہم
(۱۳) نواب غلام قادر خان (برادر دستار بدل) مجلس ۱۲ سہارن پور
(۱۴) محمد خان بہار (پرگنہ نوح) مجلس ۱۴
(۱۵) مراد بیگ خاں (پرگنہ نوح) مجلس ۱۴
(۱۶) مصطفےٰ خاں فیروز پور جھرکہ مجلس ۱۵
(۱۷) علی رضا بیگ " " "
(۱۸) نواب نجف علی خاں مجلس ۱۷ (کانوڈ)
(۱۹) نواب اسماعیل خاں (نارنول) مجلس ۱۸

(۴۱) ببر علی خاں عظیم آباد مجلس ۵۱
(۴۲) نواب شجاع قلی خاں " " ۵۲
(۴۳) حکیم رضا قلی مرشد آباد " ۵۳
(۴۴) محمد خاں " " "
(۴۵) مرزا بھچو (برادر دستار بدل) " ۵۴
(۴۶) مرزا علی ڈھاکہ " ۶۰
(۴۷) مرزا عزیز " " ۶۲
(۴۸) شیخ ہدایت اللہ ڈھاکہ " "
(۴۹) میر جاگن " " "

نوٹ :- مطبوعہ 'مجالس رنگیں' کی سترھویں مجلس میں رنگین کے دس شاگردوں کا ذکر ہے لیکن نام اور نمونۂ کلام صرف نو کا ہی ہے جو حسب ذیل ہیں :-

(۱) میر سیّد علی غمگین
(۲) بسنت سنگھ نشاط
(۳) آفتاب خاں منیر
(۴) محمدی خان خان
(۵) راجہ کدار ناتھ نسیم
(۶) راجہ شنکر ناتھ صبا
(۷) عالم النساء[۱] پنہاں
(۸) عالم النساء[۲] بے غم

---

[۱] عالم نساء یعنی عورتوں کی دنیا۔ عالم نساء کے آگے "خانم جان" پنہاں ہونا چاہیے تھا جو مطبوعہ میں نہیں ہے [۲] نام لاڈو بیگم ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۹۲

(۹) عزیزان طوائف عزیز

اسماء الرجال کی اس طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ رنگین کس قسم کی زندگی گزارتے تھے۔ ایک طرف وہ نوابوں منصب داروں سے بے تکلفی اور برابری کے تعلقات رکھتے تھے اور سفارتی مہمات سیاسی پیغام رسانی اور میدان ہائے جنگ میں شریک ہوتے تھے۔ دوسری طرف شاعروں کی محفلوں اور مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے تھے۔ ان مجلسوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجلسیں بہت عام تھیں اور پنجاب سے لے کر بنگال تک اور جنوب میں گجرات اور کاٹھیاواڑ تک جہاں کہیں دو چار سخن فہم جمع ہوجاتے تھے اس قسم کی بے تکلف مجلسیں شروع ہوجاتی تھیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان اساتذہ اور نومشق شعرا سب ہی شریک ہوتے تھے۔ فی البدیہہ کلام کہتے تھے۔ مختلف صنائع اور بدائع کے استعمال میں اپنی قدرت دکھاتے تھے۔ اساتذہ اور معاصرین کے کلام پر تنقید کی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ تنقید اس عہد کے مروجہ معیار کے مطابق صرف لفظی تنقید ہوتی تھی اور اس میں عام طور پر الفاظ کے انتخاب بندش اور قواعدِ عروض کی پابندی پر زیادہ بحث کی جاتی تھی اور شعر کی معقولیت کو محض ثانوی درجہ دیا جاتا تھا لیکن شعراء اس میں بھی اپنے کمالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان مجالس کے مطالعے سے اس عہد کے شاعرانہ مذاق اور تنقیدی معیار کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے۔

ایک خاص بات جس کا مجالس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے رنگین کا احساسِ برتری ہے جس کا مظاہرہ وہ شعرا کے کلام پر اعتراض اور اپنی طرف سے اصلاح کی شکل میں کیا کرتے تھے۔ معاصرین کے معاملے میں وہ نہایت بے باک تھے لیکن اساتذہ کے کلام پر بھی ضرورت پڑ جائے تو اعتراض کرنے

میں تامّل نہیں کرتے تھے۔ چناں چہ میر سوزؔ، مرزا سوداؔ، میر تقی میرؔ اور شاہ نصیرؔ کے ساتھ خود اپنے اُستاد شاہ حاتمؔ کے کلام پر بھی اعتراض کیا ہے اور اس کا ذکر پہلی ہی مجلس میں کیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ میرے مزاج میں چالاکی بہت تھی اور شعور کم اس لیے یہ گستاخی تھی۔ لیکن رنگینؔ کی گستاخی سے زیادہ حاتمؔ کا ردِ عمل قابلِ غور ہے۔ شاگرد کی اپنے کلام پر اصلاح سُننے کے بعد بجائے ناراض ہونے کے ہاتھ پکڑ کر قریب لاتے ہیں اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں؛ آفریں کہتے ہیں کہ دیوان میں شعر اسی طرح لکھوں گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کاملینِ فن کے یہاں جیسے کہ شاہ حاتمؔ تھے، کس قدر فراخ دلی پائی جاتی تھی۔

اپنی عادت کے مطابق اس مجموعے میں بھی رنگینؔ نے چند غزلیں اور متفرق ہزلیہ اشعار شامل کر دیے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اخبارِ رنگین

سعادت یار خاں رنگین کی تحریروں میں ان کی زندگی اور کلام کے بارے میں بہت سی داخلی شہادتیں مل جاتی ہیں۔ اخبارِ رنگین، بھی اسی قسم کی ایک کتاب ہے جس میں ۹۳ واقعات مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں ان میں بیش تر واقعات ایسے ہیں جو رنگین کے چشم دید ہیں اور جن سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ضمنی طور پر ان کے بعض عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ بعض قصّوں اور واقعات کے بیان سے اس زمانے کے عام ماحول، لوگوں کے معتقدات اور توہمات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہر حکایت میں واقعہ بیان کرنے کے علاوہ ایک آدھ مثل اور اُردو فارسی اشعار و قطعات شامل ہیں۔ سعدی کے قطعات کثرت سے استعمال کیے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ خبروں اور واقعات کے انتخاب میں اخلاقی تعلیم اور تزکیۂ نفس کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ حسبِ ذیل حکایتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں :-

حکایت (۲) خبر گذری کہ متصل لہاری جلال آباد کہ نواب ضابطہ خاں کے لشکر میں درسنِ خورد سالگی معتقد الدولہ صوفی اللہ یار بیگ خاں شہامت جنگ بہادر جو بندے کے بڑے بھائی حقیقی نہایت خوب صورت تھے، ایک روہیلا ولایت زا از حد چاہتا تھا اور جس مکتب میں وہ پڑھتے تھے وہ آتا تھا ایک دن انھوں نے اس روہیلے کو آتا مارا کہ مرگیا یہ سُن کر بادشاہ نے کہا کہ پوچھا

لازم تھا۔ فرد ہندی ؎

غش ہو جوں منصور اوس دل دار پر شوق سے تو چڑھ تو ای دل دار پر[1]

مثل ہندی :۔ اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا خطرہ

حکایت (۴) شاہ جہاں آباد میں سعادت یار خاں رنگین کا بڑا بیٹا اختر یار خاں اختر جو باطن کا اچھا اور بظاہر خوب صورت ہو مگر باپ اس کا اس سے کمال نارضامند ہو اور وہ صالح، نیک بخت اور ہنرمند ہو یہ سُن کر بادشاہ نے فرمایا۔ فرد ہندی

تماشا اپنا رنگیں آپ ہیں ہم کہیں بیٹے کسی کے باپ ہیں ہم

قطعہ سعدی ؎

گر در پسر موافقت و دل بری بود اندیشہ نیست گر پدر از وے بری بود

او گوہر است گو صدف اندر میاں مباش دُرِّ یتیم را ہمہ کس مشتری بود

حکایت (۸) شاہ جہاں آباد میں عاشور بیگ خاں جنھوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، ان کا بیٹا نادر بیگ صوفی اور پرہیزگار ہو اور حضرت جناب خواجہ شمس الدین صاحب کہ اولاد حضرت مودود چشتی قدس سرہٗ اور مشائخ زبردست ہوں ان کا بیٹا غلام مودود تارک صلوٰۃ اور دائم الخمر شراب خوار ہو ؎

حسن ز بصرہ بلال از حبش سہیل از روم ز خاکِ مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی است

ہندی مثل :۔ ذات ذمات نہ پوچھے کوئی۔

(۱۱) شاہ جہاں آباد میں مرزائی بیگ کو میر جیون صاحب چاہتے تھے وہ ان سے تیر اندازی سیکھا کرتا تھا اور شاگردی کا دم بھرتا تھا اتفاق سے ایک دن تودے پر باہم تیر اندازی کرنے میں مرزائی بیگ کی کمان نے

---

[1] سولی

چلّہ ڈال دیا اور تیر کو بیڑھا مار کر میر جیون کی طرف کو نکال دیا وہ تیر ان کی کنپٹی میں چار انگشت گھس گیا اور مرزائی بیگ غش میں آ کر بیٹھ گیا اور سب کے سب وہاں سے بھاگ گئے اور میر جیون اوس تیر کے نکلنے سے اور مرزائی بیگ اوس کے صدمے سے دونوں کے دونوں فی الفور مر گئے ؎

بچ کے جا دے کوئی کدھر کو نکل چھوڑتا ہی نہیں ہے تیرِ اجل

(۲۴) شاہ جہاں آباد میں سعادت یار خاں رنگین نے اپنے سوداگری کے ہاتھیوں کے واسطے بیگم کے باغ میں ایکھ کی کاشت بیگو باغ بان سے کرائی اس کو نیک سمجھا گیا لیکن اس نے ساری کھیتی اپنے اہل و عیال اور گائے بیل کو کھلا دی بلکہ سارے شہر میں دھڑتے سے بیچی ؎

کچھ نہ کہہ اب اس سے تو ای نیک خو تخمِ نیکی مزرعِ دنیا میں بو

(۲۵) بنارس میں کسی نے سعادت یار خاں رنگین سے پوچھا کہ تم اکبر آباد، لکھنؤ، نجیب آباد، کٹیر، ہردوار، جگادھری، سرہند، امرت سر[1]، لاہور، بیکانیر، جودھ پور، جے پور سے لگا تا کوٹہ بوندی اوجین سے اور بندیل کھنڈ، الہ آباد، عظیم آباد، راج محل، بنگالہ، کلکتہ، ڈھاکہ اور پورنیا اور ترائی نیپال سے تا متصل بٹول اور فیض آباد سے لگا تا پیلی بھیت یہ سب ملک دیکھ چکے ہو ان میں سے کون کون سے شہر پسند ہیں انھوں نے کہا سب خوبیاں ایک میں نہیں ہوتیں۔

(۱) شاہ جہاں آباد کی آدمیت

(۲) جے پور کی عمارت

(۳) لکھنؤ کی کثرت

(۴) کلکتہ کی وسعت

---

[1] ق - ن، امبرسر۔ فارسی کے شاعر ملا طغرا نے بھی "عنبر سر" ہی لکھا ہے۔

یہ جو کچھ ہی جہاں میں اس کے بیش و کم کو دیکھا ہی
ہمیں کیا دیکھتے ہو ہم نے ایک عالم کو دیکھا ہی

(۲۶) فیروز پور جھرکے میں نواب احمد بخش خاں کو مخیر اور خلیق جان کر ہزاروں محتاج آتے ہیں اور ہر ایک کچھ نہ کچھ پاتا ہی۔ باوجود ہجوم کے کبھی ترش رو نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اتنا خرچ نہ کرو لیکن اس کا ارادہ اس سے بھی صد چند کا ہی۔ بادشاہ دلی نے یہ سُن کر فرمایا ؎

راہ حق میں مال کو گر یہاں لُٹائے جتنا یہاں دے اوس سے وہ صد چند پائے

قطعہ سعدی ؎

نہ ماند حاتم طائی ولیک تا بہ اید به ماند نام بلندش بہ نیکوئی مشہور
زکوٰۃ[1] مال بہ در کن کہ فضلۂ رز را چو باغباں بہ بردبیش تر دہد انگور

(۲۷) شاہ جہاں آباد میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو کسی نے جا کر کہا کہ آج فلانی جگہ پر محرم کی مجلس میں اصحاب رسولؐ اور اولیاء اللہ کے بعد آپ پر بھی دیر تک تبرا ہوتا رہا آپ نے فرمایا شکر ہی کہ انھوں نے مجھے بھی اولیاء اللہ کے بعد بُرا سمجھا ؎

صبر کے رستے پہ چل بے رہ نہ جا دیکھ اچھا ساتھ ہی یہ رہ نہ جا
ہندی مثل - صبر کی داد خدا ہی دے گا۔

(۲۸) خبر گزری کہ محمد یار خاں محکم الدولہ اعتقاد جنگ طہماس بیگ خاں کا چھوٹا بیٹا یعنی بھائی حقیقی اس مصنف کا جوہر لڑائی میں تردد نمایاں کہ مشہور و معروف ہی کرتا ہی اور شہرت حد سے زیادہ بگڑی ہی تو اس کا ایک ادنیٰ[2] باعث یہ ہی کہ لڑائی میں غریب سپاہی کو نہیں مارتا بلکہ سردار پر وار کرتا ہی۔ بڑے بڑے مضبوط سپاہی اوس سے گھبراتے ہیں وہ کبھی

---

[1] ق-ن زکات [2] ق-ن ادنا

اپنے آپ کو نہیں سراہتا اور نہ یہ چاہتا ہو کہ کوئی دوسرا سراہو اوس کے مزاج
میں بہت ہی خاک ساری ہو ؎

اوس کی کرتی ہو نظر اس کے دل افگار پہ چوٹ سور ما جو ہی سو کرتا ہو وہ سردار پہ چوٹ

مثل ہندی : جو پہلے مارے وہی میر ہو ۔

(۳۰) شاہ جہاں آباد میں بخش بھوانی شنکر نے ایسی حویلی آراستہ کی ہو کہ تمام شہر میں اس کی ثانی نہیں ایسے سلیقے سے حویلی بنوائی ہو کہ اس مکان کو دیکھ کر حیرت آتی ہو اور آنکھیں دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں خُلق اس کا ادنیٰ کام ہو اور جود و کرم کمینہ غلام ہو یعنی نوشیرواں اوس کی منصفی اور خُلق کا بندہ ہو اور حاتم طائی سخاوت کے آگے شرمندہ ہو۔ سب سے عاجزوں کی طرح ملتا ہو اور سب کو چاہتا ہو دشمنوں کو بھی سراہتا ہو ؎

ہو سکے تو خُلق کا دریا بہا خُلق تو انساں میں دُر بے بہا

مثل ہندی :۔ جا کا کام واہو کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا باجے ۔

(۳۲) شاہ جہاں آباد میں میاں غلام رسول کو کسی کی طرف سے اجازت مرید کرنے کی زنہار نہیں اور وہ پوشیدہ طور سے مرید کر کے لوگوں کو گم راہ کرتے ہیں ۔ پیری مریدی پر مرتے ہیں حال آں کہ کوئی پیر بھائی بھی ان کا ان کو خاطر میں نہیں لاتا اور ان کے پاس نہیں جاتا ؎

جن کا روئے دل ہو اپنے پیر کامل کی طرف چھوڑ کر وہ حق کو کب جاتے ہیں باطل کی طرف

(۳۴) سعادت یار خاں رنگین نے شاہ جہاں آباد میں ستھرہ زبان میں ایک دیوان کہا اور اوس کا "مجموعۂ رنگیں" نام ٹھیرایا۔ واقعی بڑے زور سے اپنا خون پانی ایک کر کے ایسا نسخہ بہم پہنچایا سو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوان "مجموعۂ رنگین" اوس کے منھ پر زیب نہیں دیتا کیوں کہ وہ تو ایک

سلہ ق ۔ ن ، چھاجے

کم زبان آدمی ہی اوس کا اتنا منھ اور تلقفا[1] نہیں ہی یہ سُن کر بادشاہ دلّی نے فرمایا کہ اس کا کلام زبردست اور بھلا ہی اور کیف سے بھرا ہی ؎

ہو سخن سے مدام اوس کو کام　　جس کو منظور ہو جہاں میں نام

(۳۵) شاہ جہاں آباد میں شاہ حضرت مولوی عبدالعزیز صاحب جو منگل اور جمعہ کو درس فرماتے ہیں تو وہاں عجیب عجیب طرح کے لوگ آتے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ادنیٰ اور اعلیٰ[2] ان کی تقریر سے لطف اُٹھاتے ہیں ان کی ذات اس شہر میں بہت غنیمت ہی ؎

ہی شریعت کی عجب یہ شاہ راہ　　چل اسی رستے پہ تو شام و پگاہ

(۳۸) شاہ جہاں آباد میں مرزا مغل بیگ خاں عزت نے صبر و قناعت کو منھ پر رکھ کر اور سپاہ گری سے ہاتھ اُٹھا کر عقل و معاد و معاش میں کمال دست گاہ پیدا کی ہی اس وجہ سے اچھے لوگوں میں ان کی عزت ہی جس خوب صورتی سے وہ معاش بسر کرتے ہیں اتنا اور کوئی اس شہر میں کم ہی۔ کیوں کہ ان کو معاد کا ہر لحظہ غم ہی ؎

پھینک دے تروار کو اور ڈھال کو　　آخرش پانی بہے گا ڈھال کو

مثل :۔ صبر اور شکر کا بڑا درجہ ہی۔

(۴۱) پونہ ہانی میں رجب بیگ خاں کا چھوٹا بیٹا غلام محی الدین خاں کمال خوبیوں سے بھرا ہُوا تھا۔ ایک دن سہ پہر کے وقت بندوق کا نشانہ لگا رہا تھا وہ بندوق چھوٹی سی تھی اور جوان زبردست تھا وہ اس بندوق کو دھیان میں نہ لاتا تھا جوں ہی شست باندھ کر آگ دکھائی گولی چل گئی وہیں بندوق کی پنڈوکی[3] جُدا ہو کر اوس کے گال میں لگی اور گدی سے نکل گئی اور وہ بے جان ہو گیا ؎

---

[1] تلقلق : حوصلہ۔ رعب داب [2] ق۔ ن۔ ادنا اور اعلا [3] منھ

گو ہوا دو سو برس کا تیرا سن   گور میں جانا ہو آخر ایک دن

(۴۹) سعادت یار خاں رنگین کا بڑا بیٹا اختر یار خاں اختر بہت ہی متقی اور پرہیزگار تھا۔ اتفاق سے ایک شخص کو چاہنے لگا تو اس میں ایک خوبی بھی نہ رہی اور سب معاملہ برعکس نظر آنے لگا۔ اور چند روز ہی میں عشق نے یہ حال کیا کہ ہر ایک اس کو دیکھ کر رو دیتا تھا ؎

عشق کے مکتب کی بابت اور ہو   تو سمجھتا ہو یہ بابت اور ہو

(۵۰) شاہ جہاں آباد میں حافظ عبدالرحمٰن خاں بھتیجا علی محمد خاں کہ جب برس دس بارہ کا تھا تب اسے ایک جن چمٹا دو دو تین تین پہر تک وہ لڑکا بہ آوازِ بلند کلمے کا ذکر کرتا کہ گرد و نواح کے لوگ تکلیف محسوس کرتے تھے اور رحم کھاتے تھے اور وہ بھی غش کھا کے گر پڑتا تھا۔ تعویذ سے بھی فائدہ نہ ہوا وہ جن کہتا تھا کہ لاکھ علاج کرو میں جانے کا نہیں اسے بہت سی قسمیں دے کر پوچھا کہ تو کس طرح سے جائے گا تب اس نے کہا کہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا شاگرد ہوں اگر وہ فرمائیں گے تو پھر نہ آؤں گا۔ اسی وقت اس لڑکے کو سعادت یار خاں رنگین کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ جنات جب جانا چاہتے ہیں تو اسی طرح کوئی بہانہ لیتے ہیں۔ غرض کہ شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ اب اسے نہ ستانا۔ چناں چہ ایک برس گذر گیا وہ جن نہیں آیا ؎

کہ تو ہی تیری پہنچ کن کن تا ملک   حور و انسان و پری جن و ملک

(۵۱) لکھنؤ میں مرزا مومن بیگ کو علم قیافہ میں اتنی دستگاہ ہو کہ کسی کو نہیں۔ انسان کے ظاہر و باطن کا نیک و بد بیشتر دریافت کر لیتے ہیں۔ اتفاقاً رنگین اور سبحان قلی بیگ راغب دونوں مرزا کے پاس گئے

اور کہا کہ ہم آپ کے امتحان کو آئے ہیں بارے ارشاد ہو کہ انشاء اللہ خاں انشاء کا کیا حال ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ انشاء کو گدھے کی خصلت سے بہت مناسبت ہے۔ سبحان قلی بیگ نے کہا۔ حضرت تعجب ہے کہ آپ ان کو خر ثابت کرتے ہیں وہ زبردست شاعر اور مرد قابل ہے اور خوش تقریر ہے ہر علم میں اسے دخل ہے کسی مجلس میں کوئی بھی اس سے سبقت نہیں لے جاتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی گدھے کی ایک خاصیت ہیں سے ہے جب گدھا بولنے لگتا ہے تو سب جانوروں کی آواز اس کے سامنے دب جاتی ہے غرض اسی صورت سے کئی وصف اس کے بیان کیے اور مرزا مومن بیگ نے اون کے جواب ایک سے ایک بہتر دیے کہ ان کو گدھا ٹھہرایا۔ آخر یہ بات قرار پائی کہ تم انشاء سے جا کر پوچھو کہ انھیں کس جانور سے زیادہ محبت ہے تو وہ کہیں گے گدھے سے۔ پھر دونوں کے دونوں انشاء کے پاس گئے اور پوچھا آپ کو کس جانور سے محبت ہے۔ واللہ باللہ انھوں نے یہ کہا کہ میں جہاں گدھے کا چھوٹا بچہ دیکھتا ہوں جی میں آتا ہے کہ اسے گود میں اٹھالوں اور بے اختیار گلے سے لگالوں ؎

جھوٹ سے چڑ ہے مجھے سچ بہ خدا بہتر ہے   آدمی جو ہو بُرا اس سے گدھا بہتر ہے

(۴۷) کلکتہ سے سعادت یار خاں رنگین نے کعبہ جانے کا ارادہ کیا جب جہاز[1] میں بیٹھ کر کالے پانی کی سرحد میں پہنچے ایک دن عجب تماشا دیکھا وہ یہ کہ ملاحوں نے مچھلی پکڑنے کے لیے جال ڈالا۔ ایک بڑی مچھلی جال کو توڑا کر لے گئی اور دوسرا موٹا جال ڈالا اوسے پھاڑ کر نکل گئی۔ ناچار ہو کر ایک زبردست بنسی[2] ڈالی اس میں ایک مچھلی پانچ چھ گز کی لگی پھیر میں مانند سپر (ڈھال) کے مدوّر۔ ایک گز لمبا اس کا جسم تھا آدمی کے پہنچے کے برابر

---

[1] ق۔ ن جہاز [2] مچھلی پکڑنے کی ڈور اور کانٹا

موٹی دُم تھی اور نیچے اس کے پَر ایسے تھے کہ جیسے فرشی پنکھے کے نیچے جھالر ہوتی ہے۔ ملّاحوں نے کہا کہ مچھلیاں بہت بڑی بڑی ہیں۔ یہ تو اس ذات کا جھینگا ہے اور یہ سخت جان ہے دیر سے مرے گی ؂

سُن کے یہ مچھلی کا قصّہ دل فگار دیکھ چشمِ دل سے صنعِ کردگار

(۸۰) رام پور میں سعادت یار خاں رنگین کی پانچ چار پٹھان بچوں نے ضیافت کی۔ ان لوگوں کو چار بیت کا گانا بہت پسند ہے لہٰذا چار بیت گانے والا نہایت بدشکل آکر چار بیت گانے لگا اس کے گانے سے رنگین تنگ آگیا کیوں کہ اس گانے میں نہ تال تھا نہ سم[1] سب سُننے والے تنگ آگئے تھے ؂

اپنا گانا وہ سُناتا تھا کیسے وہ خدا جانے رجھاتا تھا کسے

(۸۵) شاہ جہاں آباد میں حضرت مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب درس فرماتے تھے اور لوگ بیٹھے سُنتے تھے۔ ایک دن بیان یہ تھا کہ شارب[2] کو اتنا لمبا ہونا چاہیے اور حدِ شرع سے ادن کا بڑھانا بُرا ہے۔ قیامت کے دن یہ سجدہ نہ کرنے دیں گی۔ ایک مردِ فقیر منشی محمد عظیم کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور منشی صاحب کی مونچھوں کے بال حدِ شرع سے زیادہ تھے۔ فقیر نے مونچھ کا بال پکڑ کر کہا کہ حکیم صاحب معلوم ہے شرع کا حکم کیا ہے۔ انھوں نے دم نہ مارا۔ لیکن لوگوں نے فقیر کی زیادتی دیکھ کر اسے لعنت کی۔ جب فقیر سخت باتیں کرنے لگے تو منشی صاحب نے بھی سختی اختیار کی۔ شاہ صاحب نے دونوں کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور کہا کہ فقیر صاحب تمھیں زیادتی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں نے تو پہلے ہی حکمِ شرع بیان کر دیا تھا۔ منشی صاحب سے کہا کہ آپ نے صبر کیا اب خدا کا شکر ادا کریں کہ حضرت بوعلی قلندر کی شارب کے بال حدِ شرع

---

[1] سُر [2] شارب بمعنی مونچھ

سے زیادہ تھے اوس وقت کے قاضی نے اپنے ایک خادم کو بھیجا کہ موافق شرع کے کتر ڈالے۔ بوعلی قلندر نے اس کی طرف جو جلال سے دیکھا تو خادم غش کھا کر گر پڑا پھر قاضی صاحب خود آئے اور مونچھ کا بال پکڑ کر کھینچا تو قلندر صاحب گر پڑے انھیں چت کر کے موافق شرع کے مونچھیں کاٹ ڈالیں۔ ایک شخص نے قلندر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے قاضی کو جلال سے کیوں نہیں دیکھا کہا کہ وہ خادم احکام شرع لایا تھا کہ اس کے نہ ماننے میں صرف گناہ تھا اور قاضی صاحب خود شرع مجسّم ہو کر آئے ان کا نہ ماننا کفر تھا۔ حضرت بوعلی صاحب جب تک جیے اس مونچھ کو پکڑ کر فرماتے تھے کہ تو راہِ خدا میں کھنچی ہی خوش نصیب ہی۔ پس منشی صاحب آپ بھی شکر بجا لائیں۔ آپ کی مونچھ بھی وہی رتبہ رکھتی ہی۔ خدا کا شکر ہی کہ یہ مونچھ کا ماجرا ہمیں آنکھ سے دکھایا بوعلی والا ماجرا تو ہم نے سُنا ہی تھا۔ یہ سُن کر دونوں صاحب قائل و معقول ہوئے اور منشی صاحب نے شارب کے بال اسی وقت کتروا ڈالے ؎

عمل نیک کرے ہر کوئی لیکن رنگیںؔ نیک اعمال کے کرنے کو ہی شیطاں مانع

مثل ہندی:۔ ناداں بات کرے دانا قیاس کرے

(۸۹) پاٹن[1] کی لڑائی میں نواب احتشام الدولہ مرزا اسمٰعیل بیگ خاں نے سندھیہ پٹیل مرہٹے سے شکست کھائی تو سعادت یار خاں رنگیںؔ بھی ان کے رفیق تھے تمام مال و اسباب کھو کر افلاس کی حالت میں لکھنؤ آئے اور مرشدزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر شہزادہ کے ملازم ہوئے جب ان سے خوب موافقت آ گئی تو اکثر سرکاری امور میں دخل ہُوا۔ غرض رنگیںؔ نے پاسِ نمک اور اپنی آبرو کا پاس اور خوفِ خدا نہ کیا اور ہر خرید و فروخت میں ان کے بہت سے روپے چرائے اور واہیات میں اُڑا ئے بعد دس پندرہ برس کے جب روزگار

---

[1] قریب جو نگر

وہاں سے چھوٹا یکایک اون کو یہ سمجھ آئی کہ خدا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ ایک دن
مرشد زادہ کے پاس جا کر وہ سب حال بر سرِ دربار گزارش کیا کہ اتنا اتنا کچھ
حضور کا میں نے چُرایا ہے اب خوف خدا کا آیا ہے اور میں نے توبہ کی ہے مگر اس
مبلغ خطیر کے ادا کرنے کا مقدور نہیں۔ امیدوار ہوں کہ للہ وہ مجھ کو معاف ہو
تا کہ دل اس عاصی کا اوس گناہ کی طرف سے صاف ہو۔ مرشد زادہ نے فرمایا
کہ تم نے میری ایسی خدمت کی ہے اور خوش رکھا ہے کہ میں نے دل و جان سے
بخش دیا اور اس کے سوا اور بہت کچھ انعام کیا۔

غم فرزند و نان و جامہ و قوت باز دارد ز سیرتِ ملکوت
زن و فرزند سب دشمن ہیں جی کے نہیں آتا کوئی آڑے کسی کے

(۹۲) لکھنؤ سے صاحب عالم شہزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ
بہادر جو شکار کھیلنے کو نکلے تو جریدہ دس پانچ سواروں سے خیر آباد[1] میں
جا نکلے وہاں کے لوگ جو اکثر اسباب تحفہ بھیجنے کا لائے تو حضور میں اوس وقت
کچھ ساتھ نہ تھا۔ لوگوں نے عرض کی کہ لکھنؤ یہاں سے دو اوپر تیس کوس ہے۔
کوئی ایسا شخص جاوے کہ جتنے روپے ارشاد ہوں تین چار دن میں لے آوے
حضور سے ارشاد ہوا کہ سعادت یار خاں رنگین کا یہ کام ہے۔ چناں چہ اوس
وقت پہر دن رہے یہ فرما کر رخصت کیا کہ جلد جا کر ہزار روپے لاؤ۔ وہ حضور
سے رخصت ہو کر دوسرے دن بعد دوپہر ایک ہی گھوڑے پر لکھنؤ سے
یعنی آٹھ پہر میں ہزار روپے کمر میں باندھ کر لائے اور گھوڑا اصلا ماندگی نہ
لایا اس سہولیت سے لے گئے اور لے آئے۔

کام جلدی کا ہے ای رنگیں زبوں کر گئے ہیں پند یہ سب رہنموں
ان حکایتوں سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ دہلی کی

---

[1] واقع قریب جو نگر

ذہنی اور سماجی حالت کیسی تھی۔ 'اخبار رنگین' کی حکایتوں میں بار بار چھوٹی بڑی لڑائیاں اور خانہ جنگیوں کا ذکر آتا ہے۔ مرہٹوں نے جو آفت برپا کر رکھی تھی اور جس نے مغلیہ سلطنت کو سب سے بڑا صدمہ پہنچایا ان حکایتوں میں پوری طرح جھلکتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حتی الوسع اس خطرے کو دور کرنے کے لیے جدوجہد بھی کر رہے تھے کبھی اس میں کامیابی اور کبھی ناکامی نصیب ہوتی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زبردست خطرے کو دور کرنے کے لیے بھی لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ مشورہ نہ تھا اس لیے یہ انفرادی کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہوتی تھیں۔

اس سیاسی خلفشار میں لوگوں کا ذہنی انتشار میں مبتلا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ توہمات میں گرفتار تھے۔ رنگین نے جنات اور آسیب کا بار بار ذکر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ ان چیزوں کو مسلّمہ حقیقت سمجھتے تھے۔

زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگوں میں گوشہ نشینی، قناعت اور فقر کے جذبات بھی پیدا ہو گئے تھے جو لوگ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے علم بردار تھے وہ اس ماحول سے متنفر ہو گئے تھے ان میں یہ طاقت نہ تھی کہ جدوجہد کر کے اس ماحول کو بدل سکیں چناں چہ انھوں نے صوفیوں کی صحبت اور خانقاہوں کی تنہائی میں گوشۂ عافیت تلاش کیا تھا۔ رنگین نے کئی حکایتیں ایسی بیان کی ہیں جن سے ان رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

'اخبار رنگین' چالیس صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں واقعات کو بغیر کسی خاص ترتیب، تقسیم یا مقصد کے بیان کر دیا گیا ہے اس کی زبان سادہ اور آسان ہے اور رنگین کا مقصد صرف ان واقعات کو روزنامچے کے طور پر محفوظ کر دینا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اس سے رنگین کے ماحول اور ان کی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

باب ششم

امتحانِ رنگین

رنگین کی طبیعت میں ایجاد کا مادہ جس قدر تھا اس کی مثال اُردو شاعری کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہو۔ انشاء کے متعلق یہ نقرہ مشہور ہو کہ اُن کے فضل و کمال کو شاعری نے اور شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے ڈبویا، لیکن یہ بات انشاء سے زیادہ رنگین پر صادق آتی ہو۔ غرض یہ ہو کہ رنگین کو ڈبونے کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر عائد کرنے کی بجائے ان کے زمانے اور ماحول پر عائد ہوتی ہو۔ انشاء کی ریختی اور ہجو گوئی کو لکھنؤ کے خاص حالات و واقعات کا نتیجہ بتایا جاتا ہو لیکن رنگین کی ہزل گوئی کلکتہ کے سفر سے شروع ہوتی ہو اور پھر وہ ہزل کا پورا دیوان مرتب کر ڈالتے ہیں۔ انشاء کی ایک آدھ مثنوی رکیک بھی ہو لیکن رنگین کے کلام میں ایسی مثنویوں کا پورا ایک مجموعہ شامل ہو۔ ریختی میں انشا اور رنگین دونوں کے دیوان موجود ہیں لیکن انشاء خود تسلیم کرتے ہیں کہ اس قسم کی ریختی رنگین نے ہی ایجاد کی ہو اور رنگین خود بھی اس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔

اُردو شاعری کی تاریخ پہ نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ خاص شعراء بعض خاص اصناف پر زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ مثلاً ولی کے کلام میں غزلوں کے علاوہ مسدس اور مخمس مثنویاں وغیرہ بھی ہیں لیکن ان کا جوہر صرف غزل میں کھلتا ہو۔ میر تقی میر خدائے سخن کہلاتے ہیں۔ انھوں نے غزلیں، مثنویاں،

قصیدے، مرثیے، سلام، مسدس، مخمس، مستزاد سب ہی کچھ کہے لیکن ان کا اصلی کمال بھی صرف غزل میں ہی ظاہر ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ مثنویوں کو بھی اس میں شامل کر سکتے ہیں۔ قصیدے میں بلاشبہ وہ اپنے حریف مرزا سودا سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مرزا سودا کا حال یہ ہے کہ انھیں بھی غزل گوئی کا دعویٰ ہے۔ اور بلاشبہ ان کی غزلوں کے دیوان میں بعض اعلیٰ درجے کے اشعار موجود ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی غزل میر کی غزل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت قصیدے کی طرف ایسی مائل ہوئی کہ بلاشبہ قصیدے کی زمین کو آسمان بنا دیا اور کوئی دوسرا قصیدہ گو شاعر ان کے مقابلے کی جرات نہیں کر سکتا لیکن مثنوی گوئی میں ان کے متعلق مصطفیٰ خاں شیفتہ کا یہ فقرہ صحیح ہے کہ "مرزا در مثنوی گوئی فکر معقول نہ داشت"۔ یہی حال میر درد کا ہے ان کی شہرت ان کی منتخب غزلوں کی بنا پر ہے۔ میر حسن کی مثنوی گوئی کو ایسی شہرت ہوئی کہ ان کی غزلیں نایاب ہو گئیں۔ یہی حال مصحفی اور جرات کا ہوا کہ ان لوگوں نے بھی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن غزل گوئی کے علاوہ کہیں اور شہرت نہ پا سکے۔

ان سب کے مقابلے میں جب ہم رنگین کی شاعرانہ کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو بلاشبہ وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں بلکہ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں ایک عجیب و غریب شخصیت نظر آتے ہیں ان کا فضل و کمال طبیعت میں ایجاد کا مادہ، مختلف اصناف پر قدرت، الفاظ کا وسیع ذخیرہ اور کلام کی کثرت دیکھی جائے تو ان کے تمام معاصرین ایسے نظر آتے ہیں جیسے دیو کے مقابلے میں کوئی بونا۔ اس کا اندازہ رنگین کے ایک بیان سے ہوتا ہے یہ ان کی مشہور تصنیف "امتحان رنگین" ہے جو "مجموعہ نورتن رنگین" کا نواں حصہ ہے۔

اس کا تاریخی نام "امتحانِ سعادت یار" ہے جس سے ۱۲۴۶ھ برآمد ہوتا ہے۔
جیسا کہ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے جو واقعہ اس تصنیف کا محرک ہوا وہ فیض آباد
میں بہت پہلے پیش آیا تھا لیکن ۱۲۴۶ھ سے پہلے قلم بند نہیں کیا گیا تھا
کچھ عرصے کے بعد جب رنگین باندہ پہنچے تو مرزا محمد علی کی فرمائش پر اسے
قلم بند کیا۔

تفصیل[1] اس کی یہ ہے کہ رنگین فیض آباد میں جو بنگلہ کے نام سے مشہور
تھا پہنچے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ شہرت ہوئی کہ رنگین کو کسی شاعر کے شعر
پسند نہیں آتے اور وہ ہر شاعر کے کلام پر اعتراض کرتا ہے اور اپنے مقابلے
میں سب کو ہیچ سمجھتا ہے۔ چناں چہ آغا تقی خاں، نواب آغا نصیر خاں،
نواب مرزا ہجو صاحب، میر مستحسن خلیق اور مرزا مغل سبقت وغیرہ نے
آپس میں مشورہ کر کے رنگین کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد شعر و شاعری کا
تذکرہ چھڑا اور یہ بات درمیان میں آئی کہ موجودہ زمانے میں سب سے بڑا
شاعر کون ہے۔ کسی نے مرزا رفیع سودا کا نام لیا۔ کسی نے میر تقی کا کسی نے
خواجہ میر درد اور کسی نے میر سوز کے کلام کی تعریف کی اور بعض نے انشاء
جرأت، مصحفی، شاہ نصیر اور ناسخ کا نام لیا اور کسی نے کہا کہ اب کوئی استاد
نہیں رہا۔ رنگین کا بیان ہے کہ اس گفتگو سے ان کی بشریت جوش میں آئی
بہ قول نظامی :-

زبانش ز گرمی بر آشفتہ شد سخن ہائے ناگفتنی گفتہ شد

چناں چہ رنگین نے کہا کہ شاعروں کی چار قسمیں ہوتی ہیں اوّل شاعر، دوم
استاد، سوم ملک الشعراء، چہارم علامہ۔ تعریف ان کی یہ ہے کہ جو شخص
طبع موزوں رکھتا ہے اور شعر کہتا ہے شاعر ہے خواہ صد ہزار شعر کہے۔ استاد وہ

---

[1] ماخوذ از دیباچہ فارسی "امتحان رنگین" نوشتۂ رنگین

ہے کہ صاحب طرز شاعر ہو جائے خواہ عمر بھر میں صرف سو شعر ہی کہے۔
ملک الشعراء وہ ہے جو کئی طرزوں پر قادر ہو اور علّامہ اسے کہا جائے گا جو خود کئی طرز ایجاد کرے۔

رنگین کے نزدیک زبان ریختہ میں بہت سے شاعر ہوئے ہیں لیکن درد، میر، انشاء، میر سوز، جرأت، مصحفی، میر حسن، نصیر اور ناسخ استاد ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنا طرز جدا ہے۔ سودا ملک الشعراء ہیں کہ ایک سے زیادہ طرز پر قادر ہیں لیکن علّامہ ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ وہ صرف اپنے آپ ہی کو علّامہ سمجھتے ہیں اور اس کی تین دلیلیں دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اصنافِ سخن کی جو مختلف ستائیس شکلیں ہیں سوائے ان کے کسی دُوسرے شاعر نے ان تمام اصناف میں افراط کے ساتھ شعر گوئی نہیں کی۔ دُوسرے یہ کہ حضرت امیر خسرو کے علاوہ کسی نے بھی پانچ یا چھ زبانوں میں شعر نہیں کہے لیکن رنگین نے مجموعۂ رنگین، میں سترہ زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ سوائے مولانا جامی کے کسی نے سات بحروں میں مثنوی نہیں کہی۔ رنگین نے گیارہ بحروں میں مثنویاں کہی ہیں۔
ان تین وجوہ کی بنا پر رنگین کو ان کے بہ قول تمام شعراء پر فوقیت حاصل ہے؛

اصنافِ سخن کی ستائیس قسمیں جن کا رنگین ذِکر کرتے ہیں یہ ہیں:۔
(۱) قصیدہ (۲) مثنوی (۳) مرثیہ (۴) سلام (۵) غزل (۶) رباعی (۷) قطعہ (۸) فرد (۹) تاریخ (۱۰) ترجیع بند (۱۱) ترکیب بند (۱۲) مسدّس (۱۳) مخمّس (۱۴) مربّع (۱۵) مثلّث (۱۶) مستزاد (۱۷) ملمعہ (۱۸) تضمین (۱۹) قطعہ بند (۲۰) واسوخت (۲۱) پہیلی (۲۲) صنائع بدائع (۲۳) شہر آشوب (۲۴) گبت (۲۵) دوہرہ (۲۶) ساقی نامہ (۲۷) چار بیت۔

"رنگین نامہ، صفحہ ۵۶ جو "سبع سیارۂ رنگین" کا چوتھا حصہ ہے اس میں بھی شعر کی ۲۷ قسموں اور سترہ زبانوں میں شاعری کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"گفتن شعر بدالست بندہ بست و ہفت قسم است چناں چہ بندہ آں بست و ہفت قسم را نظم کردہ گاہے دیدہ وشنیدہ نہ شدہ کہ از ابتدائے خلقت شعر کہ عرصہ دو ہزار سال گزشتہ شد کسے تا امروز سوائے حضرت امیر خسرو دہ پانزدہ قسم را ہم از اں جملہ بیست و ہفت قسم نظم کردہ باشد اگر کلیات بندہ را کسے تکلیف کشیدہ تمام و کمال مطالعہ کند یقین کہ بہ افراط آں بیست و ہفت قسم را بہ یابد ایں نوشتن صرف برائے شان و شوکت خود نہ نوشتہ ام بلکہ ادائے شکر حق جل شانہ ادامی نمایم کہ ہم چو من بے سرو مال را ایں نعمت ادا کردہ کہ بہ کسے مرحمت نہ فرمودہ بہ موجب ایں تفصیل :۔

(۱) قصیدہ (۲) مثنوی (۳) مرثیہ (۴) سلام (۵) غزل (۶) رباعی (۷) قطعہ (۸) فرد (۹) تاریخ (۱۰) پہیلی (۱۱) واسوخت (۱۲) منقبت (۱۳) کبت (۱۴) دوہرہ (۱۵) ترجیع بند (۱۶) ترکیب بند (۱۷) مسدس (۱۸) مخمس (۱۹) مربع (۲۰) مثلث (۲۱) بحر طویل[1] (۲۲) مستزاد (۲۳) ملمعہ (۲۴) صنائع بدائع (۲۵) تضمین (۲۶) قطعہ بند (۲۷) شہر آشوب۔

و در ہفدہ زبان دیوان نظم کردہ نام آں "مجموعۂ رنگین" نہادہ ام در ہفدہ زبان ہم کسے شعر نہ گفتہ آں دیوان "مجموعۂ رنگین" اگر کسے مطالعہ کند امتحان کند بہ موجب ایں تفصیل :

(۱) عربی (۲) ترکی (۳) فارسی (۴) پشتو (۵) ہندی (۶) مارواڑی

---

[1] ق۔ ن۔ تو یل

(۷) بھاکا (۸) پوربی (۹) دکھنی (۱۰) ہزل (۱۱) برج (۱۲) ہندی فرنگی (۱۳) ہندی کشمیری نو آمد (۱۴) ہندی افغان بچہ ہا (۱۵) پنجابی کھترانی ہا (۱۶) اردوئے بیگمات (۱۷) پنجابی پچادہ ہا یعنی دہقانی۔

نیز دریازدہ بحر بہ قدر چہل و دو مثنوی کہ بہ قدر بیست ہزار شعر دارند نظم کردہ ام در تصوّف و ظرافت و معاد و معاش و علم مجلس و خطوط نویسی، کسے دریازدہ بحر مثنوی ہا ہم نہ گفتہ مگر حضرت جامی در ہفت بحر مثنوی گفتہ اند دیگرے در ہفت بحر ہم نہ گفتہ پانصد شش حکایت عجیب عجیب نظم کردہ ام۔"

ایک ایک دو دو فن میں استاد کامل مشہور ہوئے ہیں مثلاً فارسی میں خاقانی، انوری اور عرفی نے قصیدے میں نام پیدا کیا۔ حضرت فرید الدین عطار، مولوی روم، مولانا جامی اور اہلی شیرازی مثنوی گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ فردوسی، نظامی، مرزا رفیع[1] باذل صاحب در شاہ نامہ گوئی بے نظیر اند۔ حضرت ابو سعید ابو الخیر، عمر خیام رباعی میں بے بدل ہیں۔ سعدی حافظ شیراز، مرزا محمد علی صائب، غنی کشمیری، بابا فغانی، ظہوری، نظیری شیخ علی حزیں، مرزا قتیل، نور العین واقف وغیرہ غزل گوئی میں اپنا ہمتا نہیں رکھتے۔ خسرو دہلوی صنائع بدائع گوئی میں مشہور ہیں۔ ہندی زبان میں رفیع سودا قصیدہ گوئی میں مشہور ہیں۔ میر حسن مثنوی گوئی میں حضرت خواجہ میر درد صاحب رباعی گوئی میں، میر سوز قطعہ گوئی میں۔ میر فیض ہم شیرہ زادہ میر تقی واسوخت گوئی میں۔ میر مستحسن خلیق، گدا، شیخ احسان سکندر، مسکین اور خادم مرثیہ اور سلام گوئی میں۔ میاں غلام علی شاہ غلامی مخمس گوئی میں۔ میر تقی، انشاء اللہ خاں، میاں جرأت، مصحفی، نصیر صاحب، شیخ ناسخ صاحب غزل گوئی میں لیکن انشاء اللہ خاں

---

[1] محمد رفیع خاں باذل کی نظم "حملۂ حیدری" ۱۲۶۷ھ میں لکھنؤ میں چھپی

صنائع بدائع گوئی میں بھی خاصی دست گاہ رکھتے ہیں ۔ میں نے ستائیس کی ستائیس قسموں میں بہ افراط شعر گوئی کی ہے اور یہ شاعری عوام و خواص نے پسند کی ہے۔

ستائیس کی ستائیس قسموں کے نمونے اس دیوان میں موجود ہیں چناں چہ قصیدۂ فارسی بہ طرز خاقانی در تعریف برادر صاحب قبلہ و کعبہ نواب صوفی اللہ یار بیگ خاں معتقد الدولہ شہامت جنگ جانشین حضرت صوفی آبادانی صاحب قدس سرہٗ ۵۲ شعر پر مشتمل ہے :ے

بندۂ خاص کبریائی تو — فخر مرداں پارسائی تو
واقفِ مظہر خدائی تو — بے شک و شبہہ اولیائی تو
ہر مکاں را کمیں بود لائق — مسندِ فقر را سزائی تو
بود سیّد حسن رسول نما — سالکاں را خدا نمائی تو
بہ رہ راست رہ نما گردد — گم رہے راکہ رہ نمائی تو
فیض عامت بہ ہر طرف جاریست — غافل از حال ماجرائی تو
بر مسم اند کے زن اکسیرے — من مس و قبلہ کیمیائی تو
در نظمے کہ سفتہ ای رنگین — ذی حق و مورد صلائی تو

صوفی اللہ یار بیگ کے متعلق ' حدیقۂ رنگین ' میں بھی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

بندۂ خاص کبریائی تو — فخر مردانِ پارسائی تو
حامئ دینِ مصطفائی تو — واقفِ سرّ مرتضائی تو
صوفی اللہ یار نام تو ہست — بانی و موجدِ عطائی تو
رشک دارالشفاست ماوایت — درد ہر درد را دوائی تو

پیشوائی تو پیشوایاں را | پیشوائی چہ پیشوائی تو
بہرِ آمرزشِ گنہ گاراں | دائما دست بر دعائی تو
نہ کنی جز رضائے من کارے | زاں کہ خود طالع رضائی تو
پایۂ تست از فلک برتر | چہ قدر کردہ ای رسائی تو
ہر مکاں را مکیں بود لائق | مسندِ فقر را سزائی تو
گم رہاں از تو رہ نما گشتند | ثانیٔ خضر رہ نمائی تو
نہ کشاید بہ ناخنِ تدبیر | عقدہ را کہ می کشائی تو
ایں ز آثار ظاہرت پیداست | خانۂ شرع را بنائی تو
ہمہ شاہاں گدائے خاک درت | بوالعجب، شاہ را گدائی تو
بہ وقوعش دگر نہ گردد دیر | مقصدے را کہ مدعائی تو
بر سر بے کساں و محتاجاں | بہتر از سایۂ ہمائی تو
در حضورِ تو مطلعِ ثانی | بہ کنم عرض کز چہ جائی تو

اس کے بعد مطلع ثانی ہے جس میں اکیس شعر ہیں ان میں سے چند اشعار درجِ ذیل ہیں :-

وصل در ذاتِ کبریائی تو | زاں در اندیشہ می نیائی تو
واقف از مظہرِ خدائی تو | بے شک و شبہہ اولیائی تو
بود سیّد حسن رسول نما | سالکاں را خدا نمائی تو
حاجتے دارم از جفائے فلک | حاجتم را روا نمائی تو
دُر نظمے کہ سفتہ ای رنگیں[1] | ذی حق و موردِ صلہ ای تو

گردہ کلک تو در فشانی ہا
واقعی لائقِ عطائی تو

---

[1] یہ شعر مطلع اوّل میں بھی آیا ہے

قصیدہ در ہندی بہ طرزِ انوری در ہفت زبان بہ توصیف ٹیپو شاہ پسر حیدر نایک مالک مندراج۔ ۲۷ شعر پر مشتمل ہے:۔

کیوں نہ شاہاں جہاں سے ہوئے تجھ کو برتری ۔۔۔ ہے جبیں سے آشکارا تیرے شانِ حیدری

صفحۂ ہستی پہ تجھ سا دوسرا بنتا نہیں ۔۔۔ کلکِ نقاشِ ازل کرتی ہے گو صنعت گری

ایک دن آیا تھا گستاخانہ تیرے سامنے ۔۔۔ اب تلک اندام پر خورشید کے ہے تھرتھری

آج جو حشمت تجھے ہے وہ سکندر کو نہ تھی ۔۔۔ ہے بجا فغفور چیں تیری کرے گر چاکری

چاہیے کنگ فرنگ اپنے کو سمجھے وہ کوئی ۔۔۔ تیرے دروانے پہ جو ہوئے تلنگا سنتری

اور اس ثروت پہ تیرے عدل کا عالم یہ ہے ۔۔۔ شیر سے ہرگز نہیں ڈرتی ہے بکری بربری

ہو کے حاضر شاہ ٹیپو سے کروں جا کر یہ عرض ۔۔۔ وصف تیرا کیا لکھے رنگیںؔ بہ قولِ انوری

ختم شد بر تو سخاوت بر من سکیں سخن ۔۔۔ چوں شجاعت بر علیؓ بر مصطفےٰؐ پیغمبری

قصیدہ بہ ہندی در توصیف امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر بہ طریق مرزا رفیع سودا۔ ۸۰ شعر پر مشتمل ہے:۔

داغِ عشقِ عارضی کرتا ہے ہر دل کو سیاہ ۔۔۔ دھو نہیں سکتا کلف کو چہرۂ روشن سے ماہ

گر لباسِ ظاہری سے زنگِ باطل دور ہو ۔۔۔ چاہیے ہوئے نہ دودِ شمعِ کافوری سیاہ

اپنی عزلت گاہ سے ہرگز قدم باہر نہ رکھ ۔۔۔ کم ہوئی یوسف کی قیمت چھوڑ کر زندانِ چاہ

جسم میں ہوتا ہے رعشہ ہر ضعیف و پیر کے ۔۔۔ ہر سحر فانوس میں کانپے ہے شمعِ صبح گاہ

ہو گواہانِ لباسی کی شہادت کب درست ۔۔۔ ماہ کنعانی کا ہوئے چاک پیراہن گواہ

کب سبک یاروں سے باریک سر ہو اٹھ سکے ۔۔۔ چشم کی پرواز کو ہوتا ہے سنگ اک برگ کاہ

میں نہیں کرتا شکایت گردشِ ایام سے ۔۔۔ پر لگا تا سنگ ہوں تیغِ زباں کو گاہ گاہ

لکھ قصیدہ اس زمیں میں ایک رنگیںؔ اور تو ۔۔۔ مدح غایب لیکن اس میں پائے اک ذرہ نہ راہ

اور ایسا ہو سراسر اس کی وہ تعریف میں ۔۔۔ جس کے ہر یک شعر پر عرفی کے نکلے منہ سے واہ

قصیدہ در اصطلاحات و محاورات زبان بیگمات شاہ جہاں آباد کہ بندہ ایجاد کردہ ریختی نام نہادہ در توصیف نوری شہزادہ یعنی میاں شاہ دریا صاحب بہ طرزِ ایجاد خود۔ ۵۲ شعر پر مشتمل ہے:۔

فلک کے ہاتھ سے اتنا یہ ناک میں ہے دم
کہ کھا کے سو رہوں کچھ جی میں ہے علیؑ کی قسم

یہ بَیر باندھا ہے اب مجھ سے اس کمینہ نے
کہ ہو سکے ہے بیاں وہ نہ ہو سکے ہے رقم

میں اپنی جان سے بھی اب تو تنگ آئی ہوں
اذیتیں مجھے لاکھوں ہیں اس سے بلک پیدم

یہ ہاتھ اٹھاتا نہیں مجھ سے مَیں نے قدری[1] کی
ہے ایسا ڈھیٹھ کہ ہوتا ہے خوش یہ کرکے ستم

زباں تو ایک ہے کس کس کا میں کروں شکوہ
ادھر ہے ساس کا دکھ اور ادھر ہے نند کا غم

کہیں تو آتوجی[2] بیٹھی ہیں بیر[3] دوڑاتی
کہیں پکار کے ہیں تالستی[4] بڑی بیگم[5]

دوم مثنوی فارسی بہ طرز حضرت مولوی روم و بیان حکایات در تصوف بہ طرز میر حسن بہ ہندی و طرز ایجاد خود در زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد۔ ۶۰۰ شعر پر مشتمل ہے:۔

یا الٰہ العالمیں رب الجلیل	برتری و بہتری از قال و قیل
قطرہ را گوہر نمودی در صدف	بر فلک انجم کشیدی صف بصف
طوقِ لعنت یافت از تو آں یکے	بر خلافت شد مقامِ دیگرے

---

[1] نزد دیکیا [2] پڑھانے والی [3] موکل [4] گھر کتی [5] نانی

تو عطا کردی شکر در ذشکر　　تا کسے را می خورانی کی شکر
از تو برپا شد زمین و آسماں　　از تو رنگا رنگ شد خلق جہاں

مثنوی در ہندی بہ طرز حضرت فریدالدین عطار در تصوف و حکایت
در حکایت گرہ باہم دگر بعد بیان مدعا ایں قید در تمام مثنوی است ہر گاہ
ایں عمل ایجاد شد ازیں سبب نام آں "ایجاد رنگیں" است مشتمل بر ہزار شعر[۵]

حمد ہو سکتی ہے کب اس پاک کی　　پاک کی جس نے یہ صورت خاک کی
سوختہ ہو جس جا ملائک کے بھی پر　　اس جگہ میں کر دیا اس کا گزر
یہاں تلک رتبہ دیا اس خاک کو　　کر دیا فرماں میں ہفت افلاک کو
پھر نَفَخْتُ فِیْہِ[۱] فرمایا اسے　　جز بشر یہ حکم آیا ہے کسے
صانع قدرت نے جس دم کی رقم　　صفحۂ تقدیر پر لے کر قلم
کُن کے کہتے جس گھڑی بنیاد کی　　صورتِ کون و مکاں ایجاد کی
بے ستوں برپا کیا افلاک کو　　اور پانی پر بچھایا خاک کو
پھر بگڑنے جب لگا وہ رنگِ فرش　　کوہ کے اس پر رکھے تب سنگ فرش

مثنوی در تجنیس قافیہ در ہندی بہ طرز اہلی[۲] شیرازی بہ پند و نصیحت
نظم شدہ مشتمل بر چار صد شعر[۵]

حمد اسے کہ جو کہ ہے جان آفریں[۳]　　تا کہیں سب تجھ کو ای جان، آفریں[۴]
آوے پھر جس وقت باری[۵] نعت کی　　نظم ہو مقبول باری[۶] نعت کی
مدح کہنے میں نہ ہو لاچار[۷] یار　　تو مدد کو اپنی اب لا چار[۸] یار
جس قدر اصحاب ہیں اس کے تمام[۹]　　ان میں جو کم ہے وہ ہے مرد تمام[۱۰]

---

[۱] وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ کی طرف اشارہ ہے پارہ ۱۴ رکوع ۳ [۲] اہلی شیرازی کی مثنوی "سحر حلال" ہے [۳] رب العالمین [۴] ای شخص [۵] نوبت [۶] پروردگار [۷] مجبور [۸] چار خلیفہ [۹] سب [۱۰] کامل

کام رکھ ان سے اور ان کی آل[1] سے — تا ترا منہ سُرخ ہوئے آل[2] سے

مثنوی در ہندی بہ طرز میر حسن در جواب بے نظیر و بدر منیر کہ انتہائے مثنوی گوئیست نظم شدہ - ہزار شعر دارد

لکھوں پہلے حمد اپنے معبود کی — بنا جس سے ہے بود و نابود کی
ولے سوچ ہے یہ کہ حمد خدا — زبانِ بشر سے ہو کیوں کر ادا
مگر پھر یہ آتا ہے جی میں خیال — کہ خالق کے آگے نہیں کچھ مجال
بیاں حمد مجھ سے تو کب ہو سکے — ولے وہ جو چاہے تو سب ہو سکے
اگر چاہے وہ میرا پروردگار — تو آنے لگے شاخ آہو میں بار
جو وہ قدرت اپنی ہویدا کرے — تو ہر سنگ میں لعل پیدا کرے
اگر چاہے وہ خالقِ جزو کل — تو مہکے ہر ایک خار سے بوئے گل

مثنوی بدھو گل فروش و وزیرن سبزی فروش یعنی کنجڑان کہ ہر دو خود ہارا در چاہ انداختہ مردند و ایں معاملہ در شاہ جہاں آباد بہ روئے چشم خود گزشتہ در پانصد شعر نظم شدہ

الٰہی چاہ کی اس دل کو دے چاہ — بتا دے چاہ کی سیدھی اسے راہ
کہ تا یہ چاہ کر تجھ کو سراہے — ترے بن اور کو مطلق نہ چاہے
زباں پر لائے جب چاہت کا یہ نام — بہ خیر آغاز سے ہو اس کا انجام
اسے کر عشق سے اپنے یہ ممتاز — کہ تجھ بن اس کا ہو کوئی نہ دم ساز
مکانِ عشق ازبس لامکاں ہے — رسائی عشق تک اس کی کہاں ہے
فلک سے عشق کا پایہ ہے برتر — رسائی عشق تک اس کی ہو کیوں کر
اسے کر عشق کے معنی سے آگاہ — کہ رستہ چاہ کا سمجھے یہ گم راہ
اسے ایسا کر اپنا عاشقِ زار — کہ ہو تیرے سوا پھر کچھ نہ درکار

[1] آل بمعنی اولاد ہے خاص طور پر لڑکی کی اولاد، رنگین نے بمعنی نبیرہ لکھا ہے۔ [2] رنگ گل

نہیں بن عشق لذّت زندگی کی ۔۔۔ بن اُس کے زیست ہی شرمندگی کی
بغیر از عشق کے سب شئے ہے فانی ۔۔۔ یہ سچ ہے اور باقی ہے کہانی

مثنوی بہ طرزِ مولوی جامی در بیان حکایات عجیب و غریب نظم شدہ از آں جملہ است ؎

بادشاہ ایک نہایت تھا رحیم ۔۔۔ حق نے تھا اس کو دیا خُلقِ عظیم
حالِ مجنوں سے ہوا وہ آگاہ ۔۔۔ کہ ہوا پیچھے وہ لیلیٰ کے تباہ
اشتیاق اس کو ہوا لیلیٰ کا ۔۔۔ ایک دن اس کو بُلا کر دیکھا
بس کہ خوب اس کی نہ تھی کچھ صورت ۔۔۔ بادشہ کو نہ ہوئی کچھ رغبت
بادشہ نے یہ کیا اس سے سوال ۔۔۔ قیس ہے تیری ہی خاطر بےحال
تجھ سے کیا اور نہیں ہے پیدا ۔۔۔ اس قدر کیوں ہے وہ تجھ پر شیدا
بادشہ سے یہ سخن سُن کے شتاب ۔۔۔ دیا لیلیٰ نے اُلٹ کر یہ جواب
نہ زنی بارِ دگر حرف جنوں ۔۔۔ بنیم گر تو بہ چشمِ مجنوں
جیسے الفت ہے جس سے ای رنگیں ۔۔۔ اس سے ہی دل کو ہے اس کے تسکیں

مثنوی در ہندی بہ طرزِ نادرات در پند و نصیحت کہ یک مصرع سادہ و در مصرع دوم دستان ہندی یعنی کہاوت کہ در روزمرہ بر زبان ہر یک بر موقع تقریر می آید۔ شش صد شعر دارد ؎

بسم اللہ کو پہلے لکھ کر ۔۔۔ لکھ ای رنگیں نعتِ پیمبر
پھر لکھ مدح چہار خلیفہ ۔۔۔ تھے جو نبی کے یار خلیفہ
کہہ کے مناقب آلِ نبیؐ کا ۔۔۔ ہیں تو محب اولادِ علیؑ کا
پھر آگے خاموش نہ رہنا ۔۔۔ مثنویاں ایک تین تو کہنا
ڈول[1] ان کا پھر کچھ ایسا ہو ۔۔۔ ایک سے ایک کی طرز جدا ہو

---

[1] ڈھنگ، طور، قسم

اسم بھی ہاتھ آیا تیرے ڈھب کا نام دمثلث، ہو ان سب کا

سوم مرثیہ بہ طرز میر مستحسن صاحب خلیق خلف الرشید میر حسن صاحب شش مصرعی

ایک راوی سے سُنا ہی کہ جنابِ سرور کر گئے جس گھڑی اس عالمِ فانی سے سفر
حضرت فاطمہ تب کھول کے بالوں سے سر دم بہ دم کہتی فلک سے تھیں یہی آہیں بھر
بعد مردن ز جفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

مرثیہ بہ طرز سکندر چار مصرعی

ہی روایت یوں کہ ہو کر شہ مدینے سے رواں لائے دشتِ کربلا میں اپنا سارا خانماں
ظلم جو گزرا انھوں پر کیا کروں اُن کا بیاں بوند بھر پانی کو ترساتے تھے اُن کو ظالماں

چہارم سلام بہ طرز شیخ احسان صاحب و خادم وغیرہ بہ طرز غزل دو مصرعی

مدام جھک کے یہ کرتا فلک ہی جس کو سلام وہی امام ہی کیسا امام ابن امام

پنجم غزل بہ طرز سعدی و حافظ و بابا فغانی و نور العین واقف و مرزا قتیل و ہندی بہ طرز میر تقی و انشاء اللہ خاں و جرأت و مصحفی و میاں نصیر و شیخ ناسخ غزل فارسی بہ طرز مرزا صائب

اگر صاف است آئینہ رخ دل بر شود پیدا کہ تا صیقل نہ گردد تیغ کی جوہر شود پیدا
دلے کو سوخت در ہجرِ بتاں بر نشگفد ہرگز مخور بے ہودہ غم کی گل ز خاکستر شود پیدا
بہ راہ عاشقی در عین ویرانیست آبادی دریں منزل گر از تن سر رود افسر شود پیدا

غزل بہ طرزِ سعدی:

بر تو بے ساختہ مفتوں شدہ ام نیستم قیس کہ مجنوں شدہ ام
وصل چوں گشت بہ دریائے محیط قطرہ دانست کہ جیحوں شدہ ام

غزل بہ طرز بابا فغانی سے

دوست یک سو خود ز دشمن کین نمی خواہیم ما
خاطرے از ما بر نجد ایں نہ می خواہیم ما

کوچہ دل دار ما را بہر آسایش بس است
کشور ایران و ملک چیں نمی خواہیم ما

مژدہ باد ای زاہد و راہب کہ از روز ازل
بندۂ عشقیم کفر و دیں نمی خواہیم ما

غزل بہ طرز حافظ سے

شنیدم ساقیٔ کوثر توئی ای قبلۂ دل ہا
دمے آئی کہ ہستم تشنہ ای حلال مشکل ہا

سرت گردم بیا و سیر روز عید قرباں کن
کہ می رقصد بہ شکل مرغ بسمل نیم بسمل ہا

غزل بہ طرز نور العین واقف

حال دل شرح زبانی چہ کنم
چہ کنم دشمن جانی چہ کنم

در تواں بو نہ بود ای غنچہ
تو اگر تنگ دہانی چہ کنم

از برم دل بہ نگاہے بردی
بار سوم بگرانی چہ کنم

غزل بہ طرز میر تقی :سے

پری ہونا ہی آساں اور پری سے حور ہو جانا
دلے مشکل ہی تجھ سا او بت مغرور ہو جانا

یہی گر ہجر کا غم ہی تو دن اور رات رو رو کر
عجب کیا ہی ترا ای چشم تر ناسور ہو جانا

کبھی شاید وہ آ نکلے عیادت کے بہانے سے
مجھے بھاتا ہی اپنا اس لیے رنجور ہو جانا

تڑپنے میں پڑیں چھینٹیں مبادا تجھ پر او قاتل
لگا کر تیغ میرے پاس سے تو دور ہو جانا

مرا وہ رشک مہ جس وقت بیٹھے آ کے محفل میں
تو بس اس وقت پھر ای شمع تو کافور ہو جانا

اگر اس کو نشہ ہوگا تو بس میں مر ہی جاؤں گا
مرے حق میں ہر سم اس چشم کا مخمور ہو جانا
بعینہ مری آنکھیں بن گئیں دولاب[1] اشکوں سے
کبھی خالی انھیں ہونا کبھی معمور ہو جانا
نہ نکلے زور سے جو کام وہ زر سے نکلتا ہے
بڑا ہی قہر ہے عاشق کا بے مقدور ہو جانا
قسم ہے ایک عالم کو رولا دیتا ہے ای رنگیں
وہ اس کی جھڑکیاں کھا کر ترا مجبور ہو جانا

غزل بہ طرز مصحفی ؎

شراب پی لب جو بیٹھ کر سحاب کے دن
کہ تیری اٹھتی جوانی ہے اور شباب کے دن
یہی تو غم ہے کہ نکلے گی کب ہوس دل کی
پھریں گے دیکھیں کب اس خانماں خراب کے دن
نکل گیا تیرا بل صاف حسن یار کے ساتھ
کہاں وہ اب ترے ای زلف پیچ و تاب کے دن
جفا و جور و ستم بے شمار ہیں اس کے
الٰہی کچھ نہ حساب اس سے ہو حساب کے دن

غزل بہ طرز جرائت

جب وہ دوڑا نیچہ مجھ پر دو دھارا کھینچ کر
ہاتھ تب ہمدم نے اپنے سر پہ مارا کھینچ کر
بن سکا جب دُر نہ اس کے گوش کا بہزاد[2] سے
رہ گیا تب پاس مر کے ایک تارا کھینچ کر

[1] رہٹ [2] نام ایک نقاش کا جو عہد حکومت شاہ اسمٰعیل صفوی میں تھا

کیا کشش دل کی غضب ہے حضرت یوسفؑ کو جو
برسرِ بازار لائی آشکارا کھینچ کر

کھل گئے ٹانکے رقیبوں کے جونہی جراح نے
زخمِ سینہ سے مرے پھاہا اتارا کھینچ کر

سنگ دل میں نے کہا جب اس کو تب اس شوخ نے
مارا چھاتی میں مرے ایک سنگ خارا کھینچ کر

ہاتھ دامن کو لگا میرا تو وہ کہنے لگے
پھاڑ ڈالا تو نے کیوں دامن ہمارا کھینچ کر

غزل بہ طرزِ انشاءؔ

دیکھ لو یارو کوئی دن زندگانی کا مزا
پھر کہاں یہ ولولے اور نوجوانی کا مزا

اپنے ایک چھلّے کا گُل[1] دے کر وہ میرے ہاتھ پر
جل کے بولے یاد رکھنا اس نشانی کا مزا

کان دھر کر سُن لو میری آج ساری سرگزشت
تم اُٹھاؤ گے بہت سا اس کہانی کا مزا

جو لکھا تھا اس نے وہ تو پڑھ لیا ای نامہ بر
اب یہ جی میں ہے چکھیں حرف زبانی کا مزا

عمر کھوئی ہجر میں آخر کو وصل اس سے ہوئے
ہم نے مر مر کر اُٹھایا زندگانی کا مزا

گاہ وہ آوازِ بلبل پر رکھے ہرگز نہ کان
جس کو پڑ جائے ہماری شعر خوانی کا مزا

پوچھ مت احوال رنگیںؔ کا اوسے اب ہجر میں
بن ترے کھانے کی لذت ہے نہ پانی کا مزا

غزل بہ طرزِ شیخ ناسخؔ

پھر خیال اپنا گریباں کی طرف آنے لگا
پھر جنوں کچھ کچھ مجھے تعلیم فرمانے لگا

پھر لگا رہنے تصور اس کا آنکھوں میں مری
پھر دل اپنا بات سے ناصح کی گھبرانے لگا

پھر لگا دل کو مرے بھانے اکیلا بیٹھنا
پھر میں چپ جوں بلبل تصویر رہ جانے لگا

[1] داغ، معشوق کے چھلّے کو گرم کرکے جو داغ دیتے ہیں وہ بھی گُل کہلاتا ہے۔ اس اپنے ہاتھ کے گل [illegible] کا اک کہانی ہے۔ نشانی ان کی چھلا تھا سو اس کی یہ نشانی ہے

پھر سرکنے پاس سے میرے لگا ناموس و ننگ | پھر نئے سر سے محبت کا مزا آنے لگا
پھر لگا میں یاد کرنے زلفِ عنبر فام کو | پھر خطِ سبز اس کا باغِ سبز دکھلانے لگا
پھر لگا میں مشق کرنے نالہ و فریاد کی | پھر لگا میں بھرنے آہیں پھر میں چلانے لگا
پھر مجھے وحشت کی باتوں سے ہوئی دل بستگی | پھر میں سودائی سرِ بازار کہلانے لگا
پھر مجھے یاد آئے اس کے بال وہ بکھرے ہوئے | پھر ہر ایک مو سے میں اپنے دل کو الجھانے لگا
پھر لگا آنے مجھے دھیان اس کی چشم مست کا | پھر میں بے خود ہو کے صحرا کی طرف جانے لگا
پھر مجھے بھانے لگا چھاتی کا ہر دم کوٹنا | پھر میں اپنے سر کو دیواروں سے ٹکرانے لگا
پھر لگا میں خونِ دل کو اپنے پینے مے کی طرح | پھر گزک کے بدلے لختِ دل کو میں کھانے لگا
پھر لگی یاد آنے مجھ کو اس کی وہ چھیڑیں کی | پھر دل اس کی چٹکیوں کی یاد دلوانے لگا
پھر غزل کہنے لگا رنگیں میں اپنے حسب حال | پھر غزل کی رکھ کے تانیں آپ میں گانے لگا

ششم رباعی ہائے فارسی بہ طرزِ ابوسعید ابوالخیر و عمر خیام و امیر خسرو و در ہندی بہ طرزِ خود۔ رباعی بہ طرزِ ابوسعید ؎

چشمے دارم کہ صد تماشاست درو | اشکے دارم کہ موج دریاست درو
رنگیں دارم دلے پُر از خونِ جگر | یک سر دارم ہزار سوداست درو

رباعی ہندی بہ طرزِ ابوسعید ابوالخیر ؎

رنگین تجھ سے ہو گر ملاقی ساقی | تو کہیو پلا دے لاکے باقی ساقی
اس ابر و ہوا میں بن تیرے رو رو کر | کوئی کب تک پکارے ساقی ساقی

رباعی ہندی بہ طرزِ عمر خیام ؎

غم مرنے کا دم بہ دم کرے کس کی بلا | اندیشۂ بیش و کم کرے کس کی بلا
ہو آخر کار سب کو مرنا رنگیں | آخر تو فنا ہے غم کرے کس کی بلا

۱؎ قریب دینا ۲؎ بدرقہ شراب ؎
ساقی تجھے خدا کی قسم بزم مے میں آج | ہر گز کہ ہو یہ حلِ بریاں علی الخصوص (تجمل)

رنگین لازم یہی ہے غم ہی نہ رہے — کچھ تجھ کو خیال بیش و کم ہی نہ رہے
آخر تو جہاں میں کوئی رہنے کا نہیں — پھر غم کا ہے کا جب کہ غم ہی نہ رہے

رباعی فارسی بہ طرز عمر خیام سے

در کعبہ گزر و گر بہ دیر است ترا — الفت با دوست یا بغیر است ترا
رنگین گر با کریم راہے داری — البتہ کہ عاقبت بخیر است ترا

رباعی در ہندی بہ طرزِ خود سے

رنگین قوت پر اپنی مغرور تھے ہم — اور خلق کے نزدیک بہت دور تھے ہم
پھر آخر کار خوب جو غور کیا — مجبور تھے اور سخت مجبور تھے ہم

توصیف میں پنجتن کے رنگین بن ٹھن — مضمون گزرا نیا یہ جی میں فورا
یعنی وہ جو کہ ہے یدِ قدرتِ حق — اس ہاتھ کی انگلیاں یہ پانچوں تن

ہفتم قطعات در فارسی بہ طور سعدی و انوری و در ہندی بہ طرز میر سوز

صاحب وطرزِ خود ——— بہ طرزِ سعدی

گفت در خلوتے زنے با شوئے — کہ ز وصلم چو سیر می آئی
می شوی از کنارم و ز سفر — چقدر ہا کہ دیر می آئی

بہ طرز انوری در ہزل سے

دست بر دم بر ویش ای رنگین — ہر کرا در دل آرزو کردم
چو بہ دیدم کہ می نہد پہلو — بر وہ در خلوتش فرو کردم

قطعہ در ہندی بہ طرز میر سوز سے

روٹھ کر میں جو اٹھ چلا گھر کو — ہو کے وہ بے قرار دوڑے آئے
لگ کے چھاتی سے یوں کہا رنگین — ہمیں ہے ہے کرے جو آگے جائے

میں خفا ہو کے جب اٹھا رنگین — جی میں کچھ سوچ کر وہ ہو کے کھڑے
گدگدی کر کے یوں لگے کہنے — ہمیں چھیڑے اگر تو ہنس نہ پڑے

قطعہ بہ طرز خود ریختی :-

مجھے دیکھا جو دروازے پہ رنگیں کہا یہ دیر سے یہاں کیوں کھڑا ہی
لڑانا ہی موا جس تس سے آنکھیں اسے بے طرح یہ لپکا پڑا ہی
بولی سُن سُن وہ شعر رنگیں کے نوج تجھ سے کسی کی لاگ لگے
جو چلے تیرے قتل کرتے ہیں اس تری گفتگو کو آگ لگے

ہشتم فردیات بہ طرزِ غنیؔ کشمیری و سعدیؔ و حافظ شیراز و ظہوریؔ و نظیریؔ و طرزِ خود —— طرزِ غنیؔ :-

کشت غیر را قاتل خوں من بجوش آمد آہ سرکشید از دل نالہ در خروش آمد

طرز ظہوریؔ :-

آتشِ عشق کہ درجانِ من است نور چشم دل سوزانِ من است

طرزِ نظیریؔ :-

آں بت بیگانہ دوست یار بہ چوں من کس است دم زدن در عشق او کار بہ چوں من کس است

بہ طرزِ سعدیؔ :-

در تلاش تو بسے گر دیدہ دیدہ چوں کشتیٔ طوفاں دیدہ
با غمش ای ہجر بہ سازیم ما غمزہ مکن کشتہ نازیم ما

طرزِ حافظ :-

برگزیدن از تو دوری مشکل است صبر در امر ضروری مشکل است

طرزِ صائب :-

کمال حسن را آخر زوال است گہے بدر است مہ گاہے ہلال است

طرزِ نور العین :-

غمزہ ہا بر سبر غا کم کردی زندہ کردی و ہلا کم کردی

طرزِ خود ہندی :-

یہاں تو سینے میں اس دل کے داغ جلتے ہیں — وہاں گھر اس کے ہیں گھی کے چراغ جلتے ہیں
دل دیا جب اور کو تب تم بھی دکھ پانے لگے — پھول سے نفرت تھی یا گل ہاتھ پر کھانے لگے[1]

طرزِ مصحفی :-

جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا — تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا
تو، جو کہتا ہے کہ گھر جائیں گے ہم — تیرا کیا جائے گا مر جائیں گے ہم

طرزِ میر :-

بہارِ گل رخاں پر اب جو رنگیں دھیان جاتا ہے — تو حسرت کیوں نہ آوے موسم اپنا یاد آتا ہے

طرزِ انشاء :-

کھول کے باغ میں نہ جا اپنے قبا کے بند کو — ٹکڑے نہ کر خدا سے ڈر غنچوں کے بند بند کو
دلا بن اس کے مجھ کو زیست سے تو تنگ لاوے گا — ابھی کیا ہے ابھی تو آگے آگے رنگ لاوے گا

نہم تاریخ کہ ہمہ استادان بہ انواع گفتہ اند و نوشتہ اند چند تاریخ بہ طرزِ خود نوشتہ می شود ازاں جملہ تاریخ سیندھیا مرہٹہ کہ از جے پور شکست خوردہ بود اتفاق کہ از یک پالنگ بود :-

لشکر سیندھیا چو شد برباد — از طفیل نبیؐ و فضلِ خدا
سال غارت بجستم از ہاتف — گفت تاریخ غارت بے پا

غارا ۱۲۰

تاریخ مسجد کہ حضرت برادر صاحب و قبلہ و کعبہ معتقد الدولہ نواب صوفی اللہ یار بیگ خاں شہامت جنگ رومی در شاہ جہاں آباد تعمیر کنانیدہ بودند

صوفی اللہ یار رومی — در ہمت و جود بے عدیل است
نامش سعادت است روشن — ذاتش بہ ہمہ صفت جمیل است

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵۵ حاشیہ نمبر ۱

تعمیر بہ حکم عالیش یافت — مسجد کہ مقدس و جلیل است
تاریخ بناش دوش رنگیں — فرمودہ کہ کعبۂ خلیل است

ـــــــ کعبۂ خلیل است ۱۲۲۸

تاریخ اور حبشی محمدی بیگم سے

مرگئی جب محمدی بیگم — کھا کے سرسام سے قضا کی تیغ
تو وہیں جان کا نکال کے جی — قابضِ روح نے کہا کہ دریغ

ـــــــ دریغ ۱۲۱۳[1]

دہم ترجیع بند از ہر شعر کہ شروع بند است یا زہموں شعر آخر بند است بہ طرز خود — بند اوّل سے

ای دل برد دل بر یگانہ — وے فتنہ و فتنہ زمانہ
در حیرتم ایں تراکم وبیش — با من سر الفت است یا نہ
چوں آہ کنم کہ آتشِ دل — از ہر سو ہو کشد زبانہ
افشا نہ شود حدیثِ الفت — روزانہ میا بیا شبانہ
ترسم کہ دگر نیایدش خواب — گر سر بہ کنم ز خود فسانہ
گردد دل جمع من پریشاں — تکلیف مدہ بہ زلف وشانہ
مپسند کہ نیک وبد بہ سازند — از تیر ملامتم نشانہ
در ہجر تو می طپد شب و روز — مرغ دل من در آشیانہ
چوں تو در دہر بے وفا است — انصاف اگر کند زمانہ

ای دل برد دل بر یگانہ
وی فتنہ و فتنۂ زمانہ

---

[1] دریغ کے ۱۲۱۴ ہوتے ہیں، لیکن اس میں تخرجہ ہے پہلے مصرع میں "جان" کا "جی" یعنی الف نکالنا ہے اس طرح ایک عدد کم ہو کر ۱۲۱۳ ہو جاتے ہیں۔

یازدہم ترکیب بند یعنی در آخر ہر بند شعر دیگر می آمدہ باشد چناں چہ بند اوّل ؎

روکش حسنت ارچہ حور بود | نیست ممکن کہ بے قصور بود
دیدہ از دیدنت نہ گردد سیر | گو تجلّی کوہ طور بود
شہرت تست گو بہ دہر و لے | عاشقتے ہم چو من ضرور بود
خاکساری بہ عاشق است ضرور | طبع معشوق گو غیور بود
بر جفا صبر کردن آساں است | گو بہ نزدیک عقل دور بود
تاب ہجر تو نادر د زنہار | مثل ایوب گو صبور بود
ہم چو رنگیںؔ بہ عشق ناداں است | مرد ہر چند ذی شعور بود
ہر کرا چشم دل بہ ماہ من است | داند احوالم او گواہ من است

دوازدہم مسدّس شش مصرعی بہ طور قطعہ بند بہ طرز خود در ہندی زبان۔

ایک دن سیر کو مَیں گھر سے جو نکلا ناگاہ | تو نظر پڑ گیا دل دار مجھے ایک دل خواہ
دیکھتے ہی اسے بس حال ہوا دل کا تباہ | مَیں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا بھر کر آہ
گرم ان روزوں میں کچھ عشق کا بازار نہیں
بیچتا دل کو ہوں میں کوئی خریدار نہیں
سن کے اس شعر کو یوں کہنے لگا وہ خوں خوار | کون ہے یہ اسے کیا زیست نہیں ہے درکار
سر جدا اس کا کروں مار کے مَیں ایک تروار | کہ کے یہ بات لگا تا کنے وہ آخر کار
میری گردن کی طرف اس کا جوں ہی دھیان بندھا
میں یہ سمجھا کہ مرے قتل کا سامان بندھا
ڈرتے ڈرتے یہ کہا مَیں نے اسے او پیارے | تجھ کو خوں خوار سمجھتے ہیں جہاں میں سارے
مَیں بھی کچھ مال ہوں تو مجھ پہ نہ غصہ کھا رے | آگے ہی مَیں تو مرا جاتا ہوں ڈر کے مارے

کھینچ تروار کو مت میرے ڈرانے کے لیے
انکھڑیاں بس ہیں تری آنکھ دکھانے کے لیے

ہجر کے غم نے کیا ہے مجھے ایسا فانی
کہ مری شکل نہیں جاتی ہے اب پہچانی
میری تصویر ہے منظور اگر کھنچوانی
تو مصور سے کھچا اس کو تو یوں ای جانی
طوق گردن میں ہو اور پاؤں میں زنجیر کھنچے
تیرے دیوانے کی یوں چاہیے تصویر کھنچے

شعلہ خو بس کہ مرے دل کو ترے دل سے ہی لاگ
تو یکایک ہی اٹھا رات کو میں نیند سے جاگ
یاد میں تیری لگا گانے جو دیپک کا راگ
یک بیک دل سے اٹھی میرے بھڑک عشق کی آگ
شمع ساں ہجر میں سارا سر و سامان جلا
اشک آنکھوں سے یہ گرم آئے کہ داماں جلا

آگیا شب میرے قابو میں جو وہ زہرہ جبیں
ہاتھا پائی کے لیے اس سے میں لپٹا وہیں
لات جو اس نے چلائی تو کہا میں نے نہیں
اس میں کچھ شک نہیں سچ ہے یہ بہ قول رنگیں
تجھ سے وہ لگ چلے کھانی ہو جسے لات کوئی
ہاتھ کس طرح لگا دے تجھے ہیہات کوئی

سیزدہم مخمس یعنی پنج مصرعی بہ طرز حضرت شیخ سعدی غزل خود فارسی ؎

صد ظلم ز حد افزوں کردی
سرگشتۂ دشت جنوں کردی
چوں بودم و اکنوں چوں کردی
ای عشق مرا مجنوں کردی
بر لالہ رخاں مفتوں کردی

سنجیدہ رخت پریشانی
پوشاندہ لباس حیرانی
بدریدہ جیب ہمہ دانی
دوزیدہ قبائے عریانی
بر قامت من موزوں کردی

بود است ہر ایک رنج و نہ غم　　چوں الفتِ خوباں شد ہمدم
در عین شدائد درد و الم　　از زلف بہ بستی دست دلم
پا بستہ بہ دام جنوں کردی

از جور و جفا ہا بیختیم　　با زلف دوتا آویختیم
در خاک بہ خوں آمیختیم　　از خنجرِ غم خوں ریختیم
گل گوں کردی ممنوں کردی

مارا ست تمنا سرو و نہ گل　　نی رغبتِ فاختہ و بلبل
نی ذوق کشیدن ساغرِ مُل　　جز خواہشِ وصلِ بتاں بالکل
از سینۂ من بیروں کردی

جنبا ندی رشتہ صد کیں را　　آزردی چوں من مسکیں را
اکنوں تو بہ گو آں بے دیں را　　ہر قطرۂ اشک رنگیں را
سیحوں کردی - جیحوں کردی

مخمس ہندی از غزل کلو حجام خاص تراش حضرت مولوی فخر الدین قدس سرہٗ
بود و حجام تخلص می کرد و ناخوانده ہیچ مداں در شاہ جہاں بود شعر خوب می
گفت مخمس غزل او بہ طرز شاہ غلامی شاہ ؎

مُنھ سے یہ سُنا ہی ہم نے سو بار تمھارے　　ہم یار کسی کے نہیں ہیں یار تمھارے
کیا جانے وہ کیا ہوئے اقرار تمھارے　　ہر دم نظر آتے ہیں نئے یار تمھارے
ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمھارے

فرصت اگر ایک دم کی بھی دے نزع میں گردوں　　اور جس کے کہ ہاتھوں سے یہ دل ہی میرا پُر خوں
وہ رو بہ رو آ جائے تو ای قادرِ بے چوں　　یہ جی میں تمنا ہی کہ ان آنکھوں سے پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے بیمار تمھارے

اپنے سر و ساماں کا گلہ مجھ سے عبث ہے　　اور عشق میں نقصاں کا گِلہ مجھ سے عبث ہے
اس درد کے درماں کا گلہ مجھ سے عبث ہے　　اس کاوشِ مژگاں کا گِلہ مجھ سے عبث ہے
ای آنکھوں یہ بوئے ہوئے ہیں خار تمھارے

کس طرح چڑھے کوئی یہاں نظروں میں اپنی　　آیا ہو صنم تجھ سا جہاں نظروں میں اپنی
بے نور یہ دونوں ہیں عیاں نظروں میں اپنی　　ٹھہریں مہ و خورشید کہاں نظروں میں اپنی
ہم نے تو یہاں دیکھے ہیں رخسار تمھارے

رنگیں جو وہاں رہتے ہیں اب صبح سے تا شام　　یا للہ سوا آپ کے کچھ ان کو نہیں کام
بد ہم کو نظر آتا ہے اس کام کا انجام　　اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجّام
ایک دن کہیں چھن جائیں گے ہتھیار تمھارے

چہاردہم مربع یعنی چہار مصراعی فارسی بہ طرزِ خود از غزل خود۔ کُل سات بند ہیں ؎

روز و شب یار ما نیامد　　گاہے بہ کنار ما نیامد
ای گُل بہ مزار ما نیامد　　ایں مرگ بہ کار ما نیامد

از خار گرفتہ تا خسے آہ　　جستیم سراغ شاں بسے آہ
رفتند بسے مگر کسے آہ　　از شہر و دیار ما نیامد

با عشق فتاد کار در اصل　　بہ گزشت تمام عمر در فصل
ہیہات کہ بے خلل شبِ وصل　　در لیل و نہار ما نیامد

ای بادِ صبا نہ بود دشوار　　چسپیدہ بہ سنگ وخشت و دیوا
می ماند بہ گوش ایں قدر کار　　از مشتِ غبار ما نیامد

پانزدہم مثلث سہ مصراعی از غزل نور العین واقف بہ طرز نور العین واقف فارسی۔ کُل سات بند ہیں :؎

ز اُستادِ غزل خوانِ محبّت　　بہ طفلی در دبستانِ محبت
گرفتم یاد قرآنِ محبت

بہ گلشن رو بہ روئے شاہدِ گل　　گلستاں بوستاں می خواند بلبل
کہ من بودم غزل خوانِ محبّت

ز کویت با دو صد بیداد رفتم　　طپیدم سوختم برباد رفتم
چہاں کردم بہ قربانِ محبّت

تمام احوال زارم را عیاں کرد　　نہاں از من دلش را مہرباں کرد
بہ بیں لطفِ نمایانِ محبّت

شانزدہم مستزاد بہ طرز خواجہ میر درد صاحب قدس سرہٗ وطورِ خود ـــ

رنگیں کوشش میں تو نے تقصیر نہ کی　　در عین شباب
وہ کام نہیں کہ جس کی تدبیر نہ کی　　کر دیکھ حساب
لیکن افسوس ہے کہ ناداں تو نے　　بے عقلی سے
کچھ خانۂ آخرت کی تعمیر نہ کی　　ای خانہ خراب

بجتے ہوئے جن کے آگے تاشے دیکھے　　رنگیں دن رات
نہلاتے ہوئے پھر ان کے لاشے دیکھے　　آخر ہیہات
اب چاہیے خلق آکے دیکھے ہم کو　　اور عبرت لے
ہم نے کیا کیا یہاں تماشے دیکھے　　کھو کر اوقات

نیکی سے ہاتھ ہم نے دھویا　　ہے یہ مشہور
اور تخمِ بدی کو کشتِ دل میں بویا　　ہو کر مغرور
جو عہد کر آئے تھے وہ ہم سے نہ نبھا　　میثاق کے دن
افسوس کہ زندگی کو یونہی کھویا　　اے ائے شعور

ہفدہم ملمع بہ طرز حضرت امیر خسرو قدس سرۂ کہ یک مصرع فارسی و دوم ہندی یعنی گنگا جمنی و قید تجنیس ؎

کسیرا بار یوں کہتا ہے میرا
کہ من اصلا نہ می خواہم کسیرا[1]

بہ باغ دہر می یابم کجا من
کہ کھاؤں جھولیاں بھر بھر کے جامن

ہمی گوید ز دل ہر خاص و ہر عام
کہ ہے گر ہند میں میوہ تو ہے آم

ہژدہم تضمین بہ طرز خود از اشعار مولوی روم و سعدی و مرزا رفیع سودا و انشاء اللہ خاں ؎

ایک کامل سے کیا میں نے سوال
مال کو چاہے ہے اپنا جی کمال

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاک گور

پس گر اے رنگیں قناعت ہی نہیں
تو تو دنیا میں فراغت ہی نہیں

شکر کر حق نے دیا ہے تجھ کو جو
صبر کر اور دل سے قانع اس پہ ہو

مثنوی میں وہ جو تھے باب علوم
کہہ گئے ہیں سو وہ مولانائے روم

شکر نعمت نعمت افزوں کند
کفر نعمت از کفت بیروں کند

آہ تو تو شکر کرتا ہی نہیں
موت کے صدمے سے ڈرتا ہی نہیں

شعر تجھ تک یہ نہیں پہنچا ہے کیا
سُن سمجھ کر مولوی کہتا ہے کیا

خواجہ پندارد کہ روزی او دہد
ایں نہ می داند کہ روزی دہ دہد

سچ ہے اس میں فرق کیا ہے دیکھ تو
مولوی صاحب نے فرمایا ہے جو

کاسۂ چشم حریصاں پُر نہ شد
تا صدف قانع نہ شد پُر دُر نہ شد

ختم کر اس مدعا پر لا کلام
مولوی نے یوں کہا ہے لا کلام[2]

چوں[3] از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت
چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

---

[1] کسیرا (کسے را) فارسی بمعنی کسی کو۔ اور کسیرا بمعنی برتن ساز جو دھاتیں ملا کر برتن ڈھالتا ہے۔ ٹھٹھیرا۔ [2] کہاں پاؤں میں [3] لاجواب [3] یہ شعر قلمی نسخے میں اسی طرح ہے ؛

تضمین مصرع سعدی :

سُن لے رنگیں بہ قول سعدی کہ — یہی کہتے گئے ہیں سب کہ وہ
یعنی جو شخص ہوئے رشوت خور — دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

تضمین شعر سعدی

خدا نے مال دیا ہو جو تجھ کو اے رنگیں — تو شعر سعدی کا سُن کر سمجھ لے اس کو ضرور
زکوٰۃِ مال بدر کن کہ فضلۂ رز را — چو باغ باں بہ بُرد بیش تر دہد انگور

تضمین در ہزل بہ طرز انوری ۔ واہیات شعر ہو ۔

تضمین مصرع سودا :

آ کر جو کوئی باغِ جہاں کی بہار میں — ایک دم بھی مثل بادِ صبا کے گزر کرے
رنگیں بہ قول حضرتِ سودا اخیر اس سے وہ — آخر بہ رنگِ گل ہو پریشاں سفر کرے

تضمین انشاء اللہ خاں

تیرے دل کی تو جانتا ہے خدا — لیک مَیں تو بہ قول میر انشاء
چاہتا ہوں تجھے نبی کی قسم — حضرتِ مرتضیٰ علی کی قسم
مَیں نے کہہ کر پانچ مثنویاں تمام — پنجۂ رنگیں رکھا ہے ان کا نام
پنجہ اس پنجے سے کر سکتا ہے کون — پنجہ اپنے خوں سے بھر سکتا ہے کون
مجھ کو ایک مضمونِ سعدی یاد ہے — ایک جگہ میں ان کا یوں ارشاد ہے
ہر کہ با پولاد و بازو پنجہ کرد — ساعد سیمیں خود را رنجہ کرد
پھر جو بیتوں کا کیا ان کے شمار — شعر دس دس سو گنے پر پانچ بار

نود دہم قطعہ بند بہ دستور معمول در مقدمہ برادر عزیز از جان الٰہی بخش خان معروف

کُل ۲۵ شعر ہیں ۔

کہا ایک مہرباں نے مجھ سے آکر — کہ تو الور کو جاتا ہے سُنا ہے
خدا کے واسطے ہم کو بتا دے — کہ وہاں جانے سے حاصل تجھ کو کیا ہے
برس دو بعد تو آیا ہے گھر میں — مہینہ بھر ہی دلّی میں رہا ہے
کہی ہے سرگزشت اپنی نہ تجھ سے — نہ تیرا دُکھ ہی کچھ ہم نے سُنا ہے
نہیں ہے تجھ کو کچھ ہم سے محبت — ہمیں اس بات کا تجھ سے گِلا ہے
نہیں چشمِ مروّت تجھ میں رنگیں — کہیں کیا ہم غرض تو بے وفا ہے
عجب موقع پہ یاد آیا ہے اس وقت — کسی اُستاد نے مطلع کہا ہے
ترا دل ہی اگر ہم سے پھرا ہے — تو بہتر ہے ہمارا بھی خدا ہے
کہا میں نے الٰہی بخش خاں وہاں — شفیق و اشفق ایک بھائی مرا ہے
غش اس پہ میں ہوں وہ مجھ پر ہے مفتوں — یہ میرا اور اس کا ماجرا ہے
کہ میں آہن تو مقناطیس ہے وہ — جو میں کاہ تو وہ کہربا ہے
اسے جی چاہتا ہے جا کے دیکھوں — برس دو ایک سے وہ مجھ سے جُدا ہے

آگے چل کر رنگین نے کہا ہے کہ الٰہی بخش کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے ایسے لوگ کم ہوتے ہیں ۔

بیستم واسوخت بہ طرز میر فیض ہم شیرہ زادہ میر تقی صاحب در ہندی شش مصراعی مشتمل بر دہ بند :۔

ای فلک حال سے ایک ذرا مرے ہو آگاہ — اس قدر دیکھ مرے درپئے ایذا مت رہ
روز و شب مجھ کو تو گردش میں رکھ بےرخ روبہ — پوچھتا تجھ سے ہوں میں تجھ کو قسم ہے سچ کہہ
ضد سے کیا ہے تجھے ای گردشِ افلاک حصول
مشتِ خاک اپنی سے کیا ہو گا تجھے خاک حصول

رات دن خواہشِ دیدار تھی جس کی مجھ کو   اس کا احوال کہوں تم سے مَیں کیا ای یارو
وہ جفا پیشہ عیادت کے لیے آیا جو   تو کہا اس نے نہ کچھ مجھ سے مگر اتنا تو
اس نے پوچھا کہ ترے درد کہاں رہتا ہی
دل پہ رکھ ہاتھ کہا مَیں نے کہ یہاں رہتا ہی

گرچہ آنکھوں نے کیا دیکھ کے تھا اس کو پسند   اور یہی پہلے ہوئیں دام میں تھیں زلف کے بند
لیک پہنچا ہی مجھے ہاتھ سے اس دل کے گزند   پوچھے جو مجھ سے کہوں اس سے بہ آوازِ بلند
چاہ کر دل نے اسے آہ یہ کیا کام کیا
آپ بدنام ہوا اور مجھے بدنام کیا

روز و شب غم تھا مجھے دل کے اس اندیشے سے   کہ یہ سر چیرے نہ فرہاد نمط تیشے سے
یا یہ مجنوں کی طرح شاد نہ ہو پیشے سے   ٹھان کر جی میں یہ اس اپنے جفا پیشے سے
جب کہا مَیں نے کہ دُکھ ہجر کا غم دیتا ہی
ہنس کے وہ کہنے لگا کیوں مجھے اُلٹا دم دیتا ہی

بارہا اس سے کہا مَیں نے کہ مَیں ہوں مفتوں   عقل اور ہوش نہیں میرے بجا ہوں مجنوں
وہ سمجھتا ہے مجھے مکار ہی مَیں حیراں ہوں   کچھ بن آتی ہی نہیں بات مَیں اب کس سے کہوں
راستی کو مری ہی ہی وہ کجی جانے ہی
بدگماں مجھ سے وہ ایسا ہی کہ جی جانے ہی

بست وکیم پہیلی ہائے بہ طرزِ ایجاد خود

پہیلی چشم : ؎

شیرازی ہیں کالے دو کبوتر   گاہے وہ خشک ہوں کبھو تر
یوں تو وہ فلک تلک ہیں جاتے   پر گھر سے نہیں نکلنے پاتے

بیست و دوم صنائع بدائع اقسام است ازاں جملہ بہ طرزِ سعدی غزل توشیح[1]

[1] فریب ملہ نام ایک صنعت شعری کا کہ ہر مصرع یا بیت کے حرف اوّل کے جمع کرنے سے کسی کا نام پیدا ہو۔

کہ اوّل لفظ شرخی بر زبان آوردہ باز مصراع بہ خوانند تاکہ موزوں شود و لفظ سیاہی ہم شروع از ہماں حرف است کہ نام بر می آید ے

مشہور پری زاد ہو تم　　واللہ کچھ ایجاد ہو تم
تمھیں حُسن خداداد ہے یہ　　یہ ہے عشق کی بنیاد ہو تم
بہت دُور ہو اپنے نزدیک　　یقیں ہے مجھے بے داد ہو تم
گو اور ہوں لاکھوں معشوق　　میں صید ہوں صیّاد ہو تم
سر ہر مصرع سے لوں رنگیں حرف　　نام پھر نکلے تو اُستاد ہو تم

غزل در صفت حروفِ مفرد یعنی ہر جا کہ حرف سُرخی مفرد بیاید اں را بر زبان راندہ یعنی حرف را اوّل گفتہ سیاہے را باید خواند تا مصرع موزوں شود و مقصد حاصل گردد ے

جب دکھا کر مجھ کو ظالم چھپ گیا نور، و رخ　　رہ گیا میں کاٹتا حسرت سے اپنے ل و ب
کب تری زال و ف کو پہنچے م و ش و ک　　تیرے ل و ب سے شرمندہ ہے ش و ک و ر

در صنعتِ تجنیس رباعی کہ چہار مصرعش در چہار زبان ترکی، فارسی، پشتو، ہندی بہ طرز امیر خسرو قدس سرہٗ بہ طریق صنائع نظم شدہ۔ رباعی ے

رنگیں قچن تینیس فرصت بار　　تا نخل قد دلبرت آر دگل دبار
ظُلم اَستا ندے پدے کور کی بار　　ذلت کیوں کھینچا ہے آسو سو بار

شعر حروف مفرد ے

اوف ارے دردِ دل ذرا رہ لے　　آہ آرام رات دن دے دے

شعر حروف بے نقط مفرد ے

درد دل دارم دوا در درد دہ　　ردّ درد دردرا در درد دہ

شعر سادہ بے نقط ے

کرو اس درد دل کو دُور آکر　　دوا لاؤ کرو مسرور آکر

[illegible]

شعر مرکب کہ بہ دو دو حرف نوشتہ می شود ؎

جو مرنے سے سچ مچ ہی غافل ہو تو ‌ تو ناقص ہو تو گرچہ کامل ہو تو

شعر کہ مرکب بہ سہ حرف

نہ ہو کیا سبب قصدِ مشقِ ستم ‌ بہت شخص ہیں قتل تیغ صنم

اگر ہو مست کا عالم میں سر پاؤں ‌ تو ویراں دہر میں ہوں گاؤں کے گاؤں

گر لگے سر سے رنگیں کے پائے یار ‌ تو ترا ہو نام رنگیں آشکار

نقرہ نثر در تجنیس بہ طرزِ نو

یار اور بار تجنیس ہو بار پھل کو کہتے ہیں

بیست وسوم شہر آشوب یعنی شکوۂ زمانہ و بیانِ اہلِ عالم خواہ در قصیدہ خواہ در مثنوی خواہ در غزل و مخمّس و مسدّس چناں چہ در مثنوی درکسبِ دہقاں گوید ؎

شوق ہو گر کھیتی کا دِل میں ‌ تو تو نہ پڑ تو اس مشکل میں

ہو دشوار اس کا بن آنا ‌ خونِ دل اس میں ہوگا کھانا

چاہیے پہلے بنجر توڑے ‌ بیل ہلوں میں سُتھرے جوڑے

بیست و چہارم ساقی نامہ کہ بسیار استادان گفتہ اند چناں چہ مخاطب بہ ساقیٔ کوثر گوید ؎

سُن اے ساقیٔ محفلِ عاشقاں ‌ سُن اے والیٔ محفلِ عاشقاں

سُن اے دردمندوں کے دل کی دوا ‌ سُن اے مُستمندوں[1] کے حاجت روا

چمن میں قیامت ہو جوشِ بہار ‌ گئے ہیں سب آپس میں مل مل کے یار

بہم کرتے پھرتے ہیں گلشن کی سیر ‌ ولیکن ستم مجھ پہ ہو تجھ بغیر

قیامت گلستاں میں ہو آج دھوم ‌ غضب ہر طرف خلق کا ہو ہجوم

---

[1] غمگین، حاجت مند

عجب جا بہ جا در میانِ چمن نرالی ہو ہر ایک کی انجمن

اس ساقی نامہ کے کل ۱۳ شعر ہیں۔

بیست و پنجم چار بیت[1] کہ افغان بچہ ہائے او باش رام پور و بریلی ایجاد کردہ اند دراں ضلع ہمیں وضع بسیار رواج دارد چناں چہ ؎

زندگی بھائی نہیں، بن ترے مجھ کو صنم موت کیوں آتی نہیں، ہو مرا ناک میں دم

تو نے تھا وعدہ کیا، یا کہ تھا دم ہی دبا صبح تک تڑپا کیا، میں ترے سر کی قسم

اتنی بیداد نہ کر، مجھ کو برباد نہ کر غیر کو شاد نہ کر، ہو مرے حق میں یہ ستم

بیست و ششم کبت[2] بہ دستور معمول اگرچہ مرا دریں فن مہارت کم است لیکن برائے طبع آزمائی گفتہ۔

بیست و ہفتم دوہرہ[3] ہا بہ دستور انصاف شرط است کہ کسے کہ ازیں فن آگاہ نہ باشد وایں قدر بہ گوید ؎

رنگیں آئے نہیں سکھی بھلے گئے پردیس نگر نگر اب ڈھونڈھیے کر جوگن کا بھیس

رنگیں سنتے آئے ہیں یہی جگت کی ریت چاہے جو کوئی آپ کو کیجے واسے پیت

لوگ کہت ہیں ہوت ہے دل کو دل سے راہ رنگیں ہم تو جل بجھے کہا نہ وس نے آہ

رنگیں مو کو جان جیک لاگا بھاری روگ یہ تو پہلے ہی پھل مانگے ہے جی بھوگ

ایں بیست و ہفت قسم را بہ افراط گفتہ ام تا کجا بہ نویسم موقوف بر دیدن کلیات است اگر کسے تکلیف کند۔

دوسری ترجیح یہ بھی ہے کہ اُستادانِ فارسی نے صرف پانچ بحروں میں مثنویات کہی ہیں۔ مولوی جامی نے البتہ سات بحروں میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن میں نے گیارہ بحروں میں ۴۶ مثنویات کہی ہیں جو تقریباً بیس ہزار شعر ہندی اور فارسی پر مشتمل ہیں۔ تصوف میں، ظرافت میں، معاد اور معاش

---

[1] چار بیتی صرف دو ہیں [2] کبت صرف دو ہیں [3] دوہرے گیارہ ہیں۔

میں اور علمِ مجلس اور خطوط نویسی، عشق و عاشقی و پند و نصیحت اور حکایات بہ طرزِ استادان اور اپنی ایجاد۔ چناں چہ چند شعر ہر مثنوی کی بحر کے معلوم کرنے کے لیے یہاں دینا ضروری ہیں۔

بحرِ اوّل ۔ قصّہ سوداگر بچّہ شہر گجرات و نکاح کردن با تیپو شاہ بادشاہ مندراج ہزار شعر دارد ؎

حمد لکھ سکتے نہیں لوح و قلم　　حمد مجھ سے ہو سکے کیوں کر رقم
گرچہ برسوں کوئی چھانے خاک کو　　کب رسائی ہو وہاں ادراک کو

بحر دوم بہ طرزِ خود قصّہ مہ جبین بادشاہ زادہ و نازنیں رانی سری نگر دو ہزار شعر دارد ؎

حمد کا ہو سکے ہے کس سے بیاں　　قاصر اس جا ہے انبیا کی زباں
کیوں کہ بے چوں و بے چگوں ہے وہ　　اور بے شبہ و بے نموں ہے وہ
عقل گو پَر لگا کے اُڑ جاوے　　کُنہہ کو اُس کی پر یہ کب پاوے

بحرِ سوم ۔ ' چہار چمن رنگین ' ، در حکایات گفتہ ام چہار چمن در چہار بحر است یک ہزار شعر دارد ؎

ای گلشنِ دو جہاں کے خالق　　وے والی اِنس و جاں کے رازق
خالق ہے تو، ہی کریم ہے تو　　رازق ہے تو، ہی رحیم، ہے تو
رحمان ہے تو، تو ہی ہے ستّار　　جبّار ہے تو، تو ہی ہے قہّار

بحرِ چہارم بہ طورِ حکایت کہ دو کس باہم دوست بودند و اتفاقاً از ہم جدا شدند ؎

کہیں تھا کسی پر کوئی مبتلا　　قرار اس کے جی کو کسی جا نہ تھا
نہ دیکھے تھا جب تک نہ پڑتی تھی کل　　نہ اس بن اسے چین تھا ایک پل

بحرِ پنجم ۔ مثنوی مثلثِ رنگین، یعنی سہ مثنوی در شش صد شعر نظم شدہ

حمد لکھوں اس اپنے خدا کی　　جس نے بنا کی ارض و سما کی
اس نے انجم کو ہی بنایا　　وہی ہر ایک شی میں ہی سمایا
اسی نے انساں کیا ہی تجھ کو　　دیکھ تو کیا کیا دیا ہی تجھ کو

بحرِ ششم ۔ بہ طرز حضرت مولوی روم حکایات در اخلاق گفتہ ام ازاں جملہ نوشتہ می شود ؎

ہی امیر ایک کثیر الانعام　　اس کا ہی فیض محمد خاں نام
مانتے اس کی ہیں سب سرداری　　رات دن فیض ہی اس کا جاری

بحرِ ہفتم حکایت پسر تاجر اصفہانی و دختر سوداگرِ بنارس کہ قصہ عجیب است نظم شدہ ؎

پسر تاجر کا تھا ایک اصفہاں میں　　نہ تھا ثانی کوئی اس کا جہاں میں
وہ حُسن اور مال سے ایسا تھا مشہور　　کہ جیسا دہر میں خورشید کا نور
جہاں میں شہرۂ آفاق تھا وہ　　فنِ سوداگری میں طاق تھا وہ

بحرِ ہشتم بیان حکایت شخصے کہ معاذ اللہ دعوئے نبوّت کردہ بود در ظرافت ؎

سخت وبال ایک نے سر پر لیا　　یعنی کہ دعوئے نبوّت کیا
وہ کہ جو اس ملک میں تھا بادشاہ　　اس نے کہا اس کو کہ ای بےحیا
ہم کو نبوّت کا تری پاس ہی　　معجزہ بھی کوئی تیرے پاس ہی

اس نے کہا کہ معجزہ ہی ۔ بادشاہ نے ایک قفل دیا اور کہا کہ اسے بغیر چابی کے کھول دے ۔ اس نے کہا کہ میں دعوائے پیغمبری کرتا ہوں تم مجھ سے آہن گری چاہتے ہو جن کی سمجھ ایسی ہو ان سے گفتگو کرنا فضول ہی ۔

بحر نہم حکایت ظرافت کہ ایک شخص نے کسی کی بکری ذبح کر کے کھالی تھی اس پر اس کے دوستوں نے اسے نصیحت کی ہے

شخص تھے ایک رند وضع ایک تھے مفلس کمال   کھا گئے وہ ایک کی بکری کو کر کر حلال
ان کے جو رنگین تھے یار آ کے انھوں نے کہا   سنتے ہو ای مہرباں تم کو یہ لازم نہ تھا
خوف قیامت کا کچھ رکھتے نہیں آہ تم   روزِ جزا سے کہو کیا نہیں آگاہ تم

اس نے جواب دیا کہ میں وہاں مُکر جاؤں گا۔ دوست نے کہا کہ وہاں بکری خود شہادت دے گی اور مالک بھی موجود ہوگا۔ اس آدمی نے کہا کہ میں جھٹ بکری کا کان پکڑ کر مالک کے حوالے کر کے کہوں گا کہ اپنی بکری لے اور جا خدا کے لیے مجھے نہ ستا۔

بحر دہم در ہزل کہ شخصے زنِ فاحشہ را نگاہ داشت و شہوت نہ شد زنِ لطیفہ گو بود جواب وسوال آں ہا۔

بحر یازدہم حکایت در تصوف بیان مرد ہندو کہ در قوم خود عابد و زاہد بود ہے

ہندو ایک موحد تھا   اپنی قوم میں عابد تھا
ہر ہر کہتا تھا وہ مدام   'ہر' تھا اس کا تکیہ کلام
مِل کر بد اور نیک سے وہ   کہتا تھا ہر ایک سے وہ
ہَر کو کوئی بتائے مجھے   ہَر کیسا ہے دکھائے مجھے

ترجیح سوم ایں کہ ہمہ اُستادان در چہار زبان شعر گفتہ اند یکے عربی دوم ترکی، سوم فارسی، چہارم ہندی امیر خسرو در شش ہفت زبان نظم فرمودہ اند بندہ یک دیوان در شانزدہ[1] زبان گفتہ اں را مجموعۂ رنگین، نام نہادہ ام مع قصیدہ و مثنوی و غزلیات و رباعیات و مسدس و مخمس بہ اتمام رسیدہ برائے امتحان یک یک دو دو شعر ہر زبان نوشتہ می شود۔

---

[1] لیکن یہاں رنگین نے سولہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) زبانِ عربی سے فقد سقانی البینُ کاساتِ العقاب
(رجب دی فرقت نے پیالی کر عقاب)
صادر دمعی سائلامثل السحاب
(اشک چل نکلے مرے مثل سحاب)

(۲) زبان ترکی مطلع سے

مستانہ نماز ای بُتِ طنّاز قیلورسین ‏ ‏ ‏ ‏ مسجد کا کیوب تنگری کا ہم ناز قیلورسین
(مستی سے نماز تو پڑھتا ہی) ‏ ‏ ‏ ‏ (مسجد میں خدا سے بھی ناز کرتا ہی)

(۳) زبان فارسی سے

چشم وا کردہ بہ سویش نہ گوید ‏ ‏ ‏ ‏ چوں مہ چاردہ رویش ، گرید
دوست را دشمن و دشمن را دوست ‏ ‏ ‏ ‏ آہ کج فہمی خویش نہ گرید
نیست غنچہ چو دہانش رنگین ‏ ‏ ‏ ‏ دہن غنچہ و بویش نہ گرید

(۴) پشتو سے

پہ ہر سڑے خدا چہ مہروان شے ‏ ‏ ‏ ‏ دَہ ہاغہٗ واڑہ مشکلوُ نہ آسان شے
(جس پر خدا کی مہربانی ہو) ‏ ‏ ‏ ‏ (اس کی سب مشکل آسان ہو)

(۵) ریختہ سے

چاہ کر دل نے اسے آہ یہ کیا کام کیا ‏ ‏ ‏ ‏ آپ بدنام ہوا اور مجھے بدنام کیا
کیا کہیں ہجر میں کس طرح سے ہم نے رنگین ‏ ‏ ‏ ‏ شام کو صبح کیا صبح کو پھر شام کیا

(۶) زبان مارواڑی
بند مخمس سے

مہن میں تہن میں راڑ کائیں ہو رہاں ‏ ‏ ‏ ‏ آؤ نہ اینٹھن براجو ٹھاکراں
(ہم میں تم میں کیا لڑائی ہو بھلا) ‏ ‏ ‏ ‏ (یہاں بیٹھو سردار)

چَن آتنے تہیں نے مہین جدہ دیکھ شان | دیکھ تا ہن ہوئے کب کھاطر نشان
(آرام آوے تجھیں مَیں جب دیکھوں) | (بغیر دیکھے ہو خاطر نشان)

چاہ باکی بھیڑ چھے ہو بے حساب
(ہجومِ الفت ہی نہایت)

(۷) زبان مرہٹی بند مخمس سے

ہی تمہن تے مرہٹوں جا پیشوا | وا داری اکڑے الا اکڑے الا
(ہی تو مرہٹوں کا سردار) | (ای شخص اِدھر آ اِدھر آ)
ہمچا تمچا ہوری شلیدار بوا | مونکا چادا داتی کارا انا
(ہم تیرے نوکر ہیں جی) | (ہم پر اتنا کیوں خفا ہی).

کائیں کرتس چانگلا ہی ای عتاب
(کیوں اتنا غصہ کرتا ہی)

(۸) پنجابی زبان سے

اپنی انکھیاں نو توسنوار دا ہی | میںنو سرمہ کھا کے مار دا ہی
دیکھ تینو اس تہ بھلائے نہیں | سانوں کیوں دل سے تو وسار دا ہی
(دیکھ تجھے ہم بھولتے نہیں) | (ہمیں تو دل سے کیوں بُھلاتا ہی)

نہم زبان پوربی بند مخمس سے

سیج سونی پیو بِن ہم کا نہ بھات | جیو جون بن نیر مچھری تر پہات
(سیج خالی معشوق بن ہمیں نہیں بھاتی) | (جس مانند بن پانی مچھلی تڑپتی ہی)
رَین کالی ڈراپنی ات ہی درات | کاہے تورے من میں ہیو کچھو نہ آت
(رات بجلی بہت ڈراتی ہی) | (کیوں تیرے دل میں رحم نہیں آتا)

اس مینے ہم کا کرت کاہے کھراب
(یوں ای شخص مجھے نہ کر خراب)

دہم زبان پنجابی ہائے گنوار پنجاب یعنی پچادہ ؎

ہیر بھیڑی ہوئی رانجھے نو جو چاہا آہو — بیر جندڑی دے لیے اپنے وساہا آہو

(ہیر دیوانی ہوئی جو رانجھا کو اس نے چاہا ہاں) — (دشمنی جان کی واسطے اپنے خریدی ہاں)

یازدہم زبان ہندی کشمیری نوآمد غزل ؎

ای ہندوستان کو خلقت مروت تجھ کو نہیں — خصوصاً اہلِ خطہ کو شفقت تجھ کو نہیں

آخرش درد دل اپنا تہ میاں کہنا چہیے — گرچہ معلوم ہی مہربان محبت تجھ کو نہیں

(۱۲) زبان ہندی انگریز نوآمد غزل ؎

کام کرتا نہیں شتاب آدم — سمجھا ہم ٹم براکھراب آدم

دیو چیرٹی براندی رنگیں کو — سُنو توکی وہ ہی نواب آدم

(۱۳) زبان افغان بچہ ہائے اوباش رام پور و مٹو و بریلی غزل

توُ جو غیروں کے پاس جاتا ہی — اوجی حضرت کیوں جلاتا ہی

زواں رنگیں جو ہی میرا تربور — ہر گھڑی اس کو کیوں ستاتا ہی

(۱۴) زبان اردوئے بیگمات شاہ جہاں آباد ریختی یعنی ایجاد بندہ غزل ؎

تانس کر باجی نے جب میری ٹرھائی پشواز — میں نے تب بُر سے وہ ٹکڑے اڑائی پشواز

(غصہ کر کے یعنی باجی نے جو میری اتروائی پشواز) (میں نے بھی ضد — پھاڑ ڈالی وہ پشواز)

رشک سے منہ پہ بسنتی کے گیے پھول بسنت — میں نے رنگیں سے بسنتی جو رنگائی پشواز

(۱۵) زبان بھاکا کبت ؎

جو تھیں میں جب چلی جمنا جل کو تو تھیں رنگیں نے آموری بانہہ گہی

اوجی ساس نند موہے ٹوکو ہٹو موے جا کہن تھے لوگ نگر کے سبھی

میں تو لاج کے مارے نہ بول سکی مورے من کی بنتا من ہی مو رہی

کچھو اور کہے ہی کوئی نہ رے موہے جھاڑ نہ دو اتنی تو کہی

۱؎ کی ۲؎ تو ۳؎ شراب ۴؎ قلی، مزدور ۵؎ بڑا آدمی ۶؎ نام کنیز
۷؎ کبت: ہندی یا سنسکرت کی نظم، قطعہ، رباعی۔

(۱۶) زبان برج دوہرہ

رنگین رجھوں نہ یا ہو رے دیکھ سکھی مورے بھاگ
چھا گئے یوں سلکتے مو ہے جوں بنجارے آگ

اس کلام کے بعد رنگین نے کہا کہ مجھے ان وجوہ کی بنا پر تمام شعراء پر ترجیح ہے یا نہیں، تمام نے اس بات کو تسلیم کیا پھر اہلِ محفل نے پوچھا کہ کتنی تصانیف ہیں تو رنگین نے جواب دیا بیست و پنج جن کو چار جلدوں میں منقسم کیا ہے۔

جلد اوّل کا نام "نورتن" ہے اس میں نو تصانیف ہیں۔
جلد دوم "شش جہت رنگین" یعنی "مسدسِ رنگین" اس میں چھ مثنویاں ہیں اور چھ ہزار شعر
جلد سوم "پنجۂ رنگین" یعنی "مخمسِ رنگین" اس میں پانچ مثنویاں ہیں اور پانچ ہزار شعر۔
جلد چہارم "خمسۂ رنگین" اس میں بھی پانچ مثنویاں ہیں۔

اگرچہ رنگین کے اس مفصل بیان سے کہیں کہیں شاعرانہ فخر کی بو آتی ہے اور انھوں نے اپنا مقابلہ بعض ایسے شاعروں سے کیا ہے جو اپنے فن میں یقیناً رنگین پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی رنگین کا یہ دعویٰ درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف طرزوں کی ایجاد، قادر الکلامی اور کلام کی مقدار کے اعتبار سے اُردو یا فارسی کا شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ہو جو ان کی ہم سری کر سکتا ہو۔ "امتحانِ رنگین" سے ہمیں ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رنگین نے اُردو اور فارسی کے مسلّم الثبوت اساتذہ کا کلام پڑھا اور سخن فہمی اور سخن شناسی بھی ان کے حصے میں آئی تھی۔ انھوں نے اُردو شاعروں کے جو مرتبے متعین کیے ہیں وہ بھی درست ہیں اور اساتذہ کے انفرادی اسالیب کا جو تجزیہ کیا ہے وہ بھی صحیح ہے۔

قوّت الایمان

'قوّت الایمان' دو سو اشعار کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں احکامِ شریعت بیان کیے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد تمہیدِ کتاب میں لکھتے ہیں کہ میں نے مختلف کتابوں سے یہ مسائل جمع کیے ہیں اور مسلمان کی حیثیت سے ہر شخص پر ان مطالب کا جاننا فرض ہے۔ ان میں خدا، فرشتے، خدا کے نام، قیامت، پیغمبر، محمدؐ، شرع محمدیہ، انبیاء، اولیا، صالحین وغیرہ کا ذکر ہے۔ پھر نماز، اور حلال و حرام کی بحث ہے۔ نظم کا نمونہ یہ ہے :-

ہے وہ خدا کیسا کہ ہے مہرباں — بخشنے والا ہے وہ سب کا عیاں
جو کہ حقیقت ہے ہر اک چیز کی — بس وہی ثابت ہے نہیں دوسری
وہم و خیال اوس کو نہ تو جانیو — جو تجھے کہتا ہوں اسے مانیو
ہے جو یہ پیدائشِ دنیا نئی — بدلے گی یہ صورتیں اپنی کئی
اس کا جو خالق ہے وہ خلّاق ہے — سارے عالم کا وہی رزّاق ہے
حکم سے پھر اوس کے یہ مٹ جائے گی — جتنی یہ ہستی ہے فنا پائے گی

نیک وہ ہے شرع میں جو ہے درست — جو کہ نہیں اوس میں او سے جان سست
عقل کو دخل اس میں نہ کچھ دیجیو — حکم ہے جس بات کا وہ کیجیو
اوس کے فرشتے ہیں بہت بے شمار — کرتا ہے ان میں سے ہر اک ایک کار

فرق وہ لاتے نہیں اوسان میں | رہتے ہیں دن رات وہ فرمان میں
ان میں ہر ایک کا ہی ہر ایک جا مقام | حکم بجا لاتے ہیں وہاں صبح وشام
ان کو جو منظور ہی افگندگی | قوت انھوں کا ہی فقط بندگی

چاہیے رکھنا یہ ضرور اعتقاد | کام کی یہ بات ہی رکھنا تو یاد
کافروں کو قبر کا ہوگا عذاب | کام وہاں ہوئے گا اون کا خراب
مخلصی اوس دُکھ سے نہ پائیں گے وہ | حشر کو دوزخ میں سماویں گے وہ
اور مسلماں ہی گنہ گار جو | قبر کا دُکھ چاہیے اوس کو بھی ہو
مخلصی پھر جلد وہ پاجائے گا | حشر کو جنت میں چلا جائے گا

پہلا خلیفہ تھا ابو بکرؓ جان | دوسرا بے شک تھا عمرؓ اوس کو مان
تیسرا عثمانؓ تھا چوتھا علیؓ | ایک سے تھی ایک کی خصلت بھلی
تیس برس بعد پیمبر کے یار | طور خلافت کا رہا برقرار
بعد جو کچھ کچھ خلل آنے لگا | بند بندھا جو تھا وہ جانے لگا
اور پیمبر کے جو یار تھے | بے شک اس امت کے وہ سردار تھے
نیکی سے یاد ان کو کیا چاہیے | دوستی میں ان کی جیا چاہیے
جس نے احادیث کے قرآن کے | معنی نکالے ہوں بہت چھان کے

مُردوں کو جتنی کریں زندے دُعا | دیتا ہی پہنچا انھیں ان تک خدا
نقد دیا کپڑا دیا دیں طعام | ان کو پہنچتا ہی وہ سب لاکلام
پڑھنی ہر ایک شخص کے پیچھے نماز | شرع میں جائز ہی یہ بندہ نواز
صالح و طالح ہو وہ جو ہو سو ہو | ہوئے نماز اون کی درست انکو
موزے کا ہی مسح سفر میں درست | اور ہی بے شبہ حضر میں درست
شرع نے جس شی کو کیا ہی حرام | اس کا بُرا جاننا ہی خوب کام

اور وہ جس شو کو کہا ہو حلال — کفر ہو بس بد اسے کرنا خیال
شرع کی جو کوئی اہانت کرے — کافر اسے حکم شریعت کرے
یا ہنسے اس کے کسی احکام پر — شوق سے کر لعن تو اس نام پر
لیک وہ جو شخص کہ دیوانہ ہو — یعنی کہ جو عقل سے بیگانہ ہو
گر کرے بے ہوشی میں وہ کچھ کلام — تو اسے کافر نہ کہہ ای نیک نام

آخر میں مثنوی کی تاریخ "غرائب ہو یہ" سے ۱۲۴۳ھ نکالی ہو ؎

بولا وہ تصنیف عجائب ہو یہ — کہہ تو، یہ تاریخ "غرائب ہو یہ"

"قصیدہ غوثیہ"

انڈیا آفس کی جس جلد میں "قوت الایمان" ہو اس میں تین اور مختصر رسالے بھی شامل ہیں ان میں سب سے پہلے مشہور "قصیدہ غوثیہ" کا اُردو ترجمہ ہو جو ۱۲۵۰ھ میں اپنے بیٹے اختر یار خاں کی فرمایش پر باندہ میں نظم کیا۔

اشعار کی کُل تعداد ایک سو دس ہو اور انڈیا آفس کا نسخہ سن تصنیف کے ساتھ بارہ سو پچاس میں ہی لکھا گیا ہو۔ ترجمہ نہایت رواں اور سلیس ہو۔ نمونہ یہ ہو ——— شروع کے چھ اشعار ؎

پلایا مجھ کو جس دم بادۂ وصل — رہا مجھ میں اور اس میں پھر نہ کچھ فصل
پھر آخر ہو کے مَیں مشتاق بولا — کہ اے مے جلد تو میری طرف آ
پیالوں میں وہ بھر بھر شادماں ہو — چلی آئی مری جانب رواں ہو

نشے میں ولولہ یہ مجھ کو آیا | کہ پی کر میں نے اوروں کو چکھایا
کہی پھر میں نے سب قطبوں سے یہ بات | کہ تم اس طرح کاٹو اپنے اوقات
مرے حلقے میں داخل ہو سب آکر | ہر ایک مسرور ہر لذت اُٹھا کر

آخری چھ اشعار ؎

ہوا پیدا مرا جیلاں میں ہے جسم | محی الدین ہے جیلانی مرا اِسم
علم اور جو نشاں میرے ہیں یکسر | پہاڑوں کی وہ چوٹی سے ہیں برتر
حسن دادا ہے میرا نیک فرجام | ہے مخدع[1] میرے اس رتبے کا بس نام
جہاں تک مرد مردانی بہم ہیں | انھوں کی پشت پر میرے قدم ہیں
اور عبدالقادر اب مشہور ہوں میں | مرا جد نور کا تھا نور ہوں میں
مرا جد مالاب کوثر یقیں ہے | شک اُس کی مالکی میں کچھ نہیں ہے

بانت سعاد

قصیدۂ غوثیہ کے بعد مشہور عربی قصیدے 'بانت سعاد' کا منظوم ترجمہ ہے جو ایک سو ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ بھی نہایت رواں ہے اور اُردو میں مضمون کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس قصیدے کو کہ اس سے عربی شاعری کے اندازِ کلام کو اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُردو نظم کی تاریخ میں ایک اہم درجہ حاصل ہے اس لیے اسے پورا نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ رنگین نے عربی کے ایک مصرع کا ترجمہ ایک شعر میں کیا ہے ؎

وہ معشوقہ بچھڑی جو مجھ سے سعاد | تو اس واسطے دل نہیں میرا شاد
زبس اس کی آنکھوں میں تصویر ہے | مجھے رات دن اس کی تدبیر ہے
کروں خوبیاں اس کی کیا میں بیاں | کہ اس کی حیا سے ہیں وہ سب عیاں

---

[1] مخدع: تجربہ کار، بڑے گھر میں ایک چھوٹا سا گھر، مراد پوشیدہ مرتبہ۔

وہ آنکھیں جھکائے ہوئے سوچ سے — کیا کرتی تقریر ہے لوچ سے

لچکتی کمر اس کی آتے ہیں ہے — سریں اس کے پرکار جاتے ہیں ہیں

نہ لمبی نہ چھوٹی میانہ ہے قد — سراسر پسندِ زمانہ ہے قد

دکھاتی ہے دانتوں کی اپنے بہار — پر اک ناز سے مسکرا بار بار

وہ مو بیں ہیں گویا بھگوئے ہوئے — گہر کے ہیں وہ اب کھوئے ہوئے

گھڑے ہیں بھرے یا وہ پانی سے پُر — پڑے گہری ندّی سے مانند دُر

وہ صاف ایسے ہیں مَیل سے بے قصور — کرے جوں ہوا خس کو پانی سے دُور

ہوا دُور کرتی ہے خاشاک کو — گھٹاتی ہے پانی کے امساک کو

کہ جوں مینہ برسنے سے ہو پاک خاک — کیا تہ بہ تہ یوں زمیں کو ہے پاک

وہ کیا پیاری معشوق ہے نیک خو — پر افسوس ہے وہ نہیں راست گو

وہ وعدے کو اپنے نہیں مانتی — مجھے اپنا عاشق نہیں جانتی

وہ ہے وہ کہ جو اس کی خلقت میں ہے — سو دائم وہی اس کی نیّت میں ہے

ادا، ناز غمزے سے عاشق کو مار — سدا بولتی جھوٹ ہے بے شمار

اسی وضع پر اپنی دائم ہے وہ — جس انداز پر ہے سو قائم ہے وہ

بدلتا ہے جوں روپ کو اپنے دیو — اسی طور وہ کرتی رہتی ہے ریو

وہ کرتی ہے جو کچھ کہ قول و قرار — بجا اس کو لاتی نہیں زینہار

ٹھہرتی ہے اقرار پر اس قدر — کہ چھلنی میں پانی رہے جس قدر

بہت آرزومند اس کا نہ ہو — غلط جان اسے اس کا وعدہ جو ہو

کہ یہ آرزوئیں ہیں بے اختیار — خیالات ہیں دل میں گو بے شمار

ہیں عرقوب[۱] کے اس کے وعدے تمام — نکلنے کا ان سے نہیں تیرا کام

سبب یہ کہ وعدے ہیں وہ سب دروغ — نہیں اس کے وعدوں کو مطلق فروغ

---

۱ مکر، حیلہ۔ عرقوب عرب میں ایک جھوٹا شخص تھا۔

یہ ہے آرزو میری اللہ سے
کہ باز آؤں اس کی نہ میں چاہ سے

نہیں اس کی بخشش کا مجھ کو خیال
کہ ہر چیز کو آخرش ہے زوال

سکونت وہاں کی ہے اب اس لیے جا
نہ پہنچے جہاں وہم بھی مطلقا

مگر اونٹ وہ جن پہ جب ہوں سوار
تو چلنے میں ہوں وہ شتر بے مہار

ہیں اس کے فقط ناقے ایسے یقیں
تو پہنچا کے دکھلادیں وہ سرزمیں

تھکے پر بھی ہے ان کو یہ دسترس
کہ چڑھ جاتی ہیں اونچے ٹیلوں پہ بس

غذا ان کی وہ ہے جیسے کھانے سے
پسینا ہو کانوں میں دوڑانے سے

بیابان ایسے وہ کرتی ہیں طے
پتہ اور نشاں جن کا مسدود ہے

یہ ہے دُور بینی انھوں کی عیاں
نہ دیکھے کوئی وہاں وہ دیکھیں جہاں

جہاں دشت کی گرم ہوئے زمیں
نہ وہ ریت میں بھولیں رستہ کہیں

بھرا گوشت ہے ان کا گردن کے ساتھ
نہایت ہی بھاری ہیں پاؤں اور ہاتھ

یہ سب خوبیاں ان کی خلقت میں ہیں
بھرے وصف سارے یہ عادت میں ہیں

بھرے ان کے رخسار ہیں بالیقیں
کہ نر کو تشابہ کچھ ان سے نہیں

نہایت دھڑ ان کا ہے اگلا بلند
کہ ہے پسلیوں میں فراخی دوچند

ہے ایسی ہی جلد ان کی سخت اور درشت
زبردست ہو جیسے کچھوے کی پشت

اگرچہ کہ ڈبلی ہو چھچڑی خذف
نہیں اس میں گھس سکتی دونوں طرف

ہے ان میں ہر اک ایسا مانند باد
کہ باپ اس کا بھائی ہے گوہر نژاد

چچا اس کا ماموں ہے بندہ نواز
سبک رو ہے وہ ایسا گردن دراز

چلے اس پہ چھری اگر بر محل
تو چکنائی سے اس کی جائے پھسل

وہ ناقہ ہے سینہ فراخ اور گرم
تہی گاہ اس کی پھسلواں ہے نرم

وہ ناقہ نہیں گورخر ہے ڈھلا
مٹاپے سے ہے گوشت ہر سو ٹھسا

وہ اس کے جو ہاتھوں کی ہیں کہنیاں
رلی اس کی ہیں پسلیوں سے عیاں
غرض اس کی آنکھوں سے تا ذیح گلہ
اگر جا مبصّر کی پہنچے نگاہ
تو بس ناک کے سُر سے لے تا زنخ
نظر آئے پتھر سا یا بستہ یخ
ہلاتی ہے یوں دم کو وہ بار بار
چُہارے کی ٹہنی ہو جوں بار دار
ہلاتی ہے بس اون نھنوں پر وہ یوں
کمی دودھ سے جو کہ کرتے نہ ہوں
مبصر نے کانوں میں دیکھ اونچی ناک
کہا یوں بڑی دیر تک تاک تاک
کہ اوصاف سب یہ اصالت کے ہیں
جو رخسار ترم اس نہایت کے ہیں
کچھ ایسا وہ چلتا ہے انداز سے
سبک چال اٹکھیلی اور ناز سے
مثک گو وہ نازک ہے پر ہے یہ حال
چلے بوجھ بِن اُونٹ جس طرح چال
گہوں کی ہیں رنگت کی سب اس کی گرگ
وہ ہے سنگ ریزوں کو کرتا الگ
نہیں باقی رکھتا ہے ٹیلوں پہ جا
اکھٹا کہیں ڈھیر وہ ریت کا
ہے اب تیز چلنے سے اس کا یہ حال
کہ آتا ہے اس کو پسینا کمال
وہ گر کوہ پر پھر چکتے ہیں یوں
نظر دُور سے بس سراب آئے جوں
حرارت سے اوس روز کی لا کلام
غرض جل کے ہوتا ہے گرگٹ تمام
اسے نلقے کی دھوپ سے کیا بھلی
مگر دونوں جانب تھیں بغلیں جلی
گیا وہ ٹھہر ایک جاگہ پہ جوں
کہا اونٹ والے نے لوگوں سے یوں
کرو ذرا قیلولہ اس جائے پر
ملخ مارے آ سنگ ریزوں پہ پر
پھراتی بیاں ہیں ہے جوں بیوہ ہاتھ
کرے ہے فغاں آہ و نالے کے ساتھ
پسر مردہ بڑھیاں ہیں پھسلاتیاں
سر اور زانو اور پیٹ کر چھاتیاں
یونھیں ساری رہتی ہیں نوحہ کناں
ایدھر اور اودھر دو طرف سے عیاں
کسی نے یہ پہنچائی عقلی خبر
کہ پہلوٹھی لڑکا گیا تیرا مر

کیا اس نے پیراہن اپنے کو چاک
لگی نوچنے ڈال کر سر پہ خاک
کیا جیب کو چاک ہر چاک پر
دیا پھینک ٹکڑے اوڑا خاک پر
سخن چیں وہاں دور یا یک دگر
یہ کہتے تھے دو سمت سے آن کر
کہ ای بیٹی سلمٰی کی تو بے قصور
یعنی جان رکھ قتل ہوگا ضرور
کہا پھر ہر اک دوست نے یہ پکار
کہ تیری مدد کا ہوں امید وار
کروں گا تری دوستی ترک یار
نہیں باز آنے کا پر زینہار
کہا میں نے چھوڑ دری راہ سب
کہ جاتا ہوں میں پاس حضرت کے اب
تم اس واسطے مجھ سے ہو جاؤ دور
مقدر ہی جو سو ہی ہونا ضرور
جس عورت نے جس وقت بچہ جنا
رہے گا کہاں تک وہ جیتا بنا
پھر اک دن جنازے کے بے اختیار
وہ کب دار گھوڑے پہ ہوگا سوار
مجھے یہ خبر ہی مرے قتل کا
پیمبر نے ہی حکم سب کو دیا
ہوا مجھ سے حال آں کہ ہی جو قصور
رسولِ خدا بخش دے گا ضرور
سو آیا نبیؐ کی ہوں خدمت میں یہاں
پشیمان و نالان و منت کناں
یقیں ہی پشیمانی میری رسولؐ
بلا شک مقرر کرے گا قبول
اماں جان کی مجھ کو تو دے شہا
خدا نے کیا ہی وہ تجھ کو عطا
کلام اپنا جس سے حلال و حرام
یہ تفصیل سمجھے ہیں سب لاکلام
نہ لے مجھ سے بدلا کہ ہوگا غضب
سخن چیں و بدگو کے کہنے سے اب
ہوا مجھ سے ہرگز نہیں وہ گناہ
جو تو نے سُنا ای رسولِ خدا
میں اس وقت ایسی جگہ ہوں کھڑا
کہ ٹھہرے نہ اس جا پہ ہاتھی بڑا
جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہوں اب
سُنے دیکھے گر اس کو ہاتھی وہ سب
تو وہ بھی بہت کانپے اور تھرتھرائے
مگر کچھ شفاعت پیمبر کی پائے

به حکم خدا جان بخشی کرے | وہ اس تھرتھراہٹ کو یک سو دھرے
دیا مَیں نے بیعت کا حضرت کو ہاتھ | کہ لاؤں بجا حکم ارشاد ساتھ
کروں کچھ نہ تکرار ارشاد پر | کہ سچّا ہی وہ کینہ کش داد گر
اور اس منتقم کی ہی ہیبت بڑی | کہ فرمائے یوں مجھ کو وہ جس گھڑی
کہی تھی مری ہجو کیوں کہ شتاب | بتا حشر میں کیا تو دے گا جواب
وہ ایسا ڈراتا بیابان ہی | درندوں کا جس جا پہ طوفان ہی
عُشَر[1] کے بھی جنگل سے تھے وہ فزوں | جہاں کے ہیں جنگل وہاں سرنگوں
کھلاتا ہی لحم اپنے بچّوں کو شیر | وہ کھا کر اسے خوب ہوتے ہیں سیر
وہ ہی گوشت سب قوم کفّار کا | جنھیں قتل ہی اہلِ دیں نے کیا
کرے شیر پر شیر حملہ کہیں | تو دے چھوڑ اوسے یہ مناسب نہیں
مگر زخم کھا کر جو بیچارہ ہو | نہ چھیڑے اوسے جب وہ ناکارہ ہو
ہوائیں ہیں جتنے چرند اور پرند | پہنچتا ہی سایے کو اون کے گزند
وہ درندہ ہی شیر ایسا مہیب | کہ جاتے نہیں مرد اس کے قریب
مدام اوس کے جنگل میں بے اختیار | کبھی جا نہیں سکتے مردانِ کار
مگر جان و جامہ چھنائے ہوئے | اوسی شیر کے ہیں وہ کھائے ہوئے
وہ بے شک رسولِ خدا کا ہی نور | کہ دونوں جہاں میں ہی جس کا ظہور
حقیقت میں حق کی یہ تردار ہی | کہ جس کی اوپر باڑھ اور دھار ہی
گروہ نضر بن[2] کنانہ میں تھا | پیمبر انھوں نے یہ اوس سے کہا
وہ اسلام جو اوس پہ لائے تھے سب | کہ ہجرت کرو تم مدینے سے اب
گئے سب مدینے مہاجر وہ ہو | مگر وہ ضعیف اور بے سر تھے جو

---

[1] عُشَر ایک قسم کا پودا جو بد بو دار اور تلخ ہوتا ہی [2] نضر بن کنانہ کنیت ابو النضر تھی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "رحمۃ للعالمین"، جلد دوم صفحہ ۵۶ مصنفہ قاضی سلیمان منصور پوری

نہ پہنچے لڑائی میں وہ اس سبب — کہ تھے بے سلاح اور بے نیزہ سب
بہادر وہ ہیں جن کی اونچی ہی ناک — نہیں ہی لڑائی سے کچھ ان کو باک
زرہ جن کے ہی بر میں داؤد کی — وہ طاعت میں ہیں اپنے معبود کی
سفید اور چمکتی ہیں وہ لاکلام — اور اس کی ہیں گنجان کڑیاں تمام
یہ تمثیل لازم ہی دوں اس کو میں — وہ گویا تفعاء[1] گھانس کے پتے ہیں
کہاں فتح پر غرّہ ہوتے ہیں وہ — عدو کو سُنا نیں جھپٹتے ہیں وہ
نہیں کرتے فریاد ہو کر نزار — عدو جب کہ کرتے ہیں تیروں کی مار
لڑائی میں جاتے ہیں وہ اس طرح — سفید اونٹ بوڑھا نہ ہو جس طرح
ہزیمت ہی جب ہوتی کفّار کو — وہ تب تھام لیتے ہیں تروار کو
نہیں ہی صحابہ کے تیروں کی مار — بہ جز سینۂ کافراں زینہار
کہ ان کو کبھی موت کے حوض سے — نہ سیرابی ہوگی ذرا خوض سے

اس عربی قصیدے کے ترجمے کے آخر میں سوداؔ کے مشہور قصیدہ ع

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک

پر رنگینؔ نے شمشیر خاں کی فرمایش پر ایک جلسے میں جو بدیہی اصلاحات کی تھیں، نقل کی گئی ہیں یہ اصلاحات بالکل سرسری ہیں اور ان میں صرف جزوی طور پر کہیں کہیں سوداؔ کے بعض اشعار میں لفظی ترمیم کی گئی ہی جس سے شعر کے مضمون یا بیان میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا ہی اس لیے اسے نقل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

---

[1] تفعاء: ایک قسم کی گھانس ہی جس میں انگوٹھی کی مانند حلقے ہوتے ہیں۔ شاعر نے "عا" کو وزن میں شمار نہیں کیا۔

فرس نامہ

شہ سواری اور گھوڑے پالنے کا تعلق شعر و ادب سے نہ سہی لیکن ہماری تہذیب و معاشرت میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ دورِ جدید سے پہلے جو سواریاں شرفاء اور امراء استعمال کرتے تھے ان میں ہاتھی اور گھوڑے قابلِ ذکر ہیں ان کا پالنا نہ صرف نشانِ امارت تھا بلکہ ان کی شناخت اور قدر دانی کو لازمۂ امارت و شرافت سمجھا جاتا تھا۔ 'اخبار رنگین' اور 'مجالسِ رنگین' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے بلکہ شہ سواری میں وہ اپنے معاصرین میں بڑا ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ چناں چہ اس واقعے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"[1] لکھنؤ سے جو صاحب عالم شہزادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر جو شکار کھیلنے کو نکلے تو جریدہ دس پانچ سواروں سے خیر آباد میں جا نکلے وہاں کے لوگ جو اکثر اسباب تحفہ بھیجنے کا لائے تو حضور میں اس وقت کچھ ساتھ نہ تھا۔ لوگوں نے عرض کی کہ لکھنؤ یہاں سے دو اوپر تئیس کوس ہے۔ کوئی ایسا شخص جاوے کہ جتنے روپے ارشاد ہوں تین چار دن میں لے آوے حضور سے ارشاد ہوا کہ سعادت یار خاں رنگین کا یہ کام ہے چناں چہ اسی وقت پہر دن رہے یہ فرما کر رخصت کیا کہ جلد جا کر ہزار روپے لاؤ وہ حضور سے رخصت

---

[1] 'اخبار رنگین' خبر نمبر ۱۲

ہو کر دوسرے دن بعد دوپہر ایک ہی گھوڑے پر لکھنؤ سے یعنی آٹھ پہر میں
ہزار روپے کمر میں باندھ کر لائے اور گھوڑا اصلا ماندگی نہ لایا اس سہولیت سے
لے گئے اور لے آئے ہے

کام جلدی کا ہی ای رنگیں زبوں کر گئے ہیں پند یہ سب رہنموں'

لیکن اس فن میں رنگین کے کمال کا اندازہ ایک ہزار اشعار پر
مشتمل ان کی مشہور نظم 'فرس نامہ' سے ہوتا ہی۔ کتاب کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

مجھے کہنی تھی جو جو بات منظور کہا اس اس کو میں نے ہو کے مسرور
کہا پھر مختصر اس کو بہ شدت کہ تا ہو لکھنے پڑھنے میں نہ دقت
جو دیکھے غور سے تو اے خردمند تو دریا کو کیا کوزے میں ہی بند
وہ نسخے تھے جو میرے آزمائے سو میں نے تجھ کو وہ سب کہ سنائے
کیا ہی بیس دن میں کہ کے مرقوم رہے تعداد اس کی تجھ کو معلوم
ہزار اس کے ہیں پورے شعر بھائی تجھے گنتی بھی میں نے کہ سنائی

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ رنگین نے اس کتاب کو بڑے اختصار سے
لکھا ہی اور گھوڑوں کے علاج بیماری کے سلسلے میں وہی نسخے نقل
کیے ہیں جو ان کے مجرب اور آزمودہ ہیں ضمنی طور پر اس نظم سے بھی
رنگین کی قادر الکلامی اور زود نویسی کا اندازہ ہوتا ہی کہ بیس دن میں
ایک ہزار شعر پورے کہ ڈالے۔

ظاہر ہی فنِ شاعری کے نقطۂ نظر سے یہ نظم زیادہ اہم نہیں ہی بلکہ
اس کا نثر میں ہونا زیادہ مناسب تھا[1] لیکن رنگین کو جو طبعی مناسبت نظم
سے تھی اس نے ایسی فنی کتاب کو بھی نظم میں لکھنے پر انھیں مائل کیا نظم

---

[1] رنگین نے پہلے اسے نثر میں ہی لکھا تھا۔ بعد میں محمد بخش عرف میاں پچھو اور
ان کے بھائی کی فرمائش سے نظم کیا۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹۹

کا آغاز گھوڑے پالنے کے فضائل سے ہوتا ہے چناں چہ پانچ ابتدائی شعر اس مضمون پر صرف کیے : ؎

کبھو ہو رزق کا اس کو نہ توڑا — بندھا ہو جس کے دروازے پہ گھوڑا
پڑھو اب قرآں کو آنکھوں کو نہ کر بند — خدا نے کھائی ہے گھوڑے کی سوگند[۱]
عزیز ان کو رکھا ہے مصطفےٰ نے[۲] — بہت چاہا ہے ان کو مرتضیٰ نے
نہیں ہے ان سے بہتر کوئی حیواں — جو بہتر ہے تو ہے بس ان سے انساں
جہاں میں جس قدر گھوڑے ہیں اے یار — تو ان کے حال سے ہو جا خبردار
کل ان کے عیب ہیں یہ پانچ ہیں قسم — سو ہر ایک کا بتا دیتا ہوں میں اسم

گھوڑے کے پانچ عیب پانچ فصلوں میں بیان کیے ہیں۔ پہلا عیب بھونری کا ہے۔ دوسرا ہڈی اور موتھرے کا، تیسرا صورت کا، چوتھا رنگ کا اور پانچواں ڈھنگ کا۔ پہلی فصل بھونرے کے عیبوں میں صرف ہوئی اور بھونری کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں :—

(۱) بھونری آنسو ڈھال (۲) ہمیان زر (۳) دیومن (۴) ہردا ہل (۵) گندہ بغل (۶) بھونری گوم (۷) گنگا پائے (۸) کھونٹی گاڑہ (۹) کھونٹی اکھاڑ (۱۰) بھج بل (۱۱) اربل (۱۲) سایبن (۱۳) چربھنگ (۱۴) ڈنگ اجاڑ۔ ان میں سے ہر عیب کے بارے میں تین سے لے کر پانچ شعر تک کہے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ کس قسم کے گھوڑے کن لوگوں کو پسند یا ناپسند ہیں مثلاً گندہ بغل صرف وہ مغل لیتے ہیں جو قزلباش ہوں۔ گنگا پائے کو بڑی قیمت پر خریدا جاتا ہے۔ کھونٹی اکھاڑ سستا بھی ہو تو نہ خریدنا چاہیے۔ چربھنگ سے راجپوت خاص طور پر چڑتے ہیں۔ ان عیبوں یا خوبیوں کے علاوہ بھونرے

---

[۱] سورۃ والعٰدیٰت پارۂ عم ۳۰
[۲] عن انس رضی اللہ عنہ۔ قال لم یکن شیٔ احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد النساء من الخیل۔ مشکوٰۃ ص ۳۳۵

کے دو عیب شرعی بھی ہیں ان میں ایک "بدمین" کا عیب ہو دوسرے "بدرکابی" کہ بہ قول رنگین ان دونوں کے بارے میں ایک حدیث[1] بھی موجود ہو اسی طرح دوسری فصل میں بدہ اور موتھرہ عیب کی تفصیل بیان کی ہو۔ تیسری فصل ان عیوب سے متعلق ہو جن کا اندازہ گھوڑے کی صورت کو دیکھ کر ہو جاتا ہو۔ اس فصل میں گھوڑے کی یہ قسمیں خاص طور پر گنائی ہیں:-

(۱) شتر دنداں (۲) کج پیشانی (۳) پریشان گوش (۴) تختہ گردن (۵) گاؤ شانہ (۶) زین پشت (۷) آہو شکم (۸) چپاتی سُم (۹) خرشمہ (۱۰) مُرغ پا (۱۱) تبر کون (۱۲) کحل یعنی کل جبہ (۱۳) کُشادہ رُو

چوتھی فصل گھوڑوں کی رنگ کے عیب و ثواب کی پہچان میں ہو اس میں حسب ذیل قسمیں گنائی ہیں :-

(۱) ستارہ (۲) ٹیل (۳) ماہ رُو (۴) عقرب (۵) طاقی (۶) چقہ (۷) گل دست (۸) چپ دست (۹) پدم یعنی جالی دار (۱۰) ارجل (۱۱) سفید و سنجاب (۱۲) شب کور۔

اس کے بعد گھوڑوں کے سال و سن کی پہچان بیان کی ہو۔ پانچویں فصل جو نہایت دل چسپ ہو ان پانچ عیبوں کے متعلق ہو جنھیں پانچ شرعی عیب کہا ہو (۱) کنہ لنگ (۲) کمری (۳) کم خور (۴) دنداں گیر (۵) شب کور

کتاب کا آخری حصہ بیطاری سے متعلق ہو۔ اس میں بیماریوں کی پہچان[2] اور ان کے علاج نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کا تیسرا حصہ

---

[1] عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکرہ الشکال فی الخیل
ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے گھوڑے کو ناپسند فرماتے تھے جس کے داہنے پاؤں میں سفیدی اور بائیں ہاتھ میں سیاہی ہو۔ شکال کے دوسرے معنی تین سفید پاؤں والا گھوڑا (ترمذی ابواب الجہاد ص۲۰۲)

[2] قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری ورق ۴۷ کاتب سید محمد نواب ابن سید سلطان علی ساکن شاہ جہاں آباد تاریخ کتابت ۱۲۔ جمادی الاول ۱۲۰۷ھ

ان نسخوں پر مشتمل ہے جو رنگین کے مجرب ہیں۔ مثلاً اگر کوئی گھوڑا آگ یا بارود سے جل جائے تو رنگین اس کے لیے یہ نسخہ بتاتے ہیں :–

کسی کا گر کہیں جل جائے گھوڑا — تو زخم اس کا بہت ہو یا کہ تھوڑا
عرق وہ پیاز کا گر اس کو لگوائے — تو بس فی الفور اسے آرام ہو جائے
یہی انسان کی بھی ہے دوا یار — مکرّر آزمائی ہے یہ ہر بار

آخری نسخہ گھوڑوں کے زخم سے خون بند کرنے کا ہے –

نہ ہو گر زخم سے گھوڑے کے خوں بند — تو پھر میرا کہا مان ای خردمند
تو اِس پر باندھ اک مکڑی کا جالا — کہ ہووے بند گر ہو خوں کا نالا
دیا اس پر سہاگا پیس کر ڈال — کہ ہو جا خون بند اس کا وہ فی الحال
یہی انسان کی بھی ہے دوا یار — سمجھاتا ہوں میں تجھ کو یہ بہ تکرار

اس کے بعد خاتمہ نسخہ ہے جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ 'فرس نامہ' لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء اور کان پور میں ۱۸۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ لفٹنٹ کرنل ڈی۔سی فلٹ نے کیا تھا جو ۱۹۱۱ء میں لندن میں طبع ہوا تھا۔ لندن والے نسخے میں ایک مختصر سا نثر میں دیباچہ بھی ہے۔ یہ دیباچہ 'گلستانِ سعدی' سے لیا ہے۔

منّت خدائے را عزّ و جل کہ ———— و بر ہر نعمتے شکری واجب –

از دست و زبان کہ بر آید — کز عہدہ شکرش بہ در آید

انڈیا آفس والا 'فرس نامۂ رنگین'، رنگین کا خود نوشتہ ہے جو بہ تاریخ یازدہم صفر ۱۲۴۵ھ میں لکھا گیا۔ اس نسخے کے پہلے تین ورق پر نسخے دیے ہوئے ہیں جن میں سے درمیانی ورق پر 'صیغۂ نکاح' کی عبارت ہے۔

آخری ایک ورق پر بھی مختلف امراض کی ادویہ بتائی ہیں۔ کُل ۵۹ ورق ہیں۔
ورق ۴ا پر مختصر سا دیباچہ فارسی میں ہے اور ورق ۴ب سے یہ کتاب شروع ہوتی ہے۔ آغاز ہوتا ہے ؎

خدا کی حمد کب مجھ سے رقم ہو دواں جب تک نہ شبدیزِ قلم ہو

اس کے بعد نعت حضرت سید المرسلین میں دس شعر ہیں۔
پھر "دربیان حضرت چار یار" کے عنوان سے تین شعر ہیں۔
اس کے بعد "دربیان منقبت" کے عنوان سے دس شعر ہیں۔
پھر "مناجات درجناب کبریا" کے عنوان سے چھ شعر ہیں۔ اس کے بعد "دربیان تمہیدِ کلام و باعثِ ایں نسخہ" کے عنوان سے ۴۵ شعر ہیں اس تمہید میں رنگین کہتے ہیں کہ جب مَیں فلک کے ہاتھوں تنگ آیا تو گھر سے نکل گیا اور مدت تک مارا مارا پھرا۔ پھر دل میں خیال آیا کہ اس طرح کب تک مارا مارا پھروں گا تو اچانک لکھنؤ آنے کا خیال آیا اور میاں مچھوؔ کے مہمان بنے۔ چناں چہ کہتے ہیں ؎

میاں مچھوؔ جو ایک وہاں مہرباں ہیں تو اپنے سب طرح وہ قدرداں ہیں
محمد بخش نام ان کا ہے مشہور میاں مچھوؔ ہے عرف ان کا بہ دستور
میاں قادر ہیں چھوٹے ان کے بھائی انہوں میں خوبی ان سے ہے سوائی

آگے چل کر کہتے ہیں کہ یہ دونوں مجھے اپنا ہی سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو ان کا بہت ہی احسان مند ظاہر کرتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں ؎

غرض جب تک رہا میں اس مکاں میں تو گویا تھا بہشت جاوداں میں

کسی دن رنگین کا دیوان ان کی نظر پڑا تو انھوں نے کہا کہ حضرت اس فرس نامے کو آپ نے نثر میں کیوں لکھا ہے ہماری خاطر اسے نظم کر دیجیے۔

نوان کی خاطر ایسا کیا۔ چناں چہ آخری دو شعر میں کہتے ہیں ؎

مکرّر جب کہا مجھ سے بہ منّت　　تو کی ان کے لیے مَیں نے یہ محنت
کیا ان کے لیے یہ عزم بالجزم　　وگر ہرگز نہ تھا کچھ میرا یہ عزم

اس کے بعد ' دربیان صفتِ اسپاں ' کے عنوان سے بارہ شعر ہیں۔
اور پھر ورق ۹ب سے فصلِ اوّل شروع ہوتی ہے۔

' تجربۂ رنگین '

' سبع سیارۂ رنگین ' کا چھٹا حصّہ ' تجربۂ رنگیں ' کے نام سے ہے۔ یہ نثر میں ایک نہایت اہم تصنیف ہے جو ۱۲۴۸ھ میں نواب ذو الفقار علی نواب باندہ کی فرمایش پر لکھا تھا جس کا موضوع فنِ سپاہ گری ہے اور جس میں سات ہتھیار یعنی سپر، تلوار، چھُری، نیزہ، برچھی، کمان اور بندوق کا قد اور رکھنے کی طرح اور باندھنے کی وضع سات ابواب میں الگ الگ لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگینؔ کو فنِ سپاہ گری میں بڑا دخل تھا اور اس بنا پر انھوں نے مرہٹوں کو اپنی سپاہیانہ لیاقت سے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ فوج کے ایک سردار بنا دیے گئے تھے۔ دیباچے میں رنگینؔ نے لکھا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب وہ خانوجی مرہٹہ کے پاس گوالیار میں تھے تو اس نے پوچھا کہ انگریز سپاہی دیسی سپاہیوں کے مقابلے میں کیوں غالب آجاتے ہیں تو رنگینؔ نے بیان کیا کہ ہر فن کے سیکھنے کے لیے اُستاد کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ہندستانی اشراف فنِ سپاہ گری میں شاگردی کو اپنے لیے باعثِ ذلّت سمجھتے ہیں اور انگریز کسی معمولی آدمی کو بھی نوکر رکھیں تو اس سے پورا علم حاصل کرتے ہیں۔ اہلِ دربار نے رنگینؔ پر بہت سے اعتراضات کیے

انھیں کے جواب میں رنگین نے سات ہتھیاروں کی تفصیل بیان کی پہلی فصل سپر کے بارے میں جس سے محافظت کا کام لیا جاتا ہے اور آخری باب بندوق کے بیان میں ہے جو سب کے بعد ایجاد ہوئی۔ ان تمام امور کو رنگین نے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے بعض اقتباسات حسب ذیل ہیں :۔

[1] " فصل چوتھی سپر کے باندھنے کے بیان میں یعنی سوار تو تا مقدور سپر کو پشت پر سے نہ کھولے۔ باعث یہ کہ ہر انسان کی پشت اس کاندھے سے تا اوس کاندھے تک اور گردن کی جڑ سے جسے فارسی میں چار بند کہتے ہیں اسے تا ریڑھ جسے ریختہ زبان میں ریڑھ کہتے اور ہندی بھاکا میں کنگروڑ بولتے ہیں خدا کی قدرت سے کہنی کی ابتدا سے بیچ کی اُنگلی کی نوک تک اور چار اُنگل ہر شخص کے ہوتی ہے۔ پس سپر پیٹھ کی محافظت کے واسطے ہے۔ چاہیے ہر شخص کی سپر اس کے ہاتھ کے برابر اور چار اُنگل ہو۔ اگر اس نپت سے زیادہ ہوگی تو اسے وہ حیران کرے گی۔ خواہ مخواہ کبھی نہ کبھی سپر سے چوٹ کھا کر پگڑی زمین پر گرے گی اور زین پوش اور قبا اور پٹکا ضرور بہ ضرور رگڑ اوس سے کھا جائیں گے۔"

[2] " اور سوار جو بندوق کی قواعد کرتا ہے اس کی انواع طرح ہے اُون میں سے دو طرح اچھی ہیں۔ ایک تو یہ اُسے بازگشتی کہتے ہیں۔ وہ اس واسطے خوب ہے کہ چیز بہ کار آمد ہے۔

اگر خدا نہ خواستہ شکست ہو اور حریف پیچھے سے آ پہنچے اور پھرنے کی فرصت نہ ہو تو بازگشتی قواعد سے منھ پھیر کر اسے مار سکتا ہے۔ یہ چال اہلِ ولایت کی ہے اس کے قواعد کی یہ ترکیب ہے کہ بندوق کو تیار کر کے اور قدرے داہنی طرف کو آڑے بیٹھ کر اور بندوق کو بیچ میں سے داہنے ہاتھ سے پکڑ کر بائیں

---

[1] تجربۂ رنگین ورق ۸۴ ب [2] تجربۂ رنگین، باب ساتواں فصل تیسری ورق ۹۴ ب

رکاب پر زور دے کر گھوڑے کو سرپٹ برابر میدان میں ہانکے اور جب چاہے
کہ آگ دے تو داہنے پاؤں پر زور دے کر اور بائیں طرف کو جھک کر اور آڑے
ہو کر گھوڑے کی بائیں ران کے پاس بندوق کی مہری کو پہنچا کر آگ دے بعد
سر کے اوپر اپنی بندوق کو پھراتا ہوا گھوڑے کو روک کر پرے میں آ کر شامل
ہو جائے۔ اس طرح سے جتنی بندوقیں چاہے اتنی چلا دے اور دوسری
طرح ہدف کی قواعد کہلاتی ہے وہ دو طرح پر ہے پہلے تو یہ کہ بندوق کو تیار
کر کے گھوڑے کو پرے میں سے آگے سرپٹ ہانک کر داہنی رکاب پر خوب
زور دے کر آگے کو چاہیے اتنا جھکے کہ گھوڑے کے بال تک پہنچے اور وہاں
کروٹ ایسی لے کہ پیٹھ کے پیچھے کی ہڈی گردن سے لگا کمر تک برابر بال سے
گھوڑے کے لگ جائے اور بائیں ہاتھ سے آسمان کی طرف مہری کر کے
آگ دے اور دوسری وضع یہ ہے کہ جب بندوق تیار کر کے گھوڑے کو پرے
سے نکالے اور سرپٹ کرے تو رانیں گھوڑے پر جیسی کی تیسی رہیں اور ایسا
گھوڑے کی دُم کی طرف سر کو کر کے سیدھا لیٹ جائے کہ آسمان کی طرف
صاف مُنھ ہو جائے مگر بندوق کے چھٹنے کے اُٹھنا محال ہوتا ہے تو اس کی
یہ حکمت ہے کہ پہلے ایک کپڑے زبردست کا ایک سرا زین کی ہرنی میں یا گھوڑے
کی گردن میں باندھ لے اور دوسرا سرا اپنے پٹکے میں باندھ لے جس وقت کہ بندوق
لگا کر چاہے کہ اُٹھے تو اس کپڑے کے آسرے سے گھوڑے پر اُٹھ بیٹھے۔ یہ
قواعد ہدف کی کیا شے ہے یعنی میدان میں ایک نیزے کو گاڑ کر اس کے اوپر ایک
ابخورہ اوندھا دیتے ہیں یا ایک پھول رکھ دیتے ہیں اور سوار گھوڑوں کو دوڑا کر
اس کے قریب سے گزر کر عین سرپٹ میں اس ابخورے پر گولی لگاتے ہیں اکثر
مشتاق لوگ اسے مارتے ہیں۔

اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے یہ رسالہ زیادہ اہم نہیں ہے، لیکن اس سے رنگین کے عہد کے آلاتِ حرب اور ان کے استعمال کے طریقوں نیز سپاہیانہ فنون میں رنگین کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے اس لیے اس نسخے کو نہایت اہم سمجھنا چاہیے۔
ہمارے شعرا میں سودا سے لے کر غالب تک اکثر نے پیشۂ آبا سپاہ گری کہہ کر فخر کیا ہے، لیکن رنگین واقعی سپاہی تھے اور یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رنگین نے صرف اپنی شاعری کو ہی ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا اور نہ صرف درباری یا مداحی کے سہارے زندگی بسر کی تھی۔ اس اعتبار سے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود رنگین کی زندگی کا یہ پہلو نہایت روشن اور ان کی شخصیت کو بلند کرنے کے لیے کافی ہے ❖

باب ہفتم

ریختی و ہزل

دیوان آمیختہ و انگیختہ یعنی دیوانِ ریختی

رنگین کی فحش نگاری

شعر و اخلاقیات کے تعلق کی بحث نہایت اہم ہے بعض لوگوں کے نزدیک اعلیٰ درجے کی شاعری صرف ایسا ہی کلام ہو سکتا ہے جس کا مقصد نیک اور اعلیٰ ہو۔ یہ مقصد انسان کی فلاح و بہبود، ذہنی جسمانی اور روحانی ترفع اور اخلاقی قدروں کا عروج ہے۔ بعض کے نزدیک شاعری یا ادب کا ایسا کوئی مقصد نہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک فنونِ لطیفہ کا مقصد صرف لطف و انبساط پیدا کرنا ہے۔ فنونِ لطیفہ کو کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بہ ذاتِ خود مقصود ہوتے ہیں اور انسان کی خواہشات جذبات تاثرات اور رجحانات کو بغیر کسی تکلف یا تصنع کے پیش کرتے ہیں۔ در اصل فنونِ لطیفہ کا اصلی مقصد نہ محض تلقین و تبلیغ اور نہ صرف لذت و انبساط ہے، بلکہ اس کا کام اعلیٰ درجے کے جذبات کو صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ دنیا میں بہترین

ادب، شاعری، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، مجسمہ سازی وغیرہ کے جس قدر اعلیٰ نمونے موجود ہیں وہ اس نظریے کی تائید میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے شاعری کا مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ وہ انسانی جذبات، خیالات، افکار، تصورات احساسات وغیرہ کو اس طرح الفاظ میں پیش کرے کہ خود شاعر اور اس کے سامع کو لطف و انبساط حاصل ہو اور اگر اس کلام سے کوئی اعلیٰ مقصد حاصل ہوتا ہے تو یہ کلام صرف اچھی شاعری سے بڑھ کر اعلیٰ شاعری کا مرتبہ حاصل کرے گا۔ یہ اعلیٰ مقصد تزکیۂ نفس، مذہبی پاکیزگی، روحانی ترقی، حق و صداقت کی تائید، انسان کو انسان کی ہمدردی پر مائل کرنا یا اس کی معاشی یا تہذیبی ترقی میں حصہ لینا، سب کچھ ہوسکتا ہے، اس لیے شاعری کے لیے کسی ایک مقصد یا ایک مسلک کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن انسان میں انسانیت کے ساتھ حیوانیت کا عنصر بھی شامل ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حیوانیت کا یہ عنصر اعمال و افکار میں غالب آجاتا ہے۔ اور انسان اپنی زندگی کا مقصد محض کھانا پینا مادی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا اور جنسی خواہش کی تسکین سمجھ لیتا ہے ان میں سے ہر جذبہ بالکل قدرتی ہے لیکن انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان نے ان کی تسکین کے لیے حدیں مقرر کرلی ہیں۔ ان حدوں کا نام مذہب، اخلاق یا قانون چاہے کچھ سمجھ لیا جائے حیوانیت ان قوانین کے خلاف بغاوت کرتی رہتی ہے۔ اور اس کا اظہار انسانی اعمال و افکار میں ہوتا رہتا ہے۔ عام طور پر جب کسی ملک یا قوم میں سیاسی اور ذہنی زوال و انحطاط کا دور شروع ہوتا ہے تو اس قسم کے جذبات زیادہ ابھر آتے ہیں۔ ہندستان میں مغلوں کا آخری دور اس قسم کا تھا۔ کہ شمشیر و سناں کا زمانہ ختم ہوکر طاؤس و رباب کا دور آچکا تھا۔ یہاں ہمیں اس زوال

کے اسباب سے بحث کرنا نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اگرچہ اس زمانے میں بھی بعض اشخاص اور بعض تحریکیں اس عام رَو کے خلاف ملتی ہیں لیکن وہ اتنی کم زور ہیں کہ اس عام سطح میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے سامنے شاعری کا وہ بے شمار دفتر ہے جس میں اعلیٰ درجے کے اشعار کے پہلو بہ پہلو نہایت ادنیٰ درجے کا کلام موجود ہے اور یہ کلام کسی ایک شاعر، ایک صنف یا ایک علاقے سے مخصوص نہیں ہے۔ غزل میں امرد پرستی کے مضامین اور معاملہ بندی اسی کی جھلک ہے۔ سودا، میرحسن، انشاء اور مصحفی کی ہجویات بھی اسی کی صدائے بازگشت ہیں اور ریختی اور ہزل بھی اسی ذہنی کیفیت کی ترجمان ہیں۔ ریختی کا مقصد عورتوں کی زبان میں ان کے جذبات کا ادا کرنا ہے۔ کیوں کہ اُردو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عورتوں اور مردوں کی زبان اور محاورے میں خاصہ فرق ہے جو دُنیا کی اور زبانوں میں بہت کم ملے گا۔ اس اعتبار سے دیسی زبانوں بالخصوص برج بھاشا کی شاعری کے ایک بڑے حصّے کو ریختی کہا جا سکتا ہے لیکن اُردو شعرا نے اسے عام طور پر جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ اس سے مختلف ہیں۔ ان کے نزدیک ریختی سے مراد ایسی نظم ہے جس میں عورتوں کی زبان میں اوباش اور آوارہ عورتوں کے جذبات اور معاملات نظم کیے جائیں۔ ظاہر ہے یہ اعلیٰ درجے کی شاعری یا ادب نہیں ہے اور جذبات کے اعتبار سے یہ اتنی ادنیٰ اور اسفل ہے کہ اسے قطعاً شعر و ادب کی تاریخ میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ اس کی اگر کوئی اہمیت ہو سکتی ہے تو صرف تاریخی اور لسانیاتی۔ تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ہمیں اس کلام میں ایک ایسے دَور کی ترجمانی ملتی ہے جہاں جنسی لذت پرستی جذبات پر غالب آ چکی ہے اور اس کی تسکین کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ ذریعے کو اختیار کرنے میں کوئی تامّل نظر نہیں آتا۔ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے یہ ایک ایسا دیوالیہ معاشرہ ہے جس کی بنیادیں

کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اگرچہ یہ حقیقت نہایت تلخ ہے، لیکن اس کی صداقت میں شبہ نہیں کہ رنگین کا زمانہ اسی طرح کا تھا جس کی تائید رنگین کے "دیوان آمیختہ" اور "دیوان انگیختہ" سے ہوتی ہے۔

اس کی لسانیاتی اہمیت یہ ہے کہ اس میں عورتوں کی زبان اور ان کے محاورے استعمال کیے گئے ہیں۔ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں اپنی زبان کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھنے کے مواقع خاصے ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایسی سوسائٹی میں جہاں عورتیں پردہ کرتی ہوں اور گھر سے باہر نکل کر مردوں کے ساتھ عام طور پر ملنا جلنا ان کے لیے دشوار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں قلعۂ معلّٰی کی زبان اور لکھنؤ کے بیگماتی محاوروں کو بہ طور سند پیش کیا جاتا ہے، لیکن مضامین کی گندگی نے رنگین کے ان دو مجموعوں[1] کو سند کے طور پر استعمال ہونے کے لائق بھی نہیں رکھا ہے اور ان کے مقابلے میں انشار کا دیوان ریختی یا جان صاحب کا دیوان کہیں زیادہ متین و مہذّب نظر آتا ہے۔

"دیوانِ آمیختہ" مجموعۂ نورتن رنگین کا تیسرا حصّہ ہے جو اکسٹھ اوراق پر مشتمل ہے اس کے شروع میں فارسی میں دیباچہ ہے جس میں حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں:

> "و بعد آں در دنیا بہتر از سہ امر چیزے دیگر نیست اوّل خوب خوردن دویم خوب نوشیدن سویم صحبت با نازنیناں داشتن، پس ای عزیز بہ شرطِ فراغت ہر کسے موافق حوصلہ خود و مقدور خود خوب خوردن و خوب پوشیدن را عادت خود می نماید لیکن محبوب را مفتون کردن و از خود راضی داشتن کمال دشوار است۔ مگر اگر کسے بریں نوشتہ عمل نماید ہر آئینہ بہ مقصد بہ رسد چراکہ ایں سخن ہا کہ نگارش یافتہ اند در تجربہ خود آمدہ اند بنا برآں

---

[1] دیوان آمیختہ و دیوان انگیختہ

ایں قدر درد سر نمودہ شد تا کہ طالبانِ ایں فن ازیں کیفیت بردارند۔
ایں بندہ ہیچمداں یعنی سعادت یار خاں رنگین ایں مقدار استعداد داشت
کہ اگر می خواست ایں نسخہ را در نظم در ہندی یا فارسی می پرداخت
اما در فہم عوام الناس بہ خوبی نہ می آمد۔ ازیں جہت در نثر بہ سہ فصل
مختصر کردہ در دیباچہ دیوان سیوم دیوان ہزل کہ مشہور بہ" دیوان
آمیختہ" است مرقوم ساخت۔ و دریں دیوان اسم طوائف بہ قید ردیف
بایں شرط کہ ہر حرف اخر ردیف بود، سر حرف اسم طوائف باشد۔
مگر ردیف یا کہ دراں اخر اسم ہست وبیش تر غزلیات و اشعار در
تمغیل است پس ہر کہ برایں اوراق نظر کند لازم کہ یک چیز را ازیں ہائے
کہ نوشتہ ام بہ آزماید اگر موافق افتد بداند کہ ہمہ درست است وگرنہ خیر۔
فصل اول در کنار گرفتن و مکیدن لب و زبان و مالیدن سر پستان و
مساس آں
فصل دوم در گرفتن آسن و مباشرت کردن و امساک۔
فصل سوم در انزال کنانیدن عورت۔"

اس دیباچے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ رنگین نے اپنی زندگی کس ماحول میں گزاری تھی اور قدرتی طور پر اس کا کیا اثر قبول کیا تھا۔ ممکن ہے جنسیات کی تاریخ یا جنسیاتی ادب میں رنگین کی اس تحریر کا کوئی درجہ ہو۔ اُردو شاعری یا ادب کی تاریخ سے یہ خارج ہے۔ تین فصلوں کو جن کا ذکر دیباچے میں کیا ہے، تفصیل سے لکھا ہے اس کے بعد حصۂ نظم شروع ہوتا ہے۔ پہلا قصیدہ " در طعن و تشنیع شیطان علیہ اللعنت لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" کے عنوان سے ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

نہ ہوئے تو کیوں سزاوار طوق لعنت کا　　تو واقف اس سے ہے جو کام ہے شرارت کا

قصیدے میں دو مطلعے ہیں پہلے میں پندرہ اور دوسرے میں سولہ اشعار ہیں۔ دوسرا قصیدہ "قصیدہ دوم در ہجو ہوشیار چیلہ برادر مہربان رجب بیگ خاں کہ نام اوشان از حرف سر ہر شعری برآید" کے عنوان سے ہے۔ اس میں چوالیس اشعار ہیں۔ مضمون یہ ہے کہ رجب بیگ خاں کا غلام ہوشیار نیکوں سے نفرت کرتا ہے اور بدوں کو دوست رکھتا ہے اس کی تعریف میں لکھتے ہیں :ــ

سُرخی نہیں شفق کی یہ ہے خون خلق کا　　جیبِ سَحَر میں روز جو چمکے ہے تکمہ دار

اس کے مضامین بھی نہایت فحش ہیں۔ تیسری نظم ایک مثنوی ہے جو الہ آباد کے صوبہ دار راجہ گنپت رائے کے بیٹے راجہ لالہ مداری لعل کی ہجو میں ہے اس میں اس کے کنبے والوں کو نام لے لے کر گالیاں دی ہیں اور خاص طور پر خاندان کی عورتوں میں سے نانی، دادی، خالہ کسی کو بھی نہیں چھوڑا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ مذاق بہت عام ہو چکا تھا۔ چناں چہ سوداؔ نے بھی میر ضاحک کی ہجو میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں ضاحک سے زیادہ اس کی بیوی پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ انشاءؔ نے بھی مصحفی کے معرکے میں مصحفی کو شریک کر لیا ہے لیکن رنگینؔ کی ہجو کے سامنے اگلے پچھلے سارے کارنامے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد شیطان کی تعریف میں ایک اور نظم ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

لعنت میں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا　　جتنے ہیں رنڈی باز تو ان کا ہے پیشوا

اس کے بعد قطعات ہیں جن میں مختلف طوائفوں کے نام نظم کیے ہیں بعض نام حسب ذیل ہیں :ــ

(۱) اتی (۲) میرو (۳) اچانک (۴) ازرانی (۵) اللہ بندی (۶) امرو (۷) امرتی (۸) امینہ (۹) حیاتا (۱۰) حرمت (۱۱) حفیظاً (۱۲) خانم

(۱۳) رحیمتی (۱۴) روپا (۱۵) رحمانی (۱۶) زینت (۱۷) ڈوڈی (۱۸) شرفو (۱۹) کملو (۲۰) لاڈلی (۲۱) چمپنی (۲۲) خانی (۲۳) تاجو (۲۴) الفو (۲۵) اندرو۔

اس طرح کے ایک سو تینتالیس نام ہیں جو قلمی نسخے کے ورق ۱۲ ب سے ۵۴ و تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد رباعیات فردیات اور قطعات ہیں۔ جن میں طوائفوں کے نام لیے ہیں۔ ایک قطعہ انشا کی ہجو میں لکھی ہے ؎

انشاء اللہ خاں ہے مفعول　　فاعیل سے وہ اپنے کب خفا ہو
بن اُلٹے نہ ہوگا آشنا وہ　　انشا کو اُسٹ کہ اشنا ہو

ایک قطعہ بارہ اشعار پر مشتمل آصف الدولہ کی ہجو میں ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

آصف الدولہ جو مشہور تھا نواب وزیر　　تھا وہ مفعول اسے جانتے ہیں سب خاص اور عام

اس میں نوازش خاں کی ہجو بھی شامل ہے۔ اس کے بعد کچھ مخمس ہیں جن میں بعض طوائفوں کی ہجو کی گئی ہے۔

دیوان انگیختہ

اسی سلسلے کی دوسری کڑی نورتن رنگین کا چوتھا حصہ دیوان انگیختہ کے نام سے ہے اس کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ اُردو میں ہے۔

رنگین لکھتے ہیں کہ "اکثر میں عرس شیطان کا جس سے مراد تماش بینی خانگیوں کی ہے کیا کرتا تھا۔ اور اس قوم کی ہر ایک کی تقریر پر دھیان دیتا تھا کچھ دن اسی طرح سے گزارے تب یہ ان خانگیوں کی بہت سی اصطلاح اور محاوروں کا علم ہوا۔ ان کی زبان میں یہ چوتھا دیوان

جو 'انگیختہ' کے نام سے مشہور ہے ترتیب دیا۔ بہ قول شخصے گندہ بروزہ باخشکہ اگرچہ لطفے نہ دارد لیکن ابجادبندہ است۔

لیکن اس دیوان میں ان خانگیوں کے ایجاد کردہ لغات، محاورے اور اصطلاحات اکثر ایسے ایسے نظم ہوئے تھے جن کو دوست سمجھنے سے قاصر تھے اس لیے میں نے دقیق الفاظ یعنی محاورے وغیرہ کو اس دیباچے میں بہ قیدِ حروفِ تہجی شروع کر کے لکھ دیا۔"

ات کت : نہایت

اودھل گئی ہے : بدکار ہوگئی ہے

اوردا بیگنی : جو مغلانی رو بہ رو بیگمات کے اہتمام کرتی ہے۔

انوٹھی بات ہے : نئی بات ہے۔

اوشاک لگائی : تہمت لگائی

انگلیٹ : سراپا جسم کو کہتے ہیں۔

اندر والا نہیں سمجھتا : جی نہیں سمجھتا۔

ایسا کیا شہر شملہ پڑا ہے : ایسا کیا شہر نا پرساں ہے کہ کوئی کسی کی داد کو نہیں پہنچتا۔

آمین کے چھینٹے : یعنی کوئی آفت تیرے نزدیک نہ آئے، جب لڑکا قرآن شریف ختم کرتا ہے تو اس سے آمین پڑھواتے ہیں اور پڑھا ہوا پانی سب گھر والوں کے اوپر چھڑکا جاتا ہے کہ اس کی برکت سے بلاؤں سے محفوظ رہیں۔

اُودھم اُٹھایا ہے : شور و غل برپا کیا ہے۔

آڑی ترچھی ہے : عداوت رکھتی ہے۔

اپنی ایڑی دیکھ : نظر نہ لگا۔

اتنی سار ہو : ہضم نہ ہو، زہر مار ہو

اوشعلہ اُٹھایا ہے : طوفان اُٹھایا ہے

اسے علی کی سنوار : علی کی مار

ایڑی چوٹی پر سے واروں : اپنے سر یا پیر سے قربان کروں۔

اسے چیلوں کو دوں : اپنے پر سے صدقے کروں

اہلے گہلے پھرتی ہے : خراماں اور نازاں پھرتی ہے۔

اپنے دلوں سے صاف ہے : اپنے جی سے صاف ہے۔

اپنی والی پر اگر آؤں : اگر بدخلقی پر آؤں اور اپنی بات کی پچ کروں تو غضب ہو۔

اوپر والا ہوا : چاند ہوا۔

اُٹھ جائے : مر جائے

آتوجی : اُستانی

ان گنا مہینہ ہے : آٹھواں مہینہ ہے۔

الاچی : دو عورتیں ایک ایک الاچی لیتی ہیں اور توڑتی ہیں جس کی الاچی میں سے جفت دانے نکلیں وہ نر ہوتی ہے اور جس کی میں سے طاق نکلیں وہ مادہ مجبوراً بنتی ہے، اگر دونوں کی الاچیاں دانے مساوی نکالیں تو دوبارہ یہی عمل کرتی ہیں تاوقتیکہ جفت اور طاق نہ نکل آئیں، پھر اپنی سانھیوں میں مل کر شادی کرتی ہیں اور یہ الاچی کہلاتی ہیں۔

آچا یا اچا : وہ لونڈی جو قدیم، بوڑھی، آئین داں اور ہوشیار ہوتی ہے اور جو لونڈی نئی آتی ہے اسے اس کے سپرد کرتے ہیں تاکہ موجب قاعدہ باورچی خانے اور جواہر خانہ وغیرہ کی آرائش اور کام کی تربیت حاصل کر سکے۔

برموہی : سوری، عورتیں بچوں کے لیے کبھی غصے میں اور کبھی پیار میں آکر استعمال کرتی ہیں۔

بستار کرتی ہے : بات کو بڑھا کر چھان پھٹک کرتی ہے۔

بیٹھک : اچھا ستھرا فرش کر کے اور نہا دھو کے اس پر بیٹھتی ہے اور میاں شاہ دریا، شاہ سکندر، میاں زین خاں ننھے میاں، سید برہنہ، پیر ٹھیلے، شاہ مدار چہل تن چہل من، چار اگلے چالیس تن یا ساتوں پریوں میں سے کوئی پری اس کے سر پر آتی ہے۔ ان ساتوں پریوں کے نام یہ ہیں:۔
لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری، آتش پری۔

بُوبُو : جس لونڈی کی گود میں ماں باپ نے پرورش پائی ہوتی ہے، لونڈیوں کی چھ قسمیں یہ ہیں :۔
بُوبُو۔ اچا۔ ددا۔ چھو چھو، سہیلی اور سکھنی

بتانا : لوہے کا کڑا ہوتا ہے جس کی مدد سے چوڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔

بڑھاوُ پوشاک : اُتارو پوشاک

بڑا رن : بڑے بوڑھے یا کسی چھوٹی سن والی کو ازرہِ طعن کہتے ہیں۔

بڑ ما : جو بڑی نہ ہو اور خود کو بڑا سمجھے۔

بیڑی پنہائی : حضرت بو علی قلندر کی منت کے نیلے سوت کے لچھے پاؤں میں پہنائے

بے دید ہے : بے مروت ہے۔

بٹلا مُنھ ہے : گول منھ ہے۔

برنی : پلکوں کی جڑ۔

بُکٹا بھرا : چُٹکی مارا اور نوچ لیا۔

بُوٹا سا قد : چھوٹا سا قد۔

بھٹھور : چولھے کی جلی ہوئی زرد مٹی۔

بھربھراہٹ ہے : سوجی ہے۔

بڑانسا حال ہے : بہت رشتے پیچ در پیچ ہیں۔

بڑی چیز اُٹھائی یا بڑی روٹی اُٹھائی : جو لوگ غسل کی حاجت رکھتے ہیں وہ ادب کے لحاظ سے قرآن شریف کی قسم اس طرح کھاتے ہیں۔

بھدڑ قدمی ہے : بد قدم اور نامبارک ہے

بھونکڑا : بڑے موتی، بدزیب چیز۔

بڑہیل : بڑھیا یا وہ گو۔

برمنہی : مادہ خوک

بیر دوڑاتی ہے : موکل دوڑاتی ہے اور بھتانی لیتی ہے۔

بوغبند : بڑا بقچہ

باجی : ترکی لفظ ہے، بڑی بہن کو آپا اور چھوٹی کو باجی کہتے ہیں، ہمارے محاورے میں بیگمات کے برابر کی بیٹی ماں کو باجی کہتی ہے، ماں کہے تو شایاں نہیں اور خطرہ یہ ہے کہ نظر نہ لگے، اور بہن کہے تو ادب سے دُور ہے، پس وہ ماں کو لاڈ سے باجی کہتی ہے۔ یہ کم عمری کی پہلی اور برابر کی لڑکی ہوتی ہے۔

بڑکبس لگا ہے : بڑھاپے میں مسخرہ پن لگا ہے

بھدرک تمھاری بات میں نہیں : تمھاری بات میں استواری نہیں۔

بتیلی : کم بخت

برکی ماری : افسوں مارا۔

بیلے ہے : بے مزہ اور پھیکی ہے۔

بھٹل : بے سلیقہ اور کثیف

بھکتی ہو : پھانکتی ہو اور نگلے جاتی ہو

پھاپھا : پیر زال۔

پہلانا : مُردے پر جان کے اوروں کو رُلانا۔

پھپھٹ ہائی ہے : تھوڑی بات کو زیادہ بڑھاتی ہے۔

پایل ہُوا ہے : جو بچہ پیروں کے بل پیدا ہو۔

پُرچک : اجازت، کمک اور مدد۔
پیز : ضد
پنڈا پھکا ہے : بخار ہے
پھول کے دن آئے : بے نمازی ہوئی
پھر دل دیا : نہ دیا لا کر دیا کھول ڈالا
پُڑیاں : دو وضع کی ہوتی ہیں ایک تو یہ
کہ سندور اور عنبر کی پُڑیاں چہل بی بی
کے نام کی فاتحہ دلا کر اُڑا دیتے ہیں
اور دوسری یہ کہ شیرینی پر اس کے نام
کی فاتحہ دے کر بانٹتے ہیں۔
پاونی : جانے والی ہے
پہوٹ : مرجا
پگڑی والا : رات کو شگون بد جان کر حکیم
کو پگڑی والا یا چیرے والا کہتے ہیں۔
پھول پڑے : آگ لگے۔
پچھائی : انگیا کی آستینوں کے پاس کے
کپڑے کو کہتے ہیں۔
پٹی : پٹارہ اور صندوقچہ جس میں گوٹا کناری
رکھتے ہیں۔
تُوتُو اور للو : زبان
تھل بیٹھو : آرام کرو

نہکاریاں : بیڑیاں
ننگا : بیگمات دودھ پلانے والی کے خصم
کو کہتی ہیں۔
تخت کی رات : بیاہ کی رات
تیخی ہے : شوخ ہے۔
تنھیا ہے : تیز ہے۔
تُوراجناتی ہے : حکومت جتاتی ہے۔
تہیکارا : نزلہ
تیونالا کیا : سلیقہ کیا، سگھڑاپن کیا۔
تبرا بیز کروں : تبروں سے چھلنی کروں۔
تو نئے جوڑتی ہے : طوفان لیتی ہے۔
تانستی ہے : گھڑکتی ہے، بُرا بھلا کہتی ہے۔
تلادے : کھانے کا سامان جو تو لاتا ہے۔
تختی : سینہ، کمر اور بازو۔
ٹھنڈی کر ڈالوں گی : چوڑیاں توڑ ڈالوں گی
ٹوکی : انگیا کی کٹوریوں کے اوپر کے
ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔
جل جوگنی : چیل
جلے پاؤں کی : جو گھر گھر ناحق پھرے۔
جیا : دودھ پلانے والی دائی
جی بھاری نہ کر : رو مت

ر چیبی : چیب یعنی زبان صاف کرنے والی چیز
چندیا سے سرک : میرے سر پرسے پرے ہٹ۔
چھنٹل : نہایت قریبی۔
چھتیسی : آٹھوں گانٹھ کمیت ہے۔
چلاپن ہے : احمق پن ہے۔
چھب : اوڑھنے اور پہننے کی وضع کہتے ہیں
چواؤ : تکرار
چڑیا : انگیا کی کٹوریوں کے بیچ کی دو خشت کو کہتے ہیں۔
چوچل ہائی ہے : نخرے کرنے والی ہے۔
چھوچھو : جو صاحب زادی کے ساتھ چھوٹے پن سے ہی کھیلتی ہے۔
خیلا ہے : واہی ہے۔
خرزادی ہے : صاحب زادی ہے۔
خشکا کھاؤ : اپنی راہ لو۔
دائی کو میری کوستی ہے : مجھے کوستی ہے۔
دو پلیتھی : ایک وضع کی جالی جس کا دوہرا خانہ ہوتا ہے' اس کپڑے کی کرتیاں بنتی ہیں۔
دو منھ ہنس لے : ذرا ہنس لے
دونا : نیاز حضرت مشکل کشا یا حضرت خاتون

دوالیں : انگیا کی کٹوریوں کے نیچے کے کپڑے کو کہتے ہیں۔
دور پار : خدا نہ کردہ
دوگانا : بازار سے بادام منگا کر ان کی گری نکالتی ہیں۔ ان میں سے جو بادام توام یعنی دوگانا نکلتا ہے' تو ضرور ہے کہ ایک گری دوسری میں در آئی ہوئی ہو' جو گری در آئی ہوئی ہوتی ہے اس کا نام نر رکھتی ہیں اور جس میں در آئی ہوئی ہوتی ہے اس کا نام مادہ کرکے کسی اجنبی شخص کو بلا کر وہ دونوں گریاں اسے دے کر کہتی ہیں کہ ان میں سے ایک گری مجھے اور دوسری گری دوسری کو دے دو' جس کے ہاتھ نر آئے وہ اپنے کو مرد جانتی ہے اور جس کے ہاتھ مادین آئے وہ مجبوراً مادہ بنتی ہے اور باہم دوگانا کہلاتی ہیں۔
دوا : وہ لونڈی جس کی گود میں آپ پرورش پائی ہو۔
دھوا : غریب لوگوں میں دودھ پلانے والی کے خصم کو کہتے ہیں۔

دہوہا : وہ اسباب جو شادی کے وقت کا چھن یا کھاری یا اسی طور کے لوگ بہ طریق نذر لاتے ہیں اور انعام پلتے ہیں۔

دہاوے : ماتے

دیوسا : مرنے کا دن

روپا : چھچھو ندر

راج کرے یہ الفت : آگ لگے اس الفت کو

رنگیلی ہو : بڑی بدذات ہو۔

رائی مونیاں کی چوڑیاں : ایک وضع کی عمدہ چوڑیاں۔

رسیٹی باندھنا : کسی کام کا بلاناغہ کرنا

زناخی : مرغ کو ذبح کر کے اور پکوا کے باہم کھانے بیٹھتی ہیں، اس مرغ کے سینے میں ایک ہڈی دوشاخی قاعدہ ہو کہ ہوتی ہو اس کا نام زناخ ہو' اس کی ایک ایک شاخ کو دونوں پکڑ کر اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں جس کی طرف کی شاخ ٹوٹ جاتی ہو وہ مادہ اور جس کی ثابت رہتی ہو وہ نر کہلاتی ہو' اور اگر بیچ میں سے مساوی ٹوٹی تو پھر دوسرا مرغ منگا کر ذبح کرتی ہیں اور وہی عمل کرتی ہیں تا آنکہ نر و مادہ کی پہچان پوری نہ ہو جائے۔

سرول کون کرے : دردِ سر کون لے

ستھرائی : جھاڑو۔

سٹیا : بیٹی کو غصہ میں کہتے ہیں

سیلی : رونگٹے جو پیروں پر نکلتے ہیں۔

سہ گانا : جو دوگانا کی دوگانا ہوتی ہو۔

سہیلی : جو ہم عمر لونڈی خدمت میں رہتی ہو

سکھنی : جو لڑکی ماما یا اصیل یا فراش یا خدمت گار کی محل کے اندر صاحب زادیوں کے ساتھ کھیلنے جاتی ہو اور وہیں کھاتی پیتی ہو۔

شفتل : بدکار

شدخوری : یہ لفظ شور خوردہ تھا یعنی اینٹ یا دیوار کہنہ، بیگمات نے اختصار کر کے شدخوری ٹھہرایا یعنی ناکارہ اور ناقص۔

شنناح : حرام کار

طورا جتانا : حکومت جتانا۔

طبق : جو چیز پریوں کی نیاز کی ہوتی ہو۔

قصہ ناندھا ہو : قصہ شروع کیا ہو۔

قطامہ : کٹنی
قادری : بنڈی کی قسم
کٹھلی : کان کے اوپر کے سوراخ
کاچھن : سبزی و پھل بیچنے والی
کوچہ کریلا ہے : چیچک رو ہے۔
کڑوے کسیلے دن ہیں : بیماری کے دن ہیں۔
کاکا : اس خوجی کو کہتے ہیں جس کی گود میں
ماں باپ نے پرورش پائی ہو اور
وہ نہایت بوڑھا ہو۔
کڑکھائی : چیچک رو
کلپنا : بلبلانا۔
کسبتو : قحبہ
کل کھری ہے : بد خُلق اور بدخو ہے۔
کیجاجان : دائی
کہرپی : انگیا اور پشواز کے مونڈھوں
کی تراش۔
گوئیاں : اصطلاح اہلِ پورب ہے، یہ لفظ
اگرچہ از روئے معلّائے عالم بیگمات
سے ٹکسال باہر ہے اور معیوب ہے
لیکن حال میں از رہ تمسخر اور لاڈ کے
اکثر کی زبان پر آجاتا ہے۔ مگر مراد اس کا
سہیلی دوگانا وغیرہ کی ایک قسم ہی ہے۔

گھر گھالے ہیں : بہت سے گھر برباد کیے ہیں۔
گاچ : ایک مہین چیز مانند لاہی کے پودے
کی چھال کے ہوتی ہے۔ ایک قسم کا
مہین کپڑا۔
لکھیا : چغل خور
لتری : جو اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی
اِدھر لگائے۔
لہٹی : فریفتہ
مُفابا : سنگاردان
مانگ سے ٹھنڈی : سہاگن
مان مہد مجھ سے نہیں اُٹھایا جاتا : ناز
بے جا مجھ سے نہیں اُٹھایا جا سکتا۔
مُرداری : چھپکلی
مُنہ بھرائی : رشوت
مٹکنا سا ہے : خوبصورت اور چھوٹا سا ہے۔
مُٹھیا برس ہے : آٹھواں یا تیرھواں یا
اٹھارواں یا اٹھائیسواں برس ہے۔
ملکت : انگیا کی کٹوریاں۔
ماموں رستی : رات کے وقت سانپ کو
کہتے ہیں۔
مُنہ تھتھکار کر : مُنہ پھلا کر
نوج، بخ : خدا نہ کرے

ناگن : گدّی کے اوپر سر کے بالوں میں ایک بھوری یعنی ایک چکر سا ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ جس کے سر پر یہ ہو اس کا خاوند جیتا نہیں۔

ناویاں : چُٹ بلیں

نکھد کی چوڑیاں : ایک وضع کی چوڑیاں

ناک چوٹی گرفتار ہے : صاحبِ غیرت، اور جو کسی کو خاطر میں نہ لائے۔

نیم تنا : بہ طور کُرتی کے بہت سی کلیوں کا ہوتا ہے۔

ناک نر ہے : عزّت و حرمت بڑھی۔

نروٹھا : موٹا مسٹنڈا۔

ہاتھ پتھر کے تلے ہے : مجبوری ہے۔

ہلکائی ہوئی : حیران ہوئی

ہلجان : شادی کے بعد صاحب زادیاں اور بیبیاں ادائے شکر کے طور سے پیسے آپس میں ملا کر پوری کچوریاں اور مٹھائیاں منگا کر کھاتی ہیں اور چھینا جھپٹی کرتی ہیں۔

ہلہم مچائی : گھبراہٹ ڈال دی۔

ہتھیلی میں چوریڑا : پورے ہاتھ میں مہدی نہیں رچی، کچھ دھبے پڑ گئے

ہینگو نکٹی : بلّی کو کہتی ہیں جب چلتے میں بیٹھتی ہیں تو بلّی کا لفظ استعمال نہیں کرتیں۔

ہولا جولی نہ کر : بے اوسان نہ کر۔

ہوتے نہ دے : فریب نہ دے۔

ہٹی پڑی : مقامِ حیرت ہے۔

یگانا : میاں شیخ سدّو، میاں زین خاں، میاں صدر جہاں، پیر ہٹیلے، ننھے میاں، چہل تن، چہل من، چار اگلے چالیس تن، میاں شاہ برہنہ، میاں شاہ دریا، میاں شاہ سکندر، میاں شاہ مدار اور ساتوں پریاں یعنی لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، دریا پری، آسمان پری، نور پری۔ عورتیں ان سب کو مانتی ہیں اور اپنا حاجت روا جانتی ہیں، لیکن ان میں سے میاں شاہ دریا، شاہ سکندر اور ساتوں پریوں کے حق میں یہ کہتی ہیں کہ یہ تو باہم بھائی اور بہنیں ہیں۔ ان کو جنّت سے خدا نے حضرت خاتونِ جنّت کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سبب سے ان نو کے نو کو زیادہ افضل سمجھتی ہیں۔ میاں شاہ دریا اور شاہ سکندر کو اسی وجہ سے نوری شہزادہ

کہتی ہیں یعنی یہ نور کے بنے ہوئے	کے لحاظ سے نوری ہیں ؎
ہیں اور ساتوں پریاں بھی خلقت	؎

یہ فہرست اگرچہ کہیں کہیں فحش ہوگئی ہو، لیکن اس کی ایک لسانیاتی اہمیت ہو اس سے ہمیں عورتوں کی بعض خاص رسموں اور ان کے رواج کا پتہ چلتا ہو اور ان کی خاص زبان اور محاورے کا اندازہ ہوجاتا ہو۔ اس مقدمے کے بعد اصل دیوان ایک قصیدے سے شروع ہوتا ہو جس میں نوری شہزادے یعنی میاں شاہ دریا اور شاہ سکندر صاحب کی تعریف ہو ؎

فلک کے ہاتھ سے اتنا یہ ناک میں ہو دم — کہ کھا کے سو رہوں کچھ جی میں ہو علی کی قسم
یہ بیر باندھی ہو اب مجھ سے اس کمینہ نے — کہ ہو سکے ہو بیاں وہ نہ ہو سکے ہو رقم
میں اپنی جان سے بھی اب تو تنگ آئی ہوں — اذیتیں مجھے لاکھوں ہیں اس سے بلک یدم

اس قصیدے میں نوری شہزادے یعنی شاہ دریا سے کوئی مخاطب ہوکر اپنی پابندیوں اور تکالیف کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہو کہ میری ساس اور نندیں اور نانی تکلیف کا باعث ہیں۔ اصیلیں[1] اور مغلانیاں بھی کہتی ہیں کہ اسے کسی کا غم ہو ؎

ہر ایک جوڑتی ہو مجھ پہ توتئے[2] لاکھوں — کہے ہو مجھ کو ہر اک ہو اسے کسی کا غم

اس کے بعد مطلع ثانی ہو کہ نور جہاں[3] بھی اس مطلع کو پڑھے تو تعریف ہی کرے ؎

یقیں ہو بندی کو جس گھر میں جائے تیرا قدم — لگے[4] بہشت نہ اس گھر کو اور نہ باغ ارم
تری وہ ذات ہو داری کہ تجھ کو جو دھاوے — جو بانجھ ہوئے تو لڑکے وہ دو جنے توام
زناخی جس کی خفا ہو وہ اس سے مل جائے — دوگانا جس کی ہو آزردہ بھول جائے وہ رم
جن اور بھوت ترا نام سن کے یوں بھاگیں — شعاع مہر سے اُڑ جائے جس طرح شبنم

---

[1] ق۔ن۔ اسیلیں [2] طوفان [3] قلمی نسخے میں ”نور جہاں“ ہو معلوم نہیں کس کی طرف اشارہ ہو [4] پہنچے۔

اٹھا دیں تخت ہوادار کو تیرے پریاں　　چلیں جلو میں تری جن و حور ہو خورم

آگے کہا ہے کہ ہر ایک کی بیماری اور ہر بیماری کا علاج شاہ دریا کے پاس ہے۔

ملے نہ بحرِ جہاں میں پھر اس کا تھل بیڑا　　جو ہر مہینے تری بیٹھک سے ہو رہے بے غم

تو ساتوں پریوں کا ہے گا وہ لاڈلا بھائی　　کہ تیری لیتی ہیں چٹ پٹ بلائیں وہ پیہم

بڑے جو بھائی ہیں تیرے میاں سکندر شاہ　　تو ان کی آنکھوں کی مینک ہے تو خدا کی قسم

کہیں طبق کوئی پریوں ہی کا اٹھائے ہے　　کہے ہے شاہِ برہنہ سے کوئی دل کا غم

یعنی ہر ایک کسی نہ کسی سے عقیدہ رکھتی ہے کوئی پریوں سے کوئی ننھے میاں وغیرہ سے لیکن میں تو ؎

غرض نہ ننھے میاں سے نہ زین خاں سے کام　　نہ شیخ سدو کا بھاتا ہے مجھ کو کچھ نام

مجھے جو ہے تو ہے تیری ہی ذات سے مطلب　　نصیب ہوئے بلا نا ترا مجھے جم جم

کہ ہوئے مری طرف سے یہ سب کی للّو بند　　کرے جو آؤ نہ دشمن مرا نہ کوئی ہم دم

میں تیرے صدقے گئی میرے نوری شہزادے　　طفیل شاہ سکندر کے کر کچھ ایسا کرم

قصیدے میں پچاس اشعار ہیں اس کے بعد ایک مخمس مثنوی اسّی اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی کے بعد ایک منظوم رقعہ ہے جسے ایک زناخی نے دوسری زناخی کو در حالتِ خفگی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ میں تجھ سے کسی صورت سے حسن میں کم نہیں ہوں۔ یہ رقعہ ۹۶ شعر پر مشتمل ہے۔ سراپائے ہم دگر کی تعریف میں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بھویں جو تیری ہیں ماہِ نو کی ثانی　　تو میری ہیں تیغِ اصفہانی

چشموں میں بھرا ہے گر تیری ناز　　تو آنکھیں میری بھی ہیں فسوں ساز

ہیں گوش تیرے جو پھول سے خوب　　تو میرے ہیں کان ان سے محبوب

بینی تیری جوں الف عیاں ہے　　تو میری بھی ناک سونتواں ہے

لہ نیاز ۲ہ پتلی ۳ہ نیاز ۴ہ مراد شاہ دریا ۵ہ زبان ۶ہ مذکور مکرر

گر ہونٹھ تیرے ہیں برگ گل اب — تو ٹکڑے ہیں لعل کے مرے لب
گر دانت ہیں تیرے سلک گوہر — تو میرے ہیں موتیوں سے بہتر
شیریں ہو زبان تیری جو خود کام — تو میری زبان ہو لوز[1] بادام
گردن ہو بیاضی تیری ناگن — تو میری بھی ہو صراحی گردن
بازو جو ہیں گول گول تیرے — تو ڈنڈ بھرے بھرے ہیں میرے
ساعد ہیں تری جو شاخ سنبل — تو با ہیں مری بھی ہیں رگ گل
ہیں پنجۂ خور جو ہاتھ تیرے — تو رشک قمر ہیں ہاتھ میرے
قامت ہو ترا جو سرو آزاد — تو میرا بھی قد ہو نخل شمشاد

اس کے بعد جسم کے ہر ہر کپڑے کا مقابلہ کیا ہو ؎

انگیا گر گاچ کی ہو تیری — تو ستھری یہ رینگ کی ہو میری

ناز و ادا کے متعلق کہتی ہو ؎

گر تجھ میں ہیں ناز و ادائیں — تو میرے کرشمے ہیں بلائیں
گر نکلے ہو تجھ پہ خلق کا دم — تو مجھ کو بھی چاہتا ہو عالم

حسن کی تعریف میں ؎

ہیں بحر میں دونوں حسن کے غرق — تجھ میں اور مجھ میں کچھ نہیں فرق
چھوٹا سن گر ترا ہو جانی — تو مری اٹھتی ہو جوانی

اس منظوم خط کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں جن کا انداز یہ ہو ؎

واری تیرے جاؤں میں خالق ہی خلقت کا — کب مجھ سے بیاں ذرہ ہوئے تری قدرت کا
کچھ مجھ کو گناہوں کا خطرہ نہیں محشر میں — چھوڑوں گی نہ میں دامن خاتون قیامت کا
تو ہی وہ جواں جس نے پھر کر کے زلیخا کو — یوسف کو کیا مفتوں اس چاند سی صورت کا
پہلو سے گئی وہاں تک تھا رابعہ بصری[2] کو — یہ شوق دیا تو نے کعبے کی زیارت کا

---

[1] بادام [2] نام ایک پارسا عورت کا جو اپنے ماں باپ کی چوتھی لڑکی تھیں۔

موسیٰ کو جو پالا تھا فرعون کی بی بی نے
پھر کیوں نہ پڑے اس پر پرتو تری رحمت کا

جو نوح کی جورو تھی تھا واعلہ نام اسکا
طوفاں میں کیا تو نے مورد اسے لعنت کا

اور حضرت عیسیٰ کو بن باپ کیا پیدا
مریمؑ کا مرے والی شاہد ہے تو عصمت کا

قطعہ

قربان ترے مجھ سے اور میری دوگانا سے
بھر عمر رہے رشتہ باہم یہ محبت کا

اب آٹھ پہر تجھ سے مانگوں ہوں دعائیں
بندی کو پڑی ہو کیا رنگیں کی نہ چاہت کا

ایک غزل دوگانا کے سراپا میں لکھی ہے ؎

ہے گی میری دوگانا کی سجاوٹ خاصی
چنبئی رنگ غضب تس پہ کھچاوٹ خاصی

سر کے تعویذ ستم اور فتح پیچ عجیب
بال جھکے ہوئے چوٹی کی گندھاوٹ[1] خاصی

سب سے گفتار جدی سب سے نرالی نک سک
دانت تصویر ہیں مسی کی جماوٹ خاصی

شہر آشوب وصڑی تس پہ لکھوٹا[2] کافر
سن جو چھوٹا ہے تو ہے منھ سے بہلاوٹ[3] خاصی

گر جگت بولے تو پرکالہ آتش ہو زباں
اور رک جائے تو رکنے میں رکاوٹ خاصی

اس کی بس گات کی کیا بات ہے تخنی[4] سو دھوپ
چھب درست ایسی ہے باز وکی گلاوٹ خاصی

کرتی جالی کی پری سر پہ دوپٹہ اچھا
تہر پاجامہ اور انگیا کی کساوٹ خاصی

قطع چولی کی عجب گھیر بھی دامن کا طلسم
آستیں چست بہت اور چناوٹ خاصی

لہر لہرائی ہوئی تس پہ وہ طوفان حباب
گوکھر و اور بنت کی ہے بناوٹ خاصی

سکی بھرنی وہ شررہ اور جھجکنا زیبا
اوسی کے ساتھ بھر ابرو کی جھکاوٹ خاصی

پہنچیاں واچھڑے[5] جی کان کی بالی بیداد
نورتن ویسے ہی ٹیکی کی جڑاوٹ خاصی

ناز زیبندہ حیا آفت عشوہ جادو
غمزہ وہ ظلم ادا اور رکھاوٹ خاصی

اچپلاہٹ وہ فسوں اور چمٹنا ہے ہے
پھر ملاقات میں کافر وہ اچاوٹ خاصی

---

[1] گندھاوٹ: بال کا [2] بہلاوٹ، بچپن [3] سینہ و بازو [4] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ ص ۲۷۵
[5] واچھڑے جی: حرف تعریف (متروک) واہ وا [6] ٹیکا

کیوں نہ ایسے سے پھنسے دل اجی انصاف کرو — گفتگو سحر، کمر خوب، لگاوٹ خاصی
بند پا جامے کی چنپا میں ثریا کی چمک — وہ پُرمزا دھڑ بن اور بناوٹ خاصی
پاؤں میں کفش بھبھو کا وہ مُغرّق[1] نادر — سرو قد اور یہ رانوں کی ڈھلاوٹ خاصی
سب سے سب بات جدی سب سے انوکھی رفتار — سب سے پوشاک الگ سب سے سجاوٹ خاصی
اس کا اظہار کروں تجھ سے میں کیا کیا رنگیں
دست و پا زور ہیں مہندی کی رچاوٹ خاصی

ایک شعر میں اپنے آپ کو ریختی کا موجد اور انشا کو مقلد بتایا ہے ؎

ریختی کہنی اجی رنگیں کا یہ ایجاد ہے — منھ چڑاتا ہے موا انشا دئی[2] کس واسطے

غزلوں کی کل تعداد ایک سو بارہ ہے ان کے علاوہ کچھ رباعیات، فردیات قطعات، مسدس اور مخمس بھی ہیں۔ یہ دیوان اکھتر اوراق پر مشتمل ہے۔

---

[1] مُغرّق: جگمگا [2] دائی

باب ہشتم

رنگین کی زبان دانی

شاعری کے لیے مضمون اور بیان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے جو جذبات کیفیات حالات اور واقعات شاعر پر گزرتے ہیں اور اسے متاثر کرتے ہیں۔ وہی الفاظ کا جامہ پہن کر شعر بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے شاعر اور خارجی دنیا کے درمیان شعر کا یہ ظاہری پیکر ہی تعلق پیدا کرتا ہے۔ الفاظ ابلاغ کا ذریعہ ہیں۔ انھیں کے وسیلے سے شاعر کے خیالات ہم تک پہنچتے ہیں۔ کوئی خیال کتنا ہی عمدہ اور صاف کیوں نہ ہو جب تک اس کے لیے مناسب پیرایۂ بیان نہیں ملے گا عمدہ شعر کی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ اسی لیے قدیم شعرا نے الفاظ کی تلاش پر بڑا زور دیا ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :-

[1] "کائنات کے مطالعے کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحص ان الفاظ کا ہے جن کے ذریعے سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبہ رو پیش کرنے ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ایسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔ شعر کی ترتیب کے وقت اوّل متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر کے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردّد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر

---

[1] 'تفحص الفاظ' از مقدمۂ شعر و شاعری۔

ہو بہ ہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو، جو مخاطب کو مسخر کرلے۔ اس مرحلے کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے۔ کیوں کہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے۔ اگرچہ شاعر کے متخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصّے پر حاوی نہیں ہے اور ترتیبِ شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوتِ متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔"

جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعے سے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کرسکتے ہیں ان کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے سے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظم الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہ جاتی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون سی بات کی کسر ہے۔ جس طرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً چغلی کھاتی ہے۔ اسی طرح ان کے شعر میں اگر تاؤ بھاؤ بھی فرق رہ جاتا ہے معاً ان کی نظر میں کھٹک جاتا ہے اگرچہ وزن اور قافیے کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر اوقات ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بہ خوبی ادا کرنے سے قاصر ہے مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اس لفظ پر قناعت کرلیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر کو جب تک الفاظ پر کامل حکومت

اور ان کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالاستقلال حکومت کرسکے۔ ایک حکیم شاعر کا قول ہے کہ "شعر شاعر کے دماغ سے ہتیار بند نہیں کودتا بلکہ خیال کی ابتدائی ناہمواری سے لے کر انتہا کی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شاید محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں۔"

اس بحث کے متعلق چند امور جن کو فکرِ شعر کے وقت ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورتاً اگرچہ نثر سے متمیز ہوں مگر معنی اسی قدر پورے ادا کریں جیسے کہ نثر میں ادا ہوسکیں۔ شاعر بہ شرطیکہ شاعر ہو اوّل تو ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے اس کو ضرور کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام[1] مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔"

رنگین نے بلا مبالغہ لاکھوں اشعار کہے ان کا جو مجموعۂ کلام ہمارے سامنے ہے وہی مقدار کے اعتبار سے اتنا ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں شاعری سے قطع نظر لسانی اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس کلام میں اُردو اور فارسی نظم و نثر اور مختلف اصناف کے نمونے شامل ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے بیان بھی بدلتا رہتا

---

[1] رنگین کے کلام میں بھی مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ ملتے ہیں۔

ہے اس لیے رنگین نے جتنے مختلف طرز اختیار کیے ہیں ان کے نباہنے کے لیے زبان و بیان پر زبردست قدرت درکار ہو گی اور ہمیں داخلی اور خارجی شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رنگین نہ صرف اُردو و فارسی، بلکہ عربی، ترکی اور ہندستان کی تمام مختلف زبانوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ہمارے بعض اور شعرا نے بھی مختلف زبانوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ سودا کے قصائد میں عربی، ہندی، پنجابی اور برج کے بعض نمونے موجود ہیں۔ انشا کے یہاں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔ انشا نے رانی کیتکی کی کہانی کے نام سے ٹھیٹھ ہندی میں جو کہانی لکھی ہے اس میں عربی فارسی کا ایک بھی لفظ نہیں آیا ہے، لیکن رنگین کے کارناموں کے سامنے یہ تمام مثالیں ہیچ نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر "نورتن رنگین" کے پانچویں حصے پر پڑتی ہے جس کا نام "مجموعۂ رنگین" ہے۔ چالیس ورق کے اس مجموعے میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں:-

"مجموعۂ رنگین" کا اشاریہ

ورق اوّل سے قصیدہ در ہفت زبان در توصیف ٹیپو شاہ بادشاہ چیناپٹن و مندراج پسر حیدر نایک شروع ہوتا ہے جو ۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اٹھارواں اور انیسواں شعر فارسی میں ہے۔ بیسواں اور اکیسواں زبان ترکی میں ہے۔ بائیسواں اور تیئسواں زبانِ پشتو میں۔ چوبیسواں اور پچیسواں زبان برج میں۔ چھبیسواں اور ستائیسواں زبان مارواڑی میں۔ اٹھائیسواں اور انتیسواں زبان اُردو میں۔ تیسواں اور اکتیسواں زبانِ پنجابی میں۔ اردو زبان میں چودہ شعر ہیں ان کے علاوہ ہر زبان کے شعر کے نیچے سُرخی

سے لفظی ترجمہ لکھا ہو۔

مارواڑی کے دو اشعار کا پہلا مصرع اُردو کا ہو اسی طرح پنجابی کے دو اشعار کا پہلا مصرع اُردو کا ہو۔ فارسی کے دونوں شعروں کا پہلا مصرع بھی اُردو ہی کا ہو۔ ۵۲ شعر کے بعد مطلع ثانی شروع ہوتا ہو۔

مطلع اوّل کے آخر میں دو شعر یہ ہیں :۔

جی میں ہو رنگیں کہ مطلع اور مَیں ایسا کہوں ۔۔۔ جس کو سُن کر وجد میں آجائے رُوحِ انوری
اور ایسا ہو سراسر اس کی وہ تعریف میں ۔۔۔ رشک کھائے جس کی رفعت پر یہ چرخِ چنبری

مطلع ثانی کا پہلا اور دوسرا شعر ہے

کیوں نہ شاہانِ جہاں سے ہوئے تجھ کو برتری ۔۔۔ ہو جبیں سے آشکارا تیری شانِ حیدری
مَیں فلک کے ہاتھ سے تجھ پاس لایا ہوں پناہ ۔۔۔ اے کرم گستر کرم سے کر تو میری دل بری

مطلع ثانی میں کُل ۲۱ شعر ہیں۔

ورق ۷ب سادہ ہو۔ ورق ۸ سے حکایات شروع ہوتی ہیں۔ پہلی حکایت "حکایت پُر بہیہ در زبانِ پوربی" پوربی زبان کے تمام اشعار کے نیچے لفظی ترجمہ اردو میں سُرخی سے ہو۔ بعض اشعار میں ایسا بھی کیا ہو کہ اگر پوربی کا کوئی مشکل لفظ آگیا ہو تو صرف اسی لفظ کے معنی سرخی سے لفظ کے نیچے لکھ دیے ہیں اس حکایت میں کل بارہ شعر ہیں۔

دوسری حکایت : "حکایتِ جواب وسوال فرعون وشیطان درزبانِ پنجابی" اس میں کُل بارہ شعر ہیں۔ ہر شعر کے نیچے مشکل الفاظ کے معنی سُرخی سے لکھے ہیں۔

تیسری حکایت "حکایت دو پوربیہ کہ باہم یار بودند درزبانِ پوربی" اس میں کل آٹھ شعر ہیں۔ آخری چار اشعار کے مشکل الفاظ کے معنی سُرخی سے دیے ہیں۔

چوتھی حکایت "حکایت پر بہیہ بے عقل درزبان پوربی۔ اس میں کُل پانچ شعر

ورق ۲/و پر یہ لکھا ہے: "نسخۂ پنجم نورتن رنگین کہ مشہور بہ مجموعۂ رنگین' است کہ در ہفدہ زبان نظم شدہ تصنیف سعادت یار خاں رنگین

ورق ۲/ب اور ورق ۳/و سادہ ہیں۔ ورق ۳/ب سے 'غزل فارسی' شروع ہوتی ہے جس کے کل آٹھ شعر ہیں۔ دوسری غزل 'غزل در زبان ریختہ' کل سات شعر

(۳) غزل 'در زبانِ پنجابی' کل پانچ شعر ہیں۔ بین السطور سرخی سے معنی بھی دیے ہیں۔

(۴) 'غزل در زبانِ ہندی کشمیری کہ تازہ از کشمیر آمدہ باشد و بدانست خود ہندی خوب می گفتہ باشد و در ہندی گفتگو کند' کل پانچ شعر ہیں۔ بین السطور سُرخی سے معنی بھی دیے ہیں۔

(۵) غزل فارسی۔ کل دو شعر ہیں۔ اُردو میں ترجمہ نہیں ہے۔

(۶) غزل زبان اردوئے معلّٰی۔ کل سات شعر ہیں۔ اس کے بعد ورق ۱۰/ب پر پانچ شعر ہیں جن کے عنوان نہیں دیے ہیں لیکن یہ شعر ترکی زبان کے معلوم ہوتے ہیں۔ بین السطور فارسی میں لفظی ترجمہ سرخی سے ہے۔ پہلا شعر

غیر البیدین بسکہ سینین ایجد ینگ شراب کو ثیدے کونگلم الدے بہ عزم کباب

(از دستِ غیر کہ خوردی شراب) (سوخت دل من و جگر من شد کباب)

(۷) غزل در زبان اُردوئے معلّٰی کُل دس شعر ہیں۔

ورق ۱۱/ب سادہ ہے، اس کے اخیر سے 'غزل فارسی' شروع ہوتی ہے جس کا صرف پہلا شعر اس ورق ۱۱/ب کے آخر میں لکھا ہے۔ کُل چھ شعر ہیں۔

(۸) 'غزل فارسی' کُل پانچ شعر ہیں۔

(۹) 'غزل در زبان اردوئے معلّٰی' کُل چھ شعر ہیں۔

(۱۰) 'غزل فارسی' کُل پانچ شعر ہیں۔

(۱۱) "غزل فارسی"۔ کُل پانچ شعر ہیں۔

(۱۲) غزل زبان اردوئے معلّٰی، کُل آٹھ شعر ہیں۔

(۱۳) "غزل زبان ترکی"، کُل پانچ شعر ہیں۔ بین السطور سرخی سے فارسی میں ترجمہ ہے۔

(۱۴) "غزل اردوئے معلّٰی"، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۱۵) "غزل بہ زبان بیگمات شاہ جہاں آباد یعنی ریختی ایجاد بندہ درگاہ"، کُل پانچ شعر ہیں۔ مشکل الفاظ کے معنی بین السطور میں سُرخی سے ہیں۔

(۱۶) "غزل فارسی"، کُل دوسو شعر ہیں اس کے بعد جگہ چھُٹی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رنگین اسے پُورا کرنا چاہتے تھے۔

(۱۷) "غزل زبانِ فارسی"، کُل چھ شعر ہیں۔

(۱۸) "غزل ہندی توشیح کہ ازاں نام بر می آید بہ شرطے کہ اول حرف سرخی را بر زبان آوردہ باز مصرع بہ خوانند تا موزوں شود"، کل سات شعر ہیں۔

(۱۹) "غزل فارسی"، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۰) غزل توشیح[1] در زبان اردوئے معلّٰی کہ ازاں نام بر می آید اول حرف سرخی را باید خواند تا مصرع موزوں شود"، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۱) "غزل در ہندی انگریزہائے نو آمد کہ از ملازمان خود در ہندی زبان گفتگو می کنند و می فہمانند"، مشکل الفاظ کے معنی سرخی سے بین السطور دیے ہیں۔ کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۲) "غزل فارسی"، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۳) "غزل قطعہ بند بہ طور حکایت در زبان ریختہ برائے خواندن زنہائے طوائف در قصیدان"، کُل پانچ شعر ہیں۔

---

[1] آرایش کرنا، نام ایک صنعت شعری کا کہ ہر مصرع یا بیت کے حرف اوّل کے جمع کرنے سے کسی کا نام پیدا ہو۔

(۲۴) غزل در زبان ہندی اہلِ خطّہ یعنی کشمیری نو آمد کہ باہم از مردم ہند در ہندی گفتگو می کند۔ بین السطور مشکل الفاظ کے معنی سرخی سے اردو میں لکھے ہیں۔ کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۵) ، غزل در زبان اُردوئے معلّٰی ، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۶) اشعار در زبان پچادہ ہائے پنجاب یعنی گنوار ' ہر شعر کے نیچے سُرخی سے مشکل الفاظ کے معنی اُردو میں دیے ہیں۔ کُل دو شعر ہیں اور تھوڑی سی جگہ چُھٹی ہوئی ہے۔

(۲۷) ، غزل در زبان اُردوئے معلّٰی ، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۲۸) غزل در زبانِ بیگمات شاہ جہاں آباد یعنی ریختی ایجاد بندہ ، کُل دس شعر ہیں۔ مشکل الفاظ کے معنی بین السطور سرخی سے دیے ہیں۔

(۲۹) ، غزل در زبان اُردوئے معلّٰی ریختہ ، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۳۰) ، غزل فارسی ، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۳۱) غزل در اصطلاحات زبان افغان بچّہ ہائے رام پور و مئو کہ رند مشرب و اوباش وضع اند ، کُل آٹھ شعر ہیں۔ بین السطور مشکل الفاظ کے معنی سرخی سے دیے ہیں۔

(۳۲) ، غزل در زبان اُردوئے معلّٰی بہ قیدِ حروف 'عضو ' معۂ تعریف کہ از الف تا یا ست از حرف کہ آغاز لفظ عضو است از ہماں حرف شروع لفظ تعریف است اگرچہ لطفے ندارد مگر ایجاد بندہ است۔ کُل پانچ شعر ہیں۔

(۳۳) ، غزل در زبان اُردوئے معلّٰی ہر جا کہ حرفِ سرخ مفرد بیاید آں را بر زبان راندہ باید خواند تا مصرع موزوں شود ؛ کُل پانچ شعر ہیں۔

(۳۴) ، غزل دویم بہ دستور ، کُل پانچ شعر ہیں۔

(۳۵) غزل ہزل قطعہ بند در زبانِ ریختہ برائے تفننِ طبع یارانِ اوباش وضع رند مشرب یعنی چھوٹی امت، کل سات شعر ہیں۔

(۳۶) غزل اردوئے بیگمات شاہ جہاں آباد بہ طور قطعہ بند در مقدمہ نیاز دادن حضرت فاطمہ علیہ السلام،

(۳۷) غزل فارسی، کل دو شعر ہیں۔ کچھ جگہ چھٹی ہوئی ہے۔

(۳۸) غزل در زبان ریختہ در صنعت قافیہ ہائے غلط برائے خاطر یاران چھوٹی امت بہ زبان اجلاف شاہ جہاں آباد، کل پانچ شعر۔

(۳۹) غزل در زبان پنجابی کھترانی ہا بہ نہایت عجز و انکسار و نرمی زبان بسیار خوش آئیند، کل پانچ شعر ہیں۔ بین السطور مشکل الفاظ کے معنی سُرخی سے دیے ہیں۔

(۴۰) غزل بہ طور نفی اثبات و صنعت قلب در ہر مصرع۔ کُل سات شعر۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع کے آخر میں جو لفظ آیا ہے وہی دوسرے شعر کے شروع میں ہے اور جو لفظ پہلے مصرع کے آخر میں ہے وہی دوسرے مصرع کے شروع میں ہے —— پہلا شعر ؎

وہ کہے ہے مجھے تیرا غم ہے   غم نہیں اس کو یہ اس کا دم ہے

(۴۱) غزل پشتو در زبان افغان ہا و لایت زا یعنی در لہجہ ولایت آں ہا، کل پانچ شعر ہیں۔ اعراب لگے ہوئے ہیں اور بین السطور سرخی سے اُردو میں معنی دیے ہیں۔

(۴۲) غزل در زبان ریختہ در بحر رباعی، کل نَو شعر ہیں۔

(۴۳) غزل ریختہ زبان برائے خواندن رقصیدن زن ہائے طوائف برائے خاطر یاران، کُل سات شعر ہیں۔

(۴۴) ' رباعی تجنیس در چہار زبان ترکی، فارسی، پشتو اور ہندی ' مشکل الفاظ کے معنی اردو میں بین السطور دیے ہیں۔

(۴۵) ' رباعی در زبانِ ریختہ صنعتِ تقلیب '

(۴۶) ' رباعی زبانِ ہندی ریختہ '

(۴۷) ' رباعی بہ زبانِ پنجابی بچادہ ہا یعنی بیرون شہری ' اردو میں بین السطور لفظی ترجمہ دیا ہے۔

(۴۸) ' رباعی زبان ریختہ '

(۴۹) ' رباعی در زبان اردوئے بیگمات یعنی ریختی '

(۵۰) ' رباعی در زبانِ ریختہ '

(۵۱) اشعار در صنعتِ تجنیس و گنگا جمنی بہ طرزِ امیر خسرو یک مصرع ہندی و دوم فارسی، کل چھ شعر ہیں۔

(۵۲) ' شعر فارسی در صنعت ردگرداں یعنی ہر مصرع تمام دو معنی پیدا کردہ باشد ' کل چھ شعر ہیں۔

(۵۳) ' شعر ہندی بہ زبان بیگمات ' کل سات شعر ہیں۔ ان میں ایک شعر پنجابی کا بھی ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی بین السطور دیے ہیں۔ ان میں ایک شعر شاہ عالم بادشاہ کی وفات کی تاریخ ہے۔ اور ایک شعر ایسا ہے جس کا ایک مصرع جرأت کا ہے اور ایک رنگین کا۔

دوسرا شعر در زبانِ ریختہ ہے۔

مصرع آخر ایں را جرأت شاعر گفتہ مشہور کردہ بود کہ ہر کس مصرع ایں بہم رساند ایں مصرع ثانی ہم از و باشد —— مصرع بندہ گفتہ

جی دھڑکتا ہے کہ بجنے کو گجر نزدیک ہے   پاس عصمت تا کجا اب تو سحر نزدیک ہے

اس کے بعد ایک شعر ہے جو رنگین نے خواب میں کہا تھا اور انھیں یاد رہا۔
پھر تاریخ تولد نورچشم اختر یار خاں کہ اختر تخلص می کند ازاں برمی آید۔
اگلا شعر پنجابی میں ہے اور آخر میں یعنی اس پنجابی شعر کے بعد تاریخ وفات
شاہ عالم بادشاہ ہے۔ اور ورق ۲۶ ب سے قطعات شروع ہوتے ہیں جو یہ ہیں۔
(۱) قطعہ تاریخ مسجد عموی صاحب و قبلہ نواب ترک جنگ بدل بیگ خاں کہ
درشاہ جہاں آباد تعمیر شدہ۔ کُل دو شعر ہیں۔ تاریخ رہ گو کعبہ دوجہاں
(۱۱۹۴ھ)
(۲) قطعہ درزبانِ پنجابی، بین السطور مشکل الفاظ کے اردو میں معنی بھی ہیں
کُل دو شعر۔
(۳) قطعہ عیدی در ہندی زبان۔ دو شعر۔
(۴) قطعہ تاریخ وفات امین بیگ ۱۲۲۹ھ دو شعر
(۵) درزبان مرہٹی۔ کل دو شعر ہیں لیکن فحش
(۶) قطعہ رقعہ کہ در شادی می نویسند آں را بندہ در شادی نورچشم نظم کردہ
نوشتہ بود۔ ایجاد بندہ است۔ کُل دو شعر ہیں۔
(۷) قطعہ در ہندی زبان ریختہ ۔ کُل چھ شعر ہیں۔
(۸) قطعہ در ہندی تضمین سعدی۔ کُل تین شعر ہیں۔
(۹) قطعہ درزبان ترکی۔ پشتو در تعریف شخصے کہ از ہر دو زبان آگاہ بود۔
کُل چھ شعر ہیں۔
(۱۰) قطعہ درزبان فارسی تاریخ مسجد برادر مہربان محمد قلی خاں درشہر نوح میوات،
کل دو شعر۔ بنا کرد مسجد بہ راہِ خدا ۱۱۹۷ھ
(۱۱) قطعہ زبان ہندی تاریخ وفات شاہ عبدالعزیز علیہ رحمۃ، کُل دو شعر ہیں ۱۲۳۹ھ

(۱۲) قطعہ زبان ہندی تاریخ وفات حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ رحمتہ کل دو شعر ۱۲۴۰ھ
دو قطعات کہے ہیں پہلے قطعہ کی تاریخ یہ ہے "در ہوا آج امام اعظم عہد" ۱۲۳۹ھ
دوسرا "شبلی ہند و جنید عصر تھا" ۱۲۴۰ھ
(۱۳) دو دو شعر کے چار قطعات ہندی در تضمینِ سعدی ہیں اور پانچواں قطعہ جو
تین شعر پر مشتمل ہے وہ بھی در تضمینِ سعدی ہی ہے۔
(۱۴) قطعہ تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ وزیر لکھنؤ دو شعر ۱۲۴۷ھ
(۱۵) قطعہ تاریخ وفات والدہ نواب ذوالفقار بہادر در شہر باندہ دو شعر
(دریغا ہائے ہائے ۱۲۴۶ھ)
(۱۶) قطعہ تاریخ شاہ عالم بادشاہ کہ آفتاب تخلص می فرمودند دو شعر
(غروب ہوا ۱۲۲۰ھ)
(۱۷) قطعہ ہندی در معاملہ اہلِ دنیا
(۱۸) قطعہ ہندی زبان در اظہار تصنیفات رنگین دو شعر
(۱۹) قطعہ دعائیہ نواب منظفر الدولہ بہادر
(۲۰) قطعہ تصنیف شرح سہ نثر ظہوری فرمودہ محمد ہادی صاحب۔ کل
سات شعر
(۲۱) قطعہ تاریخ تولد نورچشم اختر یار خاں دو شعر اختر ۱۲۰۱
تاریخ ہا کہ در نثر اتفاق افتاد ، درج ذیل ہیں :۔
(۱) وفات حضرت صوفی شاہ آبادانی صاحب ۔ ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ
(۲) وفات حضرت والد نواب محکم الدولہ طہماس بیگ خاں ۱۲۱۷ھ
(۳) تاریخ تولد اختر یار خاں اختر ۱۲۰۱
(۴) تاریخ تولد نورچشم نواب یار خاں اول کہ سابق شدہ بود "آبرخوردار" ۱۲۱۴ھ
چوں بعد سہ سال قضا کرد این تاریخ شد "جا برخوردار" ۱۲۱۷ھ

(۵) تاریخ تولد نورچشمی فاطمہ خانم دختر ۱۲۰۴ھ
(۶) تاریخ وفات نواب حیدر بیگ خاں
(۷) تاریخ تولد نورچشم مرزا علی یار خاں عرف نواب یار جان ثانی۔
(۸) تاریخ نورچشمی کہ بہ خانہ اختر یار خاں تولد شدہ بسنتی خانم نام تھا ۱۲۳۹ھ
(۹) تاریخ تولد
تاریخ تولد نورچشمی محمدی خانم بہ خانہ اہلِ خانہ دویم بندہ ۱۲۴۴ھ
امین الدین خوش نویس کی تاریخ وفات (ہائے وائے ویلا امین الدین خوش نویس موئے)۔
تاریخ وفات نورچشم یعقوب بیگ عرف آغا مرزا بنیرہ بندہ درگاہ کہ درجنگ شہید شد ' آغا مرد '
ورق ۳۰ الف سے لے کر ورق ۳۱ الف تک تنیس تاریخ وفات و پیدائش نثر میں ہیں۔
ورق ۳۱ ب فقرہ ہندی تجنیس و رنثر کل دو ہیں۔
ورق ۳۲ الف سے لے کر ورق ۳۴ الف تک پہیلیاں ہی پہیلیاں ہیں۔
جو درج ذیل ہیں :۔
پہیلی ہائے نظم در ہندی زبان پوربی یعنی چیستاں
پہیلی دو شیشہ ساعت دونوں کے دو دو شعر ہیں۔
پہیلی جاروب یعنی جھاڑو ۸ شعر ہیں۔
ورق ۳۲ ب پر مندرجہ ذیل پہیلیاں ہیں۔
پہیلی مشک آہن گر صرف ایک شعر
پہیلی لعل کہ از ہر دو طرف خواندہ می شود صرف ایک شعر
پہیلی فالسہ صرف ایک شعر

پہیلی جفت ، دو مشک آہن گر۔ ایک شعر
دو نار اور ایک ہی پیو - سانس بھرت ہیں وہ بن جیو
پہیلی خشخاش معکوس در فارسی صرف ایک شعر
پہیلی آسمان و انجم صرف ایک شعر
پہیلی تسبیح " " "
" گولر " " "
" مشک سقہ " " "
" مستی " " "
" مہندی " " "
" درخت کیلا " " "
" نوروز " " "
" محرم و پستان ہا " " "
" چشم
" ہر دو مروارید نتھ و چنے یاقوت دو شعر
" پہیلی گاڑی دو شعر
" خصیہ و آلت " "

ضرب المثل ہائے نثر کہ آں ہارا پہیلی کردہ ام
پہیلی پالکی ۔ دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ
" جلالہ ۔ گوری کا جوبن چٹکیوں میں جاٹے ۔
سایہ ۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا
ترازو ۔ ایک پنتھ دو کاج ۔

تسبیح ۔ سو منھ اور ایک بات
بندوق ۔ چھوٹا منھ بڑی بات ۔
ورق ۳۴ ب سے لے کر ورق ۳۶ الف تک تین مخمس ہیں ۔
مخمس اوّل کہ مشہور ، نورتن رنگین ، است سبب ایں کہ نہ بند دارد و ہر بندش در زبان دیگر است ترجمہ اش در ہندی زبان نظم شدہ ۔
بند اوّل در عربی ۔ بند دوم در ترکی ۔ بند سویم در فارسی ۔ بند چہارم در پشتو ۔ بند پنجم در ریختہ ۔ بند ششم در مارواڑی ۔ بند ہفتم در مرہٹی ۔ بند ہشتم در پوربی ۔ بند نہم در پنجابی ۔
مخمس دوم در پنج زبان یعنی ہر مصرعش در زبان دیگر فارسی ۔ ترکی ۔ ہندی ، پنجابی بہ طرز حضرت امیر خسرو ۔ اس میں کُل پانچ بند ہیں ۔ تیسرا مخمس فارسی غزل شاہ حاتم ہے ۔ جس کے کُل پانچ بند ہیں ۔
ورق ۳۷ ب پر تیرہ دوہرے ہیں ۔ دوہروں کا پورا ورق کرم خوردہ ہے ۔
ورق ۳۸ الف پر کُل تین کبت ہیں ۔ یہ ورق بھی کرم خوردہ ہے ۔
ورق ۳۸ ب پر اشعار متفرقہ در صنائع بدائع ہیں جو تعداد میں آٹھ ہیں ، ان کے بعد شعر سادہ بے نقط ہیں ۔

کرو اس دردِ دل کو دُور آکر دوا لاؤ کرو مسرور آکر

ورق ۳۹ الف پر شعر صنعت کہ ازاں تخلص رنگین برمی آید یعنی در نوشتن کہ لفظ یار می نویسند حرف رے بر آخرمی آید گویا آں پائے یار است ہر گاہ رے را اوّل لفظ نگیں بہ نویسند رنگین خواندہ می شود ؎

گر لگے سر سے نگیں کے پائے یار تو تخلص ہوئے رنگیں آشکار

دیوان کا آخری شعر یہ ہے ؎

جو رنگیں گاؤں کا ہو جائے سرپاؤں — تو بس چل نکلے گا رے چھوڑ کر گاؤں

اس دیوان کے کُل چالیس ورق ہیں۔

مجموعے کا آغاز ۳۷ اشعار کے ایک قصیدے سے ہوتا ہے جو ٹیپو سلطان کی تعریف میں ہے اور سات زبانوں میں ہے۔ یہ زبانیں اُردو، فارسی، ترکی، برج، مارواڑی، پنجابی اور انگریزی ہیں۔ مطلع یہ ہے ؎

حق تعالیٰ نے عطا کی ہے یہ تجھ کو سروری — ہیں نمک پروردہ تیرے آدم و جن و پری

مدح کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

نیک ہے تو کام ہے نیکی سے تجھ کو رات دن — ذات تیری ہے صغیرہ اور کبیرہ سے بری

ایک دن آیا تھا گستاخانہ تیرے سامنے — اب تلک اندام پر خورشید کے ہے تھرتھری

پیش لے جاوے سخاوت میں نہ حاتم تجھ سے گو — اور شجاعت میں کرے کب سام تجھ سے ہمسری

زور سے تیرے یقیں ہے مجھ کو یہ ہو جائے پست — کوہ پر مارے اُٹھا کر تو اگر ایک کنکری

اپنی قوت کا بیاں تیرے کرے گو رو برو — ایک دم میں دیو کی ہو جائے شیخی کرکری

سرو تیرے اس قدِ موزوں کو قمری نے سمجھ — بن کے جوگی ہے لیا اس اپنا کیا خاکستری

وہ ارسطو اور افلاطون کا اُستاد ہے — مشتری خلقت میں تیرے جو ہے ادنیٰ مشتری

مختلف زبانوں میں مدح کے اشعار یہ ہیں ؎

چاہیے کنگ فرنگ اپنے کو سمجھے وہ کوئی — جو کہ دروازے پہ تیرے ہو تلنگا سنتری

آج ہفت اقلیم میں تیرا کوئی ثانی نہیں — کس کی طاقت ہے کہ تجھ سے کر سکے وہ ہمسری

دیکھ تجھ کو فارسی میں بولتے ہیں اہلِ فارس — بچہ شیرے غضنفر سوتتے بیرے یزی

جوں سلیمان از طفیل کردگار ای کان جود — تابع فرمانت گردید آدم و جن و پری

ترک جتنے ہیں تجھے ترکی میں وہ کہتے ہیں یوں — نشاقلہ سُوں تنکری سنین بارچہ منا سے دیں بری

(رکھے تجھے خدا سب مصیبتوں سے الگ)

گو نکلو نکا انصاف قیل تپک سہ شبیہ کے بخو کہ
(دل میں منصف ہو تیری تصویر کھینچے کیوں کر)
مانی و بہزاد دینگ قیلسہ اگر صنعت گری
(مانی اور بہزاد اگر ہزار کریں صنعت)

اور جو افغان ہیں پشتو میں وہ یوں کرتا ہی عرض
لاس میں او نسہ زڑ خدا دے پارہ اوکرہ دل بری
(ہاتھ میرا پکڑ جلدی خدا کے واسطے کر دلاسا)

یہ زڑہ مسن اُدس خلمہ را غلدے دا خیال
(میرے دل میں اب آیا ہے یہ خیال)
مونکہ پہ استر کو دے سرکار اُد کرام چاکری
(میری آنکھوں پر اس سرکار کی کروں چاکری)

تو کو کہن برج میں انندی نت نند جی
(تجھے رکھیں آرام سے کنہیا جی)
یوں تجھے متھرا میں کہتے ہیں بجا کر بانسری

ہوں تھارو داس ہوں تو مو پہ کرپا راکھیو
(میں تیرا غلام ہوں مجھ پر اپنا کرم رکھنا)
تھارا جیلہ آپ کو جانت ہی راجہ بھرتری
(تمھارا اپنے کو جانتا ہی)

راجپوتانہ کا راجہ تجھ کو یوں لکھا ہی بھیم
مہیں کے ماتھے پر ہی ٹھاکر پاگ پہ تھیں دھری
(میرے سر پر صاحب پگڑی تم نے رکھی ہی)

مہیں کو تہن بیگی سماچار اپنا ماٹرا ور ملیو
(مجھے تم جلد احوال اپنا لکھ بھیجو)
راجپوتانے میں ٹھاکر تہیں کی راکھے ٹھاکری
(خدا تمھاری رکھے سرداری)

اور اہلِ ہند کہتے ہیں زباں میں اپنی یوں
دشمن دولت پر اس سرکار کے پڑیو مری
عیش و عشرت میں تو تب تک دہر میں قائم رہے
ہی جہاں میں جب تلک یہ مہر و ماہ و مشتری

مالکِ پنجاب یہ کرتا ہی تجھ سے التماس
ہن اسی گولی تری ٹھنڈی کچھ آکھو سانو چاکری
(ہم تیرے غلام ہیں کچھ فرماہیں خدمت)

بھلکے اوٹھ اوٹھ کرائے دیندے ہیں تینوں اوہ دعا
(صبح اٹھ کر ہم دیتے ہیں تجھے یہ دعا)
سائیں دنیا وچ رکھے کایم یہ تیری سروری
(اللہ دنیا میں قائم رکھے تیری سرداری)

قصیدے میں شاعری کے اعلیٰ درجے کے نمونے بھی موجود ہیں مثلاً ؎

پاک ہو ایک دم میں اس سے اس طرح میدانِ جنگ[1] گدلے پانی کو کرے ہو صاف جیسے پھٹکری
پا نہیں لگتا زمیں کو اس صبا رفتار کا[2] مثلِ بوئے گل نظر کب آئے گرد اس کے دری
وہ جو گھوڑا ہو ترا ایسا ہی وہ چالاک ہو جس سے ہو اندام پر بادِ صبا کے تھرتھری
اس پری توسن پہ تجھ کو دیکھ کر جن و بشر کہتے ہیں تختِ سلیماں سے ہو اس کو برتری
ماہِ نو آیا ہو یہ ابرِ سیاہ اوپر نکل یہ کجک[3] ہاتھی کے ماتھے پر نہیں تیرے ہری
اس کے ہودے[4] پر تجھے یوں دیکھ کر کہتی ہو خلق ابر پر ہالے میں ہو یہ ماہ کی جلوہ گری

مطلعِ ثانی اس طرح شروع ہوتا ہو ؎

کیوں نہ شاہانِ جہاں سے ہوئے تجھ کو برتری ہو جبیں سے آشکارا تیری شانِ حیدری
میں فلک کے ہاتھ سے تجھ پاس لایا ہوں پناہ ای کرم گستر کرم سے کر تو میری دل بری
اس کمینہ نے مجھے یوں دام میں گھیرا ہو اب جس طرح سے شیر کو باور میں گھیرے باوری

اگلے چند اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ رنگین ٹیپو کی خدمت میں باریاب ہونے کے لیے شاہ جہاں آباد سے دکن پہنچے تھے۔ اور اس زمانے میں مالی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ ٹیپو ۱۱۹۶ھ میں تخت نشین ہوا اور غالباً اس کے کچھ عرصہ بعد ہی رنگین ٹیپو کی خدمت میں پہنچے ہوں گے۔ 'مجالسِ رنگین' سے معلوم ہوتا ہو کہ ۱۲۰۳ھ میں شاہ عالم نے رنگین کے والد طہماسپ کو ایک سفارتی مہم پر بھیجا تھا جس میں رنگین بھی شامل تھے۔ 'مسدسِ رنگین' سے معلوم ہوتا ہو کہ ۱۲۰۷ھ میں رنگین بنارس سے لکھنؤ واپس آئے تھے اس لیے ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۰۷ھ کے درمیان رنگین نے جو مختلف سفر کیے ہیں انھیں میں دکن کا یہ سفر بھی شامل ہو۔ اس سلسلے میں رنگین لکھتے ہیں ؎

بندہ پرور یہاں تلک شاہ جہاں آباد سے خضرِ قسمت لے مرے کی ہو یہ میری رہبری

---

[1] یہ شعر تلوار کی تعریف میں ہو [2] یہ گھوڑے کی تعریف میں ہو [3] فیل بانوں کا آنکس [4] ہودہ۔

جو درِ دولت تلک پہنچا ہے بندہ آن کر | کر کے طے سب راہ کوہ و خشکی و دشت و تری
منزلِ مقصود تک پہنچوں بھلا کس راہ سے | سدِّ راہ آ کر ہوئی ہے قبلۂ من بے زری
ہاں مگر عقدہ یہ وا ہو تیرے دستِ جود سے | در پئے تخریب ہے ورنہ یہ چرخِ چنبری
ایک دم کے بیچ ہو جاتا ہوں مالا مال میں | گر نگاہِ لطف ادھر کو پرتوِ افگن ہو ذری
قدر داں ہے شعر و شاعر کا تو ہی تیرے سوا | کوئی جنسِ نظم کا ہر گز نہیں ہے مشتری[1]

قصیدے کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

یعنی ٹیپو شاہ کی خدمت میں چل کر کر یہ عرض | وصف تیرا کیا لکھے رنگیں بہ قولِ انوری
ختم شد بر تو سخاوت بر منِ مسکیں سخن | چوں شجاعت بر علیؑ بر مصطفےؐ پیغمبری

اس مجموعے میں تین حکایتیں پوربیوں کے متعلق ہیں۔ دلی والے پورب کے لوگوں کو بے وقوف اور ان کی زبان کو وحشیوں کی زبان کہتے تھے، چناں چہ دوسری حکایت کا عنوان (حکایتِ پوربیہ بے عقل در زبانِ پورب) ہے۔ ان تین حکایتوں میں پہلی حکایت ایک پوربیے اور اس کی بیوی کی ہے جسے رات میں قزاقوں نے لوٹ لیا تھا اور اس کی بیوی اور وہ واویلا کر رہے تھے۔ حکایت کا آخری حصہ زیادہ فحش ہے۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں ؎

پوربیا جاتا تھا رستے میں چلا | اس کو قزاقوں نے آ غارت کیا
جورو اس کی ساتھ اس کے آہ تھی | یعنی اس لٹنے میں وہ ہم راہ تھی
بعد غارت پیٹ کر رنگیں وہاں | یوں لگا کرنے وہ رو رو کر بیاں
ڈوم چھلّا سگ گوا ہو تام تام | اور ٹپکیا بھی چھینی ہو مور رام
(گہنا پاتا سب گیا ذرہ ذرہ) | (بندرق | اے میرے)

---

[1] خریدار

اس کٹھن بپتا میں ہوں کت جاؤں گو ڈھنگ نہیں پیسا کہا کر کھاؤں گو
(ایسی مصیبت میں کہاں جاؤں گا) (پاس مال نہیں کیا کھاؤں گا)
نتھ اسے دی اس کی جورو نے نکال اور کہا ہے بیچ گنوہے تو رہ مال
ہر ہرا ہٹ کا ہے پورب جائی بو بیچ نتھنی کا گھنے دن کھائی بو
(گھبراتا کیوں ہے جائیں گے) (نتھ کو بیچ کر مدت تک کھائیں گے)

دوسری حکایت دو پوربیوں کی ہے جو ساتھ ہی کھانا پکار ہے تھے ایک رفع حاجت کے لیے گیا اور دوسرا سالک رام کی پوجا میں لگ گیا۔ کتا کھانا کھا گیا۔ دونوں کا مقابلہ پوربیوں کی زبان میں لکھا ہے۔

تیسری حکایت پوربیوں کی زبان میں محرم کی ایک نقل ہے ؎

پوربیہ ایک بہت تھا بے عقل وہ لگا کرنے محرّم کی یہ نقل
کہ کہیں عشرے کی جو مجلس میں گوا تو وہاں رنگیں اچنبھا یہ ہُوا
کہ منئے ایک کتبوا لے کے اپنے پرکھاں کو گاری دے کے
(مرد کتاب لے کر) (بڑوں کو گالیاں دے کر)
بیٹھ بنبر پہ منائے جھورت ہے روئے کے چنگی سی ایس چھورت ہے
(منبر پر خوب ہلتا ہے) (رو کر چنگاری ایسی چھوڑتا ہے)
کہ جو بہنیا میں ہیں بوڑھے بارے سو وہ چھپاٹیے اوٹھت ہیں سارے
(زمین لڑکے) (چلائے اٹھتے سب)

ان حکایتوں کے درمیان ایک حکایت "فرعون اور شیطان" کے مکالمے کی پنجابی میں لکھی ہے ؎

عکل تھوں فرعون جو مجبور سی ہک دن اس دے ہتھ وچ ہک انگور سی
(عقل معذور تھا) (ایک دن اس کے ہاتھ میں ایک انگور تھا)

آکھیا دسنے اینو کہ اوہ انزعام پائے — جو کہ ہس انگور نو موتی نترائے
(کہا اس نے یوں کہ وہ انعام — (اس کو — بنائی)
آیا کچھ جو دھیان وچ شیطان دے — بنڑ گیا اوہ شکل ہک انسان دے
دس پر وس نے کچھ کیتا جو دم — ہوئے گیا موتی داد نڑا ہو عدم

آکھیا اینو فرعون نے حیرت وچ آ — دے بھراؤ ڈاڈھا گجب اوہ تیں کیتا
(کہا یوں میں) — (او بھئی بڑا غضب یہ تو نے کیا)

پنجابی میں ایک غزل بھی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :-

وہ میڈے دل نوں لگ پیا کی کو ائیں طالدا — گاہک ہر ایک ہوندا ہے مفلس دے مال دا
(وہ دل کو لگ پڑا کس طرح ٹالتا) — (خریدار ہوتا ہے — کے کا)
بوہے اوتے کھلوتا ہاں ہمالم کھدا نوں مان — کیوں شناشتہ ہو کتل نو ساڈے نکال دا
(دروازے پر کھڑا ہوں ظالم خدا کو مان) — (تر وار قتل کو ہمارے ہے نکالتا)

اس کے بعد ایک غزل "غزل در زبان ہندی کشمیری کہ تازہ از کشمیر آمدہ باشد و بدانست خود ہندی خوب می گفتہ باشد و در ہندی گفتگو کند" کے عنوان سے ہے:

گفتگو میں مرا ایک کاشو جو بات بَرا — وس نے پھنکار دیا دُو یمنی ایک لات بَرا
(کشمیری بڑھی) — (اس نے ماردی چار بنہ میں میرے
دکنگری توتا مراتب شُہراجان دیسے — وس کو بکری اوتار ہم نے لیا ہات برا
(منقل لوٹا لیجا ادسے) — (اوس کے ہاتھ بڑھا کر)
محبت سب سے ہے تجھ کو مُروت ہم کو نہیں — کبھو کو ہوتا ہے دن اور کبھو کو رات
(الفت سے تجھے ہے مگر ہم سے نہیں) — (کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات)

اس کے بعد ترکی میں ایک غزل ہے جس کا کوئی عنوان نہیں۔ ترکی الفاظ

پر اعراب بھی لگے ہوئے ہیں ؎

غیر الیدین ئبن کہ سین اچیدینگ شراب | کوئیدی کو نکم الدی بغرم کباب
(از دست غیر کہ خوردی شراب) | (سوخت دل من و جگر من شد)
(نامہ برنامم دی اِبلتب یا رمنہ | بنزیبہ آندین کیلتور جواب
(نامہ مرا بودہ رساندہ) | (جلد از یار جواب یار)
ساقیہ تنگری اُو چوں بنوکن ایاغ | اُو کمسنہ ضائع بو کیچہ ماہ تاب
(برائے خدا بدہ جام) | (نہ شود کہ ضائع شود شب ماہ)

ترکی میں ایک غزل اور بھی ہے

برچہ حالم دی بیلا رسین او بیلما غینک نہ دور | گاہ در دم تپیش سن سین اوزوالما غینک نہ دور
(حال احوال من می دانی ایں نہ دانستی چیست | (گاہے مرا دمن نہ میری ایں مرہم شدن چیست

مجموعے میں اُردوئے معلّٰی کی مثال ان غزلوں سے ظاہر ہوتی ہے ؎

خاک کو باغ میں چھلنے گی صبا میرے بعد | پر کھلیں گے نہ تیرے بند قبا میرے بعد
غم نہیں مرنے کا اپنے مجھے یہ سوچ ہے آہ | کون اُٹھاوے گا ترے جور وجفا میرے بعد
غل ترے قتل کا ایسا ہی پڑا عالم میں | شور ایک حشر کا برپا ہی رہا میرے بعد
گو جفا پیشہ تھا بھر عُمر وہ روتا ہی رہا | جس نے احوال مرا تیرا سُنا میرے بعد
میں تو ناکام گیا پر یہ دعا ہے میری | دے محبت کو نہ تاثیر خدا میرے بعد
کوئی واقف نہ ہوا چاہ سے میری اس کی | بھید لوگوں پہ یہ مدت میں کھلا میرے بعد
اعتبار اپنا تو کھوتا ہے یہ غم ہے مجھ کو | میرا کرتا ہے جو لوگوں میں گلا میرے بعد
تو نے پامال جو رنگین کو کیا اس نے کہا | رنگ ایسا نہیں دینے کی حنا میرے بعد

وہاں سے آئے تھے کچھ نہ ہم لے کر | پر چلے یہاں سے لاکھ غم لے کر
سارے اقرار تیرے جھوٹے ہیں | کیا کریں تجھ سے ہم قسم لے کر

رہ روانِ عدم ٹھہر جاؤ	ہم بھی چلتے ہیں ساتھ دم لے کر
ان سے کر خوف تری محفل سے	اُٹھ گئے جو کہ چشم نم لے کر
غش ہیں جو چشمِ مست کے رنگیںؔ	کیا کریں گے وہ جامِ جم لے کر

غزل توشیح در زبان اُردوئے معلّٰی کہ از اں نام بر می آید اوّل حـ
باید خواند تا مصرع موزوں شود ؎

مشہور پری زاد ہو تم	واللہ کچھ ایجاد ہو تم
تمھیں حُسنِ خداداد ہے یہ	یہ ہے عشق کی بنیاد ہو تم
بہت دور ہو اپنے نزدیک	یقیں ہے مجھے بیداد ہو تم
گو اور ہیں لاکھوں معشوق	میں صید ہوں صیاد ہو تم
سر ہر مصرع سے لوں رنگیں حرف	نام پھر نکلے تو اُستاد ہو تم

(موتی بیگم

شاہ جہاں آباد کی بیگمات کی زبان یعنی ریختی میں جسے رنگین ایـ
ایجاد بتلاتے ہیں ان کا پُورا دیوان موجود ہے۔ اس مجموعے میں بھی دو غز
نمونے کے طور پر اسی زبان میں لکھی ہیں ؎

تانس کر باجی نے جب میری پڑھائی لشواز	میں نے تب پیز سے وہ ٹکڑے سارا اُڑائی
کُرتی انگیا ہی مجھے بھاتی ہے ہلکی پھلکی	کیوں مرے واسطے باجی نے سلائی لشـ
تو دوا ایک ہے اللہ رے او حرفت باز	قادری مانگی تھی تو دوڑ کے لائی لشـ
بڑھنی اُدجلی نے ایک آن کے قصہ ناندھا	اس سے وہ بندی نے دھانی جو دُھلائی

ارے لوگو چھپا جنائی کو	لائے کوئی بُلا جنائی کو
میری پسلی میں ہوک اُٹھتی ہے	کہے کوئی یہ جا جنائی کو
بے کلی سی ہے آج ملواؤں	پیٹ اپنا دکھا جنائی کو

درد کھاتی ہوں میں مروڑے کا غم نہیں کچھ مرا جنائی کو
بچہ سیدھا ہی یا کہ ہی پایل نہیں معلوم کیا جنائی کو
پانچوں کپڑے بدن کے میں اپنے دوں گی چلا نہا جنائی کو
زہر لگتی ہی مجھ کو اچوانی میں پیوں گی بلا جنائی کو
نہیں دیتی ہی مجھ کو گاڑھا کیوں دوں میں کیا کیا بتا جنائی کو
آکے رنگیں میں تیرے پاؤں پڑوں ذرا آنکھیں دکھا جنائی کو

ان غزلوں کے علاوہ بھی ریختی کے کچھ اور نمونے شامل ہیں۔

اس مجموعے میں رنگین نے زبانِ ریختہ کا بھی نمونہ دیا ہی جس سے ان کی مراد زبانِ قدیم ہی جس میں آئیاں، جائیاں کثرت سے استعمال ہوا ہی اس کا نمونہ یہ ہی ؎

میں نے جو کل رنڈیاں مجرے کو بلوائیاں ڈولیوں میں بیٹھ بیٹھ کر وہ مرے آئیاں
شہرۂ آفاق تھیں گرچہ وہ سب خوب لیک دیکھ کے مجلس نئی پہلے تو شرمائیاں
ہونے لگی ان سے پھر جب کہ جگت اور ہنسی تب تو مزے میں وہ آ خوب سا گرمائیاں
طبلوں کا ملوا کے سُر اُٹھ کے انھوں نے وہیں دو ہری وہ سارنگیاں جس گھڑی چھڑوائیاں
بزم میں رنگیں عجب پھر تو سما بندھ گیا تری غزل رنڈیاں ناچ کے جب گائیاں

ایک اور غزل زبان ہندی میں ایک نو وارد کشمیری کے انداز میں ہی جو پہلے نقل ہو چکی ہی۔

معلوم ایسا ہوتا ہی کہ رنگین صرف زبانوں کے فرق ہی نہیں بلکہ لب و لہجہ اور مقامی اختلافات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ پنجابی کی غزل کے علاوہ ایک غزل پنجاب کے گنواروں کی زبان میں لکھی ہی جس کا نمونہ یہ ہی۔ ان کی

زبان میں ایک رباعی بھی لکھی ہی ؎

ہیر بھیڑی ہوئی رانجھے نو جو چاہا آہو — بیر جندڑی دے لیے وس نے وساہا آہو
(دیوانی — رانجھے کو جو چاہا ہاں) — (دشمن جان کے واسطے اپنے خرید سہاں)

رباعی

جو حشک دی پنڈ سر او تے چک داہی — ہتھ آندا نہیں کچھ اس دے اوہ تکدا ہی
(جو عشق کی گٹھری سر پر اٹھاتا ہی) — (ہاتھ آتا نہیں کچھ اس کے وہ تکتا ہی)
جس دی جیسی لگی گجر جاندی ہی — رنگین کملا ہو اینویں اوہ بکدا ہی
(جس کی جیسی محبت ہو گزر جاتی رہی) — (رنگین دیوانہ ہی یونھیں بکتا ہی)

اسی طرح رام پور اور مئو کے علاقے میں رہنے والے افغانوں کی زبان کا نمونہ اس طرح پیش کیا ہی ؎

تو جو غیروں کے پاس جاتا ہی — اوجی حضرت کسوں جلاتا ہی
(او شخص حضرت — قسم)
مانتا ہوں میں کھو پری کو تری — ہر گھڑی مجھ کو کیوں کھجاتا ہی
(سراہتا ہوں میں تجھے)
میں ہیں تجھ پہ فقط نہیں پیارا — زوئی مڑہ تو سبھوں کو بھاتا ہی
(تیرا بیٹا مرد)

پشتو میں بھی غزلیں لکھی ہیں چناں چہ ایک غزل کا مطلع ہی ؎

پہ هر سړي که خدا چه مهربان شئ — د ده هاغه مشکلونه اسان شئ
(جس شخص پر خدا مہربان ہو) — (اس کی سب مشکل آسان ہوں)

اس مجموعے کا ایک اہم حصہ مخمس ہی جو نو بندوں پر مشتمل ہی۔ اس میں بند اوّل عربی کا ہی۔ بند دوم ترکی، سوم فارسی، چہارم پشتو، پنجم ریختہ،

ششم مارواڑی، ہفتم مرہٹی، ہشتم پوربی، نہم بھی پوربی ہی میں ہے۔ دوسرے مخمس میں ایک مصرع ایک زبان کا اور دوسرا دوسری زبان کا ہے۔ ترکی زبان سے واقفیت کا اظہار ایک قطعہ سے ہوتا ہے جو ترکی و پشتو میں لکھا گیا ہے اور ایسے شخص کی تعریف میں ہے جو دونوں زبانوں سے آگاہ تھا اس کے تین شعر یہ ہیں ؎

کیمسنے سَرہ سَنِیْنَ کہتَّہ لکنکہ اَیتَمَاسَ	اگرچہ بارچہٗ تُرکیِ اَیکینْدَہٗ بُلسہٗ زمانَ
(کوئی تیری بڑائی کو نہ کر سکے بیان)	(سب اس کے بدن کے بال ہوں زبان)
سَنِیْنَ کہ تَنگیرِیْ بُوجَانْدَایْرَاِنِیْ اِیْرْکَا ایک	بُوبَخششے بُرتَہ سَنْگَا سِرْدے یُوخْتُورْ یلغَانَ
(تجھے جو خدا نے اس جگہ پیدا کیا سردار)	(یہ خوب ملک تجھے دیا نہیں جھوٹ)
تو رَار مُدام بُوسَاتِنْدَہٗ کیچہ وکُنْدُدُوْر	کِیَاْبْ جَبَاتَبِخَہٗ نَغفُر وقَیصر وخاقان
(کھڑا رہتا ہے تیرے دروازے پر دن رات)	(آکے خدمت میں تری فغفور و قیصر و خاقان)

مخمس جو "نورتن رنگین" کے نام سے مشہور ہے اور جس کے ہر بند کا ترجمہ ہندی میں ہے درج ذیل ہے۔

بند اول عربی ؎

قد سقانی البین کاسات الانتہاب	صار دمعی سایلا مثل السحاب
(جب دیے فرقت نے پیالے کو عناب)	(اشک چل نکلے مرے مثل سحاب)
اننی قد غصت فی فخر النیاب	مذ شربتم من ید الغیر الشراب
(مارا غوطہ میں نے حجاب)	(پی جو دست غیر سے تونے شراب)

وصطلا قلبی جوئی مثل الکباب
(جل گیا سب دل مرا مثل کباب)

دویم بند ترکی

نے لُوْرْدُوْرْ سِنِیْنْ مُوْنِیْ یَاذِیْبْ سنین عکیہ	یُوْخْتُوْرَ اُوْل یَاشُوْقْ بِیلَاْذْغَاْلَمْ ھَمَہٗ
(بوجھتا کتنا ہے لکھا ہے نہ کسے)	(کیا چھپا ہے جانے ہے عالم اسے)

بیرہ اِینَ یَا اللہ تیلہٗ سبِیَن مَرتَمہٗ   نامہ برنامہ دیئے اِبلتب دَمہہ
(دودل وہ شی یا اللہ تو ماں کے جسے)   (نامہ بر   مرا دے کر دسے)
رتیز بینہ آندِینَ اَلِیبِ کیلتو رجوَابَ
(جلد پھر اس سے مجھے لادے جواب)

سوم بند فارسی ے

بادل خورسند دارم سیر باغ   خاطر از اندوہ وغم دارد فراغ
(ہو خوشی دل سے بیستر سیر باغ)   (طبع کو اندوہ وغم سے ہو فراغ)
یار در بر تازگی دارد دماغ   ساقیا بہرِ خدا پُر کن ایاغ
(یار بر میں تازگی پر ہو دماغ)   (ساقیا بہرِ خدا بھر دے ایاغ)
می شود از دست سیر ماہ تاب
(ہاتھ سے جاتی ہو سیر ماہ تاب)

چہارم بند پشتو ے

مُونگ دَ تَلخدَمات کَے دُیے دُزسَوالَ   آورہ ظلمہٗ [1] بے چَندان محَالَ
(ہو مرا خدمت میں تیری یہ سوال)   (سُن لے ظالم یہ نہیں چنداں محال)
یَہ زِدَّہ مِینَ دَا دَرُونی دَاخیَالَ   اَدُس پہ خَلقت مزہ لِدلَن جَمَالَ
(اب مرے دل میں ہو آیا یہ خیال)   (اب تو خلقت کو دکھا اپنا جمال)
دُوکُوی بُوتہ کتہ لَسہٗ مَغ نَقَابَ
(اک ذرا سا اُٹھا منہ سے نقاب)

پنجم بند ریختہ ے

حیف یارو نوجوانی کا وہ سن   ایک دم رہتا نہ تھا ئیں عیش بن
(ہائے لوگو نوجوانی کا وہ سن)   (نیں نہ رہتا تھا کبھی عشرت کے بن)

---

[1] کرم خوردہ۔

مفت میں یونھی گئے گزرے وہ دن   آہ لپٹا اب بڑھاپا ہو کے جن
(کیا ہی ناحق میں لنگھے یوں ہیں دن)   (اب ضعیفی آن لپٹی بن کے جن)
کیوں نہ آوے یاد یہ عہدِ شباب
(یاد آوے کیوں نہ وہ عہدِ شباب)

ششم بند۔ مارواڑی سے

مہن میں تہن میں راڑہ کائیں چھےہاں   آؤ نہ ایتھین براجو ٹھاکراں
(کیا لڑائی ہم میں تم میں ہے ہاں)   (آؤ نہ بیٹھو یہاں اے مہمان)
چین آئے تہین نے ہیں جداہ دیکھ شان   دیکھا بن ہوئے کب کھا طرنشان
(چین آوے جب تمھیں دیکھوں عیاں)   (دیکھنے بن ہوئے کب خاطر نشاں)
چاہبا کی بھیڑ چھے ہو بے حساب
(ہے ہجوم عشق اب کچھ بے حساب)

ہفتم بند مرہٹی سے

ہے تمہتین تے مرہٹوں چاپیشوا   دادارے راکرٹے اَلااکرڑی اَلاَ
(تو تو ہے سب مرہٹوں کا پیشوا)   (او میاں ایدھر کو آ ایدھر کو آ)
ہمچا تمچا ہو رہیلیدار ہوا   منگا جی کو تھے داؤ کاڑا آنا
(ہم تو چاکر ہیں ترے اے رہنما)   (ہم سے اب ہو کر خفا ہر دم بھلا
کائی کرتس چا اکُلا ہے رے عتاب
(کہ تو کیوں کرتا ہے تو عتاب)

ہشتم پوربی سے

سیج سونی پیو بن ہم کا نہ بھات   جیو جوں بن نیر مچھری تڑپھرات
(سیج خالی اس کے بن بھاتی نہیں)   (جان کب   تڑپھاتی نہیں)

رین کاری داسنئے اب ہو ڈرات　　　کاٹے تورے من میں ہو کچھو نہ آت
(رات کالی بجلی پڑ جاتی نہیں)　　　(کیوں ترے اب دل میں کچھ آتی نہیں)

اس سے ہم کا کرت کا ہے کھراب
(اس طرح کرتا ہو کیوں مجھ کو خراب)

اگلا بند یعنی نواں بھی پوربی ہی ہو اور اسی بند پر مخمس ختم ہوتا ہو۔

مخمس دویم در پنج زبان یعنی ہر مصرعش در زبان دیگر فارسی، ترکی، ہندی، پشتو، پنجابی بہ طرز حضرت امیر خسرو

اے سخت دلت زسنگ خارا　　　ذَم دِئے اِیْشِیْتَ اِنَانَ خُدَا اَرا
(بات کو میری سُن کر مان برائے خدا)

مجھ کو ترے ہجر نے ہی مارا　　　اَوْ دَرَہٗ ظُلْمَتْ خدا دے یارا
(سُن اے جواں خدا کے واسطے)

سانو توساں دل سے کیوں وسارا
(ہم کو تم نے دل سے کیوں بھلایا)

کُل پانچ بند ہیں اور ہر بند کا آخری مصرع پنجابی زبان کا ہو۔

زبان دانی کے علاوہ اس میں بعض تاریخیں بھی شامل ہیں مثلاً ان کے بیٹے اختریار کی ولادت کی اور اپنے والد کی وفات کی تاریخ اس سے مل جاتی ہیں۔ ایک قطعے میں اپنی تصانیف کی تعداد بھی بتائی ہو ؎

کہا ایک شخص نے رنگیں یہ مجھ سے　　　تری تصنیف کہ نسخے ہیں کتنے
اشارہ لب کی جانب کرکے اس کو　　　کہا میں نے عدد لب[1] کے ہیں جتنے

---

[1] لب کے عدد ۳۲ ہیں۔

یہ نسخہ[1] رنگین نے خود ۱۲۴۹ھ میں لکھا ہو اس کے دو سال بعد ان کی وفات ہوگئی۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ ان کی زندگی کے آخری دور کا کارنامہ ہو۔ اس میں ۱۲۴۷ھ کے واقعات تک کی تاریخیں موجود ہیں۔ مثلاً نواب معتمد الدولہ وزیر لکھنؤ کی وفات کی تاریخ بھی ہو۔

معتمد الدولہ چو رفت از دنیا　　گشتہ زیں حادثہ بس افسردہ
ہاتفِ غیب بہ گفتار رنگیں　　معتمد مردہ ز دردِ گردہ

۱۲۴۷ھ

اس زمانے میں رنگین باندہ میں مقیم تھے۔ چناں چہ محمد ہادی نے باندہ میں سہ نثر ظہوری کی ایک شرح لکھی تھی اس کی تعریف میں رنگین نے سات اشعار پر مشتمل ایک قطعہ لکھا ہو۔ آخری شعر سے تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہو۔

کہی تاریخ تب یہ رنگیں نے　　شرح تصنیف محمد ہادی

لیکن 'مجموعۂ رنگین' کی تاریخِ تصنیف ۱۲۳۵ھ ہو جیسا کہ 'دیوانِ ریختہ' کے دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہو۔ معلوم ہوتا ہو کہ ۱۲۴۶ھ میں 'مجموعۂ رنگین' کا نسخہ نقل کرتے وقت متفرق اشعار اور قطعاتِ تاریخ وغیرہ اس میں شامل کرتے گئے جو اصل نسخے میں پہلے موجود نہیں تھے۔

اس مجموعے میں رنگین نے پہیلیاں بھی لکھی ہیں جن کی تعداد ۲۹ ہو۔

---

[1] تمام شد نسخہ نیچم ز ورتن رنگین کہ مشہور بہ 'مجموعۂ رنگین'، در ہفدہ زبان نظم شدہ تصنیف سعادت یار خاں رنگین پسر محکم الدولہ طہماس بیگ خاں بہادر اعتقاد جنگ زدمی در شہر باندہ بہ تاریخ ہفدہم ماہ ربیع الثانی روز دوشنبہ در عہد محمد اکبر شاہ بادشاہ جلوس ۲۹ مطابق ہجری ۱۲۴۹ بہ دستخط مصنف مذکور تحریر یافت۔

باب نہم

رنگین کا مرتبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں

کسی شاعر یا ادیب کے مرتبے کا تعین کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے کارناموں کا اس نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے کیا کہا ہی اور کس طرح کہا ہی۔ یعنی اس کے موضوع شعر و ادب اور اسلوب کا الگ الگ تجزیہ کرنا ضروری ہی۔ اس طرح شعر و ادب کے تاریخی پس منظر میں آسانی کے ساتھ اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہی کہ اس نے اس سرمایے میں کیا اضافہ کیا۔ متقدمین کی روایات سے کہاں تک استفادہ کیا اور آنے والی نسلوں کو اپنے کن تجربات' اختراعات اور ایجادات کا ورثہ چھوڑا۔ کہاں تک وہ زمانے سے متاثر ہوا اور کس حد تک اس نے اپنے ماحول اور جانشینوں کو متاثر کیا۔ اس کے شعر و ادب کی افادی حیثیت کیا ہی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی کیا اہمیت ہی۔ پھر شاعری اور ادب کے بعض فنی لوازمات ہوتے ہیں جنھیں عام طور پر ٹکنیک[1] کا نام دیا جاتا ہی۔ اس کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہی کہ ٹکنیک کے اعتبار سے شاعر کے فن کا کیا مرتبہ ہی۔ اور اس میں کس حد تک اس نے

[1] اصول فن

توازن اور تناسب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور سب سے آخر میں ہمیں شاعر کو اس کے معاصرین کے ساتھ پرکھنا پڑتا ہے تاکہ ان کے مقابلے میں اس کا مقام متعین کیا جاسکے۔

سعادت یار خاں رنگین کے کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ انھوں نے ستّر سال سے زیادہ شاعری اور ادب کی تاریخ میں جد و جہد کی۔ پندرہ سال کی عمر میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اور اسّی سال سے اوپر عمر پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ولی کی شمالی ہند میں آمد کے بعد اردو شاعری بالخصوص غزل کی نئی روایات دلی میں قائم ہو رہی تھیں۔ اور حاتم کے شاگردوں نے شعر و شاعری کی وہ محفل جمائی تھی جس کے دو درخشندہ ستارے سودا اور رنگین بھی ہیں۔ اس کے بعد ایہام گوئی کا طوفانی دَور آیا۔ جس میں شاعری کو صنعت کاری پر، سادگی کو تکلف پر اور اثر آفرینی کو مضمون آفرینی پر قربان کر دیا گیا۔ رنگین نے اس روایت کو مرتے اور اس دَور کو جنم لیتے دیکھا جس میں میر، مصحفی، درد، میر حسن اور انشا کی شہرت نے ان باکمالوں کو بقائے دوام کے دربار میں سندیں عطا کیں جن پر وہ آج تک متمکن ہیں۔ میر اور مصحفی نے غزل کی زمین کو آسمان بنایا۔ سادگی و پُرکاری، سوز و گداز، درد و اثر جیسا ان کی غزلوں میں ہے کہیں اور مشکل سے ملتا ہے۔ سودا نے قصیدے کو معراجِ کمال پر پہنچایا تو میر حسن نے مثنوی کو سحر کا مرتبہ عطا کیا۔ غرض ان تمام اصناف میں بظاہر ایسی روایات اور تحقیقات وجود میں آچکی تھیں جن پر اضافہ مشکل تھا۔ بایں ہمہ رنگین نے جو کچھ سرمایہ چھوڑا ہے اس سے وہ بھی ان باکمالوں کی صف میں آ بیٹھتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلے ہم ان کی قادر الکلامی پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ مختلف شعراء نے بہ یک وقت ایک سے زیادہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ایسے قادر الکلام شاعر بہت کم ہیں جنھوں نے ان مختلف اصناف میں یکساں شہرت یا کمال حاصل کیا۔ میر غزل کے ناخدا نہیں خدا ہیں۔ بلاشبہ خالص غزل گو کی حیثیت سے ان کے مرتبے میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ لیکن انھوں نے جو قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں وہ بس برائے بیت ہیں۔ قصیدے سے تو طبعًا انھیں مناسبت نہ تھی۔ مثنویوں میں بھی داخلی رنگ جو ان کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے بے حد نمایاں ہے۔ چناں چہ وہ مثنویاں جن میں انھوں نے ذاتی واقعات اور حوادث کا ذکر کیا ہے بلاشبہ اثر انگیز ہیں، لیکن ان کی عشقیہ مثنویاں جن میں 'شعلۂ شوق' اور 'دریائے عشق' بھی شامل ہیں، دوسرے درجے کی مثنویاں ہیں اور میر حسن کی سحر البیان یا شوق قدوائی کی 'زہرِ عشق' کے مقابلے میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ یہی حال سودا کا ہے کہ وہ مدح اور قدح کے بادشاہ ہیں انھیں خاقانی ہند کہیے یا انوری۔ ان کا سرمایۂ کمال بھی قصیدوں اور ہجویات پر مشتمل ہے بعض غزلیں اور بعض غزلوں کے بعض اشعار بلاشبہ بہت عمدہ ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی غزل گوئی میں ان کا وہی حال ہے جو قصیدے میں میر کا ہے۔ میر کا مقابلہ تو بڑی چیز ہے۔ خالص غزل گو کی حیثیت سے مصحفی، رنگین، انشا اور جرأت کا مرتبہ ان سے بلند نظر آتا ہے۔ رہی مثنوی گوئی اس کے بارے میں شیفتہ کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ "مرزا در مثنوی فکر معقول نہ داشت" یہ تنقید محض رسمی نہیں اس میں بہت کچھ صداقت ہے۔ سودا کے سارے کلام میں ایک مثنوی بھی ایسی نہیں جو اوّل درجے کی ہو۔ بعض مخمس بہت اچھے ہیں، لیکن وہ ایک الگ صنف ہے اور اس میں بھی ان کا موضوع قصیدہ یا ہجو ہے۔ ان

دونوں باکمالوں کے بعد اس دور کے مشاہیر میں مصحفیؔ آتے ہیں۔ مصحفیؔ کے کلام کا بڑا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور سوائے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب 'مصحفی' کے ان کے کلام کے نمونے بہت کم کہیں اور ملتے ہیں اس لیے ناقدین مصحفیؔ کے بارے میں ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے۔ مطبوعہ اور قلمی کلام[۱] کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غزلیں، مثنویاں اور قصیدے کہے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کی برابری کا دعویٰ کیا ہے، بلکہ خود کو ان پر ترجیح دی ہے۔ بلاشبہ وہ میرؔ اور سوداؔ کے مقابلے میں زیادہ 'قادر الکلام' نظر آتے ہیں لیکن غزل میں میرؔ، قصیدے میں سوداؔ اور مثنوی میں میر حسنؔ کے بعد ہی ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ان کے بعد خواجہ میر دردؔ آتے ہیں۔ کلام کی پاکیزگی، درد و اثر، سوز و گداز اور کیفیت کے لحاظ سے ان کا مختصر دیوان بڑے ضخیم دواوین اور کلیات پر بھاری ہے، لیکن ان کا یہ کمال بھی یہاں آکر رک جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو نہ بہ طور پیشہ اختیار کیا اور نہ محض تفنن طبع کے لیے اور نہ ان کا تعلق اس عہد کے مشاعروں اور درباروں کے ہنگاموں سے تھا اس لیے ان کے کلام کو محض ان کی کیفیات اور تاثرات سمجھ کر پڑھنا چاہیے اور بلاشبہ اس سے ان کے ذاتی میلانات اور رجحانات کے علاوہ اس عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول کا بھی پتہ چلتا ہے، لیکن شاعری بہ قول بعض ناقدین کے ان کے مرتبے کے شایانِ شان نظر نہیں آتی۔

رہے میر حسنؔ تو ان کی 'سحر البیان' کی شہرت نے ان کے دیگر کمالات پر ایسا پردہ ڈالا کہ لوگ ان کی غزلوں کو بھول گئے اور مولانا آزادؔ کو 'آب حیات' لکھتے وقت دس مکمل غزلیں بھی نہ ملیں کہ انتخاب میں شامل کرتے۔ اب کلیات

---

[۱] 'مصحفی'، از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء کلیات قلمی موجودہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری و انتخاب مصحفی مرتبہ حسرت موہانی و 'نگار مصحفی نمبر'

کے قلمی نسخے دست یاب ہو گئے ہیں لیکن سوائے نول کشور کے مطبوعہ 'دیوان میر حسن'
کے دو نسخوں اور تین مثنویوں 'سحر البیان'، 'گلزار ارم' اور 'رموز العارفین'
کے کلام کا بڑا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ بہرحال اس مجموعے سے اندازہ لگایا
جاسکتا ہے کہ وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے اور میر یا درد کے ہم پلہ نہ سہی،
مصحفی اور انشاء سے کچھ بلند مقام رکھتے ہیں لیکن ان کے اصلی جوہر واقعی
ان کی مثنویوں میں کھلتے ہیں جن کی تعداد سولہ کے قریب ہے۔

رنگین کے معاصرین میں، مشاہیر میں قابلِ ذکر انشاء اور جرأت رہ جاتے
ہیں۔ انشاء بلاشبہ بلا کے ذہین، طبّاع، حاضر جواب، شوخ مزاج اور
بدیہہ گو تھے۔ ان کی یہ شگفتگی، طبیعت کی اُپج اور ایجاد کا مادّہ ان کے
کلام سے جھلکتا ہے، لیکن ان کا مطبوعہ سرمایہ صرف اس کلیات تک محدود
ہے جس میں دیوان ریختہ اور دیوان ریختی، قصیدے اور چند چھوٹی چھوٹی
مثنویاں شامل ہیں اور ایک 'دریائے لطافت' ہے جس میں قتیل بھی ان
کے شریک ہیں۔ 'دریائے لطافت' بلاشبہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے ایک
اہم کتاب ہے کہ اس میں اُردو کی اصل، فصاحت و بلاغت کے معیار، اس
کی حدود، دلّی اور لکھنؤ کے محاوروں کی تحقیق کی گئی ہے۔ شاید دریائے لطافت،
انشاء کے کلام نظم کے مقابلے میں اس فضل و کمال کا زیادہ خوبی سے
اظہار کرتی ہے جس کے متعلق آزردہ کا یہ فقرہ مشہور ہے کہ انشاء کے فضل و
کمال کو شاعری نے اور شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے
ڈبو دیا۔ بلاشبہ میر، سودا، درد اور میر حسن کے مقابلے میں انشاء بہ حیثیت
مجموعی زیادہ علم، فضل اور دانش کے مالک ہیں، لیکن غزل میں وہ یقیناً
میر اور درد کے مقابلے میں دوسرے درجے پر آتے ہیں۔ قصیدے میں

اُردو شاعری کی تاریخ میں بے شک ان کا نہایت ممتاز مرتبہ ہے لیکن یہاں بھی سودا کا سا تنوّع اور قدرتِ کلام ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اگرچہ اس فن میں سودا کے بعد انھیں کا نام سب سے پہلے زبان پر آتا ہے لیکن افسوس کہ انشار نے اپنے فضل و کمال کو واقعی اس ماحول میں ڈبو دیا جو انھیں لکھنؤ میں نصیب ہوا، بلکہ جو انھوں نے کسی قدر دہلی میں اختیار کر لیا تھا۔ دلّی میں عظیم سے اور لکھنؤ میں مصحفی سے ان کے جو معرکے پیش آئے اور ان میں جو انداز اختیار کیا گیا اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ وہ فضل و کمال، شعر و شاعری ادب اور فن کو بالائے طاق رکھ کر پھکڑ، پھبتی، گالی اور مار پیٹ پر اُتر آئے اور یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے انشار کے کمالات صرف دُور سے ہی جھلک دکھا کر رہ جاتے ہیں۔

رہے جرأت ان کے بارے میں عرصے تک میر سے منسوب اس بیان کی شہرت رہی کہ وہ شعر کہنا نہیں جانتے تھے۔ صرف اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرتے تھے۔ معاملہ بندی کا انھیں موجد ٹھیرایا گیا، حال آں کہ اس معاملے میں ان کے علاوہ اور لوگوں کے دامن بھی پاک نہیں ہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ مومن کو ایسا ناقد ملا[1] جس نے مومن کو اس الزام سے بچانے کے لیے ان کی معاملہ بندی پر علمیت کا پردہ ڈال دیا اور لکھ دیا کہ جرأت بہ وجہ اپنی کم علمی کے کھل گئے۔ ہمیں جرأت کے کلام کے اس تجزیے سے اختلاف ہے۔ ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلیات[2] کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جرأت کا اصلی میدان غزل اور غزل میں بھی وہ واقعات اور واردات نہیں ہیں جن کا تعلق خاص طور پر عشقِ مجازی بلکہ کسی قدر جنسی لذت آفرینی

---

[1] دیوان مومن مقدمہ مرتبہ مولانا ضیار احمد [2] جرأت از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی و قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری و مطبوعہ نسخہ مطبع نا معلوم ملوکہ حفیظ ہوشیارپوری

ہے۔ اسے خواہ مضامینِ بوس و کنار کا نام دیا جائے یا معاملہ بندی کا لیکن دراصل اس کی بنیاد ایک خاص قسم کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت پر ہے جسے ہم لذت کوشی کا نام دے سکتے ہیں۔ اور جو جرأت میں ان کی بینائی سے محرومی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسِ کم تری کا اثر ہے۔ یہ ایک لمسیاتی قسم کی لذت ہے جو فنی نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ درجے کی چیز نہ ہو اس کے حقیقی اور موثر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس سرمائے کے علاوہ جرأت کے یہاں بھی اور کچھ نہیں ملتا۔

ان کے مقابلے میں رنگین کے کلام کا جائزہ لیجیے اور وہ بیانات سامنے رکھیے جو 'امتحانِ رنگین' اور 'رنگین نامہ' میں ملتے ہیں۔ اور جو پہلے نقل کیے جا چکے ہیں۔ محض نظم میں رنگین ستائیس[1] اصنافِ سخن گناتے ہیں اور ان اساتذہ کے بھی نام لیتے ہیں جنھوں نے ان اصناف میں استادی کا مرتبہ حاصل کیا۔ لیکن ایسا کوئی نہیں جس نے ان تمام ستائیس[2] اصناف پر بہ یک وقت طبع آزمائی کی ہو اور رنگین کا یہ دعویٰ کہ یہ فخر انھیں کو حاصل ہے بہ ظاہر ایک بہت بڑی تعلی معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے اس دعوے کے ثبوت میں کلام کا نمونہ پیش کر کے شبہے کی گنجایش نہیں رکھی ہے۔ پھر یہ کہ ان تمام اصناف میں ہر شاعر کا رنگ مخصوص ہوتا ہے لیکن یہ بات بہت مشکل ہے کہ ایک شاعر ان مختلف اصناف میں بھی مختلف طرزوں پر قدرت رکھتا ہو بلکہ خود بھی نئے طرز ایجاد و اختیار کر سکے۔ رنگین نے اس اعتبار سے شاعروں کی جو تعریف اور تقسیم کی ہے اور انھیں شاعر، اُستاد، ملک الشعرا اور علامہ کے طبقات چہار گانہ میں تقسیم کیا ہے وہ قابلِ غور ہے اور اس تقسیم کے مطابق رنگین ہی ایسے شاعر ہیں جو علامہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

رنگین کی قادر الکلامی اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کے علاوہ کسی دوسرے شاعر نے پانچ یا چھ زبانوں میں شعر نہیں کہے۔ 'مجموعۂ رنگین' میں سترہ[1] زبانوں میں شعر ہیں اور ان سب سے پتہ چلتا ہے کہ ان زبانوں پر رنگین کو واقعی بڑی قدرت حاصل تھی۔ اسی طرح ایک اور موقع پر رنگین لکھتے ہیں کہ سوائے جامی کے کسی نے سات بحروں میں مثنوی نہیں کہی۔ انھوں نے گیارہ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھی ہیں اور گیارہ بحروں میں لکھی ہوئی ان بیالیس مثنویوں کے اشعار کی تعداد بہ قول ان کے بیس[1] ہزار کے قریب ہوتی ہے۔ 'دیوانِ ریختہ'۔ 'دیوانِ بیختہ'، 'دیوانِ انگیختہ'۔ 'دیوانِ آمیختہ'، 'حدیقۂ رنگین'، اور دوسرے مجموعوں کے اشعار کی تعداد ان میں شامل کر لی جائے تو بلاشبہ یہ ذخیرہ اتنا ہو جائے گا کہ اس کا مقابلہ کسی دوسرے قدیم یا جدید شاعر کا کلام نہیں کر سکتا۔

لیکن محض تنوّع یا مقدارِ کلام کسی شاعر یا فن کار کے کمال کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر نے ہزاروں اشعار لکھے ہوں لیکن ان میں تک بندی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اُردو کا ایک بہت پرانا شاعر مُلّا وجہی اپنی 'قطب مشتری' (۱۰۱۸ھ) میں تعریفِ سخن کے عنوان سے لکھتا ہے :—

جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس ہے بہتر کہ یک بیت بولے سلیس

اس لیے شاعر نے جو کہا ہے اسے اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ کیا کہا ہے اور کیسے کہا ہے۔ ظاہر ہے ہزاروں اشعار میں جذبے اور بیان کا ایک ہی معیار قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہے اور آج بھی دنیا کے ادب عالیہ میں

---

[1] 'امتحانِ رنگین'

جن تصانیف کو شاہ کار اور شہ پاروں کا درجہ حاصل ہے ان میں بھی کہیں کہیں کوئی بات کھٹکتی ہے۔ میر تقی میر کی اُستادی میں کیا شبہ لیکن ان کے بارے میں یہ قول بھی اتنا ہی مشہور ہے کہ "بلندش بسیار بلند و پستش بہ غایت پست" اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ فن کار کو اپنی تخلیقات سے کچھ اس طرح کی محبت ہوتی ہے جیسے انسان کو اپنی اولاد سے اور وہ اپنے اچھے بُرے ہر قسم کے کلام کو اچھا ہی سمجھتا ہے۔ حالی نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ کلام میں اس طرح جو ناہمواری قاری یا ناقد کو نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو فن کار اور ناقد کے نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ ایک اور سبب یہ ہوتا ہے کہ اکثر شاعر خود اپنے کلام میں حک و اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ یہ ترمیم یا تبدیلی زبان، مضمون اور بیان میں ہر جگہ ہوتی ہے۔ مشاہیر شعراء کے کلام میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں کسی شعر کی آخری صورت اس کی ابتدائی شکل سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ غالب کے مروّجہ دیوان اور نسخۂ حمیدیہ کے مقابلے سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ اکثر شعراء اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے کلام کا خود انتخاب کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی شہادت خود رنگین کے استاد شاہ حاتم کا کلام ہے۔ جنھوں نے عمر بھر کے سرمایے سے دیوان کا انتخاب کرکے 'دیوان زادہ' مرتب کیا۔ رنگین نے 'دیوان ریختہ' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے دیوان کا انتخاب کیا اور ناہمواری کو درست کیا۔ یہ زمانہ بڑے سیاسی خلفشار، سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کا تھا۔ شاعر در بہ در مارے مارے پھرتے تھے۔ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے اور آئے دن درباروں کے قائم ہونے اور مٹنے کے

ساتھ ساتھ خود بھی گردش کرتے رہتے ۔ ان حالات میں انتخاب، نظرِ ثانی اور اصلاح کا وقت کیسے مِل سکتا تھا۔ پھر مشاعروں کے ہنگامے، شاعروں کے دنگل، آپس کے مقابلے روز نئے مسائل پیدا کر دیتے تھے۔ پُرانے کلام پر غور کی فرصت کسے تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ سوائے ایک میر دردؔ کے اِس دَور کے کسی اور شاعر کا کلام ایسا نہیں جو منتخب کہا جا سکے۔ دردؔ کی بات الگ ہے کہ وہ صوفی منش درویش تھے اور کلام کا مجموعہ بھی مختصر ہے۔ اس طرح یہ ناہمواری میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ سب کے یہاں نظر آتی ہے اور رنگینؔ بھی اس عیب سے پاک نہیں لیکن غزل، مثنوی، قصیدہ اور دیگر اصناف کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے اشعار کی تعداد اتنی ہے کہ رنگینؔ کو بلا تامّل مشاہیر کی صف میں لا کر بٹھایا جا سکتا ہے۔

وہ غزل میں میرؔ کے ہم سر نہ سہی۔ میرؔ کے بعد کسی غزل گو سے پیچھے نہیں۔ مثنوی میں ''سحر البیان'' یقیناً مثنوی کا منتہائے کمال ہے لیکن میر حسنؔ کے بعد بہ حیثیت مثنوی گو رنگینؔ کے مقابلے میں کسی دوسرے اُردو شاعر کو نہیں پیش کیا جا سکتا۔

رہا موضوعات کا سوال۔ اس اعتبار سے بھی رنگینؔ کا درجہ نہایت بلند ہے۔ غزل، مثنوی اور دیگر اصناف کے جائزے سے یہ نتیجہ نکالنا دشوار نہیں کہ ایک طرف تو انھوں نے مروّجہ اصناف کے عام رسمی مضامین اختیار کیے ہیں لیکن کلام کا بڑا حصّہ ذاتی تجربات، مشاہدات، واقعات اور واردات پر مبنی ہے۔ کہیں کہیں ان موضوعات کی اخلاقی اور افادی سطح بہت زیادہ بلند یا مستحسن نہیں رہتی لیکن ہمیں کم از کم ان کی صداقت اور

صاف گوئی کا اعتراف کرنا چاہیے اور انھیں اخلاقی معیار اور اخلاقی اقدار پرجانچتے وقت ان کے ماحول کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ماحول کی ترجمانی تو ہر شاعر کرتا ہی خواہ یہ ترجمانی بہت واضح ہو یا محض اشاروں اور کنایوں میں ہو۔ رنگین کا انداز اس میں منفرد ہی۔ ان میں جرأت اور بے باکی ہی۔ صداقت اور صاف گوئی ہی۔ اور اس طرح ان کے کلام سے اس عہد کی تہذیبی زندگی کی جیسی مکمل تصویر تیار ہوتی ہی ویسی کسی اور کے کلام سے مشکل سے ہوگی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہی رنگین اپنی ریختی کی وجہ سے ایسے بدنام ہوئے کہ ان کے کلام کے اچھے پہلو بھی نظر انداز کر دیے گئے۔ حال آں کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان کے یہاں ایسے موضوعات کی کمی نہیں جن میں تزکیۂ نفس، تصفیۂ اخلاق اور عارفانہ مسالک اختیار کیے گئے ہیں۔ اخلاقی مثنویاں، حکایات، نظمیں، منظوم رسالے جو رنگین کے کلام کے مجموعوں میں شامل ہیں، نوعیت اور مقدار کے اعتبار سے رنگین کو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میر حسن نے 'رموز العارفین' کے نام سے ایک اخلاقی مثنوی لکھی ہی۔ رنگین نے اردو اور فارسی میں ایسی بڑی ضخیم مثنویاں، اور چھوٹی نظمیں کثرت سے لکھی ہیں جن کی اخلاقی سطح بہت بلند ہی۔ خاص طور پر آخر عمر میں جب جوانی کی چڑھی آندھی اتر چکی تھی۔ طبیعت میں کسی قدر سکون پیدا ہوا تھا ایسے مضامین کی طرف ان کی توجہ زیادہ بڑھ گئی ہی۔ دیوان ہزل اور دیوان ریختی ۱۲۳۶ھ تک مکمل ہو چکے تھے اس کے بعد پندرہ سال جو ان کی عمر کا آخری حصہ ہی زیادہ تر ایسی مثنویوں پر ہی صرف ہوئے ہیں، ان کی مذہبی عقیدت، عارفانہ مسلک اور احساس ندامت جو آخر عمر کے کلام میں پایا جاتا ہی کسی حد تک ان عیبوں کا ازالہ کرتا

ہے جو ابتدائی دَور کے کلام بالخصوص ہزل اور ریختی کی بنا پر عائد ہوتے ہیں اس موقع پر ایک اور نکتے کی وضاحت ضروری ہے اور وہ رنگین کے کلام پر لکھنؤ کے اثرات ہیں۔ رنگین نے نو سال لکھنؤ میں گزارے اور آصف الدولہ کی وفات کے بعد یہاں سے چلے گئے۔ یہاں انھوں نے شاہ زادہ سلیمان شکوہ کی ان مجلسوں اور محفلوں میں شرکت کی جن میں مصحفی، انشاء اور جرأت بھی شریک تھے۔ یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ وہ اس سارے ماحول سے متاثر ہوئے ہوں گے جن سے انشاء اور مصحفی نے اثر قبول کیا تھا۔ ہم نے ان حالات کا زیادہ تفصیل سے جائزہ اس لیے نہیں لیا کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کا اعادہ صرف طوالت کا باعث ہوتا۔ مختصر یہ کہ ان حالات نے شاعری کو ڈبو دیا۔ فحش نگاری، ہجوگوئی اور ریختی کے لیے ایک موزوں ماحول تیار ہوگیا۔ لیکن یہ بات نہایت دل چسپ ہے کہ رنگین نے ہزل کا دیوان لکھنؤ سے نکلنے کے بعد کلکتہ کے سفر میں مرتب و مکمل کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جو اثرات آہستہ آہستہ وہ لکھنؤ میں قبول کرتے رہے تھے وہ یکایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ انشاء اور مصحفی کے مقابلے میں ان کے یہاں ہجوگوئی بھی کم ہے اور وہ کسی بڑے شاعرانہ مجادلے میں بھی اُلجھتے نظر نہیں آتے جیسے انشاء اور مصحفی کا حال ہوا۔ ان کی سب سے طویل ہجو "شبحۂ رنگین" ہے جس میں سو رباعیات الٰہی بخش معروف[1] کی ہجو میں ہیں۔ ایک رباعی انشا اور ایک آصف الدّولہ کے بارے میں ہے۔ کچھ متفرق اشعار اور ہیں لیکن ان سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فی الحقیقت یہ اشعار محض کسی وقتی جذبے کے تحت نظم ہوئے ہیں ورنہ ہجوگوئی مستقل فن کی حیثیت سے رنگین کے یہاں نہیں ہے۔

---

[1] برادر نواب اشرف الدولہ ساکن الور

رہا فحش گوئی کا معاملہ۔ اس میں بے شک رنگین کا دامن بڑا داغ دار ہے۔ اور یہاں وہ معاصرین سے زیادہ کھُل گئے ہیں۔ اس کی ذمّہ داری ایک طرف ان کے ماحول پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن دوسری طرف یہ ان کی خاص ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی پرورش امیرانہ ماحول اور رئیسانہ ٹھاٹ سے ہوئی۔ ساری عمر فارغ البال رہے اور معاش کا دار و مدار محض رئیسوں کی درباداری پر نہ تھا۔ سپاہیانہ پیشے نے انھیں اعلیٰ مراتب و مناسب تک پہنچایا۔ زمانے کی جس گردش نے میر اور مصحفی کی طبیعت میں مسکینی اور درویشی پیدا کی رنگین اس سے ہمیشہ محفوظ و مامون رہے۔ اس لیے اور بھی ان کی طبیعت میں اعتدال پیدا ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ہم ان کے کلام کا یہ حصّہ خارج بھی کر دیں تو باقی سرمایہ نہایت اہم باقی رہ جاتا ہے۔

رنگین کی شخصیت اور شاعری کا ایک اور اہم پہلو ان کی علمیت ہے یہ درست ہے کہ ان کی شاعری میں علم کا وزن اور وقار نہیں پایا جاتا۔ لیکن یہ حال غالب اور اقبال سے پہلے کی ساری اُردو شاعری کا ہے اور اس کی ذمّہ داری متقدمین شعراء کے نظریۂ فن پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس سے قطع نظر رنگین کی تصانیف سے اس کی قطعی شہادت ملتی ہے کہ وہ معاصرین کے مقابلے میں زیادہ علم و فضل کے مالک تھے۔ عربی، فارسی، ترکی اور اُردو میں ان کے کمال اور دست گاہ میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں۔ عربی قصیدوں کا ترجمہ جس صفائی اور خوبی سے انھوں نے کیا ہے اس سے اس کی شہادت ملتی ہے اور دیباچے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی کی درس و تدریس کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ ترکی میں وہ ایک

لغت کے مصنف ہیں۔ فارسی نثر و نظم کے بہ کثرت نمونے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہو کہ انھوں نے فارسی شاعری اور ادب کی مختلف اصناف اور مشاہیر کے کلام سے پورا استفادہ کیا تھا۔ اس سے ہٹ کر فن کے بارے میں ان کے واضح اور متعین تصوّرات تھے جن کا اظہار نثر و نظم میں جا بہ جا ہوا ہو۔ انھوں نے شاعروں اور ادیبوں کے مرتبوں کا تعین کیا ہو۔ ان کے طرز اور انداز کا تجزیہ کیا ہو۔ اس پر تنقید اور تبصرہ ہو اور اس میں انھوں نے بعض اوقات بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے میر یا مصحفی کی طرح شاعروں کے تذکرے نہیں لکھے لیکن اپنے کلام نظم و نثر میں معاصرین اور متقدمین کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہو انھیں یک جا کرلیں تو اچھا خاصا تذکرہ مرتب ہوسکتا ہو۔

رنگین کی طبیعت میں ایجاد کا مادّہ جس قدر تھا اس کی مثال سوائے نظیر اکبر آبادی کے کسی اور اردو شاعر کے یہاں مشکل سے نظر آتی ہو۔ لیکن نظیر کے یہاں بھی یہ جدّت پسندی صرف موضوعات اور اسلوبِ بیان تک محدود ہو۔ شاعری کے سانچوں اور پیمانوں میں تجزیے اور ایجاد کے لیے جس لیاقت کی ضرورت ہوتی ہو وہ نظیر کو نصیب نہ تھی۔ اس اعتبار سے رنگین یقیناً اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد مثال ہیں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، نثر ہر صنف میں انھوں نے اپنا ایک خاص طرز اختیار کیا ہو اور "امتحانِ رنگین" میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ رنگین نے اپنی تصانیف کے جو نام رکھے ہیں اور جس طرح انھیں مختلف مثلثوں، خمسوں، پنجوں، ششِ جہات، سبع سیارہ اور نورتن کے دل چسپ مجموعوں میں تقسیم و ترتیب دیا ہو وہ بھی اسی ایجادیا

جدّت پسندی کا ایک مُنظہر ہیں۔ اگرچہ ان مجموعوں کے ناموں کی یہ تقسیم کہیں کہیں اُلجھن کا باعث بھی بن گئی ہو کہ 'پنجۂ رنگین' اور 'خمسۂ رنگین' دو مختلف مجموعوں کے نام ہیں اور کبھی دونوں نام ایک ہی مجموعے کے لیے اختیار کر لیے گئے ہیں لیکن یہ نام بڑے دل چسپ اور خیال انگیز ہیں۔ ناموں کے علاوہ ہر مجموعے اور ہر تصنیف میں کوئی نہ کوئی خاص التزام بھی رکھا ہے۔ مثلاً 'دیوان بیختہ' میں دوہری غزل کہنے کی قید ہے۔ کسی مجموعے میں دو مثنویاں شامل کرتے ہیں کہ ہر ایک میں پانچ پانچ سو اشعار ہوں۔ کہیں رباعی کو رباعی مستزاد کی شکل دیتے ہیں تو کہیں ہفت بند کی طرح ہفت مصرع نظم ایجاد کرتے ہیں۔ کہیں عورتوں، مردوں کی بولیاں الگ الگ کرتے ہیں۔ کہیں شہریوں اور گنواروں کی زبان کا امتیاز دکھاتے ہیں۔ کہیں پوربیوں کی بولی ٹھولی میں گفتگو کرتے ہیں۔ "قلعۂ معلّٰی کی زبان اور لکھنؤ کی بیگمات کے محاورات کا فرق الگ ہے اور ان سب کو رنگین نے محض تفریحاً یا اتفاقاً اختیار نہیں کیا ہے۔ اس میں ان کے قصد اور ارادے کو دخل ہے۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر زبان کی تاریخ میں اپنی ہمہ دانی کی وجہ سے رنگین کا ایک خاص مرتبہ ہے۔ وہ کثیر اللسان (Multi-lingual) انسان تھے۔ ان کے والد تورانی تھے اور ترکی ان کے گھر کی زبان تھی۔ عربی اور فارسی کی انھوں نے باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ رنگین خود سرہند میں پیدا ہوئے تھے جس کی سرحد میں ایک طرف پنجابی اور دوسری طرف ہریانی ہیں۔ اس لیے وہ پنجابی بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہوں گے۔ ان کے یہاں ہیر اور رانجھا کے نام محض سُنے سُنائے استعاروں اور تلمیحوں کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ہیر پڑھی ہوگی۔ پنجابی اشعار جو ان کے کلام میں موجود ہیں۔

اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ وہ اس زبان کو صحت کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے۔ دہلی کی اردوئے معلّٰی اس وقت کی مستند اُردو تھی۔ رنگین، شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور اُنھوں نے اُردو شعر و شاعری کے لیے یہی مستند محاورہ اختیار کیا تھا۔ ملازمت اور سیر و سفر کے سلسلے میں انھوں نے برِّعظیم کے تقریباً تمام بڑے شہروں کا گشت کیا اور اکثر میں ان کا قیام خاصے عرصے رہا۔ بنارس کے ہندوؤں کی زبان اور ان کی تہذیب و معاشرت کا انھوں نے جس تفصیل سے مطالعہ کیا تھا وہ بنارس سے فرخندہ کے نام خط اور "مثنوی مہ جبین" کے طویل اقتباسات سے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ اس لیے ہندوؤں کی زبان و بیان کے بارے میں بھی ان کی شہادت صرف سُنی سُنائی باتوں پر مبنی نہیں ہے۔ راجپوتانہ اور مرہٹواڑے گجرات اور دکن میں بھی وہ اتنے عرصے رہے تھے کہ ان علاقوں کی زبانوں پر پوری قدرت حاصل کر لی تھی۔ لکھنؤ، فیض آباد، خیرآباد اور پورب کے دوسرے شہروں میں بھی قیام رہا۔ اور آخر عمر میں باندہ پہنچے، اس لیے پوربی زبان، پوربیوں کے خاص مذاق اور لب و لہجے پر بھی دسترس حاصل ہوگئی۔

اس اعتبار سے ان کے کلام کا یہ حصّہ انشار کی "دریائے لطافت" سے اپنی اہمیت کی وجہ سے بہت بڑھ جاتا ہے۔ انشار کی "دریائے لطافت" شائع ہوگئی اور رنگین کا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے اب تک دونوں کا موازنہ نہ ہوسکا ورنہ جو مثالیں ہم نے نقل کی ہیں ان سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہیں کہ اس بارے میں رنگین انشار پر فوقیت رکھتے ہیں اور جب کبھی برِّعظیم ہند و پاکستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو شاید رنگین

کے کلام کا یہ پہلو ان کی عظمت اور حیثیت متعین کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

غرض رنگین عجیب ہمہ داں، ہمہ گیر اور متنوع شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں سپاہی بھی، فوجی سردار بھی ہیں اور شہزادوں کے دربار دار بھی۔ وہ شہسوار بھی ہیں اور بیطار بھی۔ طبیب بھی ہیں اور حکیم بھی، ناظم بھی ہیں اور نثر نگار بھی، رند مشرب بھی ہیں اور صوفی منش بھی، شوخ بھی ہیں اور عارف بھی۔ شیطان کا عرس بھی کرتے ہیں اور حج کی نیت سے سفر بھی کرتے ہیں۔ فحش گوئی اور ہجو نگاری بھی کرتے ہیں اور توبہ و استغفار بھی۔ اپنے بڑے بھائی صوفی اللہ یار بیگ کی پاک بازی کے قصیدے بھی پڑھتے ہیں اور اپنے صاحب زادے کی عشق بازی کی داستانیں بھی دوہراتے ہیں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں اور دنیا کی مذمت، فقر و استغنا اور توکل کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ عیاشوں کے لیے اپنے مجرب نسخے بھی تجویز کرتے ہیں اور صوفیوں کی حکایتیں بھی نقل کرتے ہیں۔ غرض ایک ایسی شخصیت ہیں جو سامنے آتے ہیں تو سب پر چھا جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کی علمیت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ کوئی قادر الکلامی سے، کوئی ان کی طبیعت کی شوخی اور ظرافت سے پناہ مانگتا ہے اور کوئی ان کی غزل، مثنوی اور ریختی کی استادی کے اعتراف میں سر جھکا دیتا ہے۔ وہ ہر میدان میں آتے ہیں اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسّی سال سے اوپر یہ تماشا ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ موت اس ڈرامے پر آخری پردہ ڈال دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے کمالات پر بھی ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ ان کی تیئیس[۲۳] ضخیم تصانیف گم نامی میں دب کر رہ جاتی ہیں۔ آج ہم نے یہ پردہ اٹھا کر ان کی شخصیت اور تصانیف کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شاید اس طرح انھیں ہماری زبان و ادب کی تاریخ میں وہ درجہ مل جائے جس کے وہ پوری طرح مستحق تھے۔

باب دہم

رنگین کی قلمی کتب کی فہرست

دیوان ریختہ[1] سنہ ۱۲۰۲ھ

قرس نامہ سنہ ۱۲۱۰ھ

دیوان ریختہ سنہ ۱۲۱۵ھ

دیوان بیختہ[2] (غزل در غزل) سنہ ۱۲۱۵-۲۰ھ

دیوان آمیختہ (دیوان ہزل) سنہ ۱۲۳۰ھ

دیوان انگیختہ (دیوان ریختی) سنہ ۱۲۳۰ھ

دیوان[4] حدیقۂ رنگیں فارسی (خمسۂ رنگیں) سنہ ۱۲۳۶ھ

مجموعۂ رنگین در ہفدہ زبان سنہ ۱۲۳۵-۳۶ھ

مجالسِ رنگین (فارسی نثر) سنہ ۱۲۳۵-۳۶ھ

اخبار رنگین (اُردو نثر) سنہ ۱۲۳۵-۳۸ھ

امتحان[5] رنگین درنثر سنہ ۱۲۳۶ھ

چہار عنصر رنگین (دیوان ریختہ سنہ ۱۲۱۵ھ تا دیوان انگیختہ)

خمسۂ رنگین[3] (دیوان ریختہ سنہ ۱۲۱۵ھ تا دیوان حدیقۂ رنگیں فارسی)

ہشت بہشت رنگین (دیوان ریختہ سنہ ۱۲۱۵ھ تا اخبار رنگین)

نورتن رنگین (دیوان ریختہ سنہ ۱۲۱۵ھ تا امتحان رنگین)

---

[1] یہ دیوان جونگر کے قریب جنگ پاٹن میں ضائع ہوگیا۔ [2] دیوان ریختہ کے فارسی دیباچے میں رنگین لکھتے ہیں کہ اس دیوان کی بنیاد ۱۲۱۶ میں پڑی لیکن بیختہ کے دیباچے میں ۱۲۱۵ لکھا ہے

[3] 'دیوان بیختہ' کے دیباچے میں 'پنجۂ رنگین' لکھا ہے۔ [4] یہ دیوان ۱۴۷ ورق پر مشتمل ہے

[5] 'دیوان بیختہ' کے دیباچے میں نورتن رنگین کا حصہ نہم 'امتحان رنگین' کو بتایا ہے۔ لیکن 'دیوان ریختہ' کے دیباچے میں حصہ نہم 'رنگین نامہ' درجواب محمود نامہ کو قرار دیا ہے جس نے ۱۲۳۸ میں ترتیب پائی۔ یہی 'رنگین نامہ' سبع سیارۂ رنگین کا چوتھا حصہ ہے جو اس جلد میں موجود ہے ؞

دیوان ریختہ کے دیباچے میں 'مجموعۂ رنگین'، 'اخبار رنگین' اور 'مجالس رنگین' کی تاریخ تصنیف ۱۲۳۵ اور امتحان رنگین کی ۱۲۳۶ لکھی ہی جس کے بعد مجموعے کا نام 'نورتن رنگین' رکھا۔ لیکن دیوان ریختہ کے دیباچے میں ۱۲۳۶ کے بجائے ۱۲۳۸ ہی اور 'نورتن رنگین' سے ۱۲۳۶ ہی برآمد ہوتی ہی۔ تاریخ یہ ہی ؎

چو تاریخ جستم ز پیر خرد بہ گفتا قلم بند شد نورتن

دیوان ریختہ کے دیباچے میں 'دیوان کلیات رنگین' تاریخ لکھی ہی۔ ۱۲۳۸

مثنوی باغ وبہار یعنی مثنوی دل پذیر (مہ جبین ونازنین)

مندرجہ ذیل چھ مثنویوں کو 'مسدس رنگین' (شش جہت رنگین) کے نام سے موسوم کیا ہی۔ یہ مجموعہ چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہی۔

ایجاد رنگین (موجد رنگین) بارہ سو اشعار

عجائب رنگین | عجائب وغرائب رنگین
غرائب رنگین |

شہر آشوب رنگین ۲۰۰ اشعار

دستان رنگین (کہاوت ہائے رنگین) ۲۰۰ اشعار } مثنوی مثلث رنگین
حکایات رنگین ۲۰۰ اشعار }

چار حکایات چار باب میں ہیں۔

(۱) در معاد | مثنوی ربع رنگین (چہار چمن رنگین)
(۲) در معاش | ایک ہزار اشعار
(۳) در ظرافت |
(۴) در تصوف |

؎ فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۲

مثنوی مخمس رنگین (پنجۂ رنگین)[1] — ۷۰۰ اشعار

(۱) خواب کا قصہ خط میں
(۲) تاجر کا قصہ
(۳) اپنا لکھنؤ کا حال
(۴) میواتن کا قصہ
(۵) خط الٰہی بخش خاں کو

گل دستۂ رنگین (نقش جبہت رنگین) — ۵۰۰ اشعار

(۱) خط اوّل میں رنج و غم کی کہانی
(۲) خط دوم میں نجار، خیاط، زرگر اور زاہد کی کہانی
(۳) خط سوم از لکھنؤ بہ شاہ جہاں آباد بہ نام لالہ بسنت سنگھ نشاط
(۴) خط چہارم از لکھنؤ بہ شاہ جہاں آباد بہ نام برادر صاحب حکیم محمّد اشرف صاحب
(۵) خط پنجم از لکھنؤ بہ بنارس بہ نام خواجہ محمود
(۶) خط ششم از لکھنؤ بہ بنارس بہ نام مرزا محمّد ابراہیم۔

سبع سیارۂ رنگین[2]

(۱) تصنیف رنگین ۱۳ ورق
(۲) گل دستۂ رنگین ۲۵ 〃
(۳) سُبحۂ رنگین ۱۲ 〃
(۴) رنگین نامہ (مربع رنگین) درجواب محمود نامہ ۸ ورق
(۵) ساقی نامہ رنگین ۱۰ ورق
(۶) تجربہ رنگین درنثر اردو ۱۸ ورق
(۷) کلام رنگین ۱۰ 〃

---

[1] دیوان ریختہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہو

میں نے کہہ کر پانچ مثنویاں تمام — 'پنجۂ رنگیں' کیا ہے ان کا نام
پھر جو جیجوں کا کیا ان کے شمار — شعر ہیں دس سو گنے یہ پانچ بار

[2] 'دیوان ریختہ' کے دیباچے میں اسے ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل بتاتے ہیں۔

خمسۂ رنگین[2]

(۱) جنگ نامہ رنگین ۲۲ ورق

(۲)[1]

(۳) نصاب ترکی (نصاب رنگین) ۲۴ ورق

(۴) نسخہ بہ طرز حضرت مولوی روم در فارسی نظم ۲۴ ورق

(۵) حکایاتِ رنگین ۲۲ ورق

متفرقات

(۱) قوت الایمان ۹ ورق

(۲) قصیدہ ترجمہ غوثیہ ۷ ″

(۳) ترجمہ قصیدہ بانت سعاد ۱۲ ″

(۴) نسخہ درستی قصیدہ سودا بہ موجب فرمایش شمشیر خاں ۴ ورق

---

[1] حصّہ دوم خمسۂ رنگین اِس جلد میں نہیں ہو لیکن انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں اُس دُوسرے حصّے کا نام حکایتِ رنگین لکھا ہو۔ یعنی بد صوگل فروش کی کہانی جو پانصد شعر پر مشتمل ہو۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷۵

[2] دیوان ریختہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہو۔

دیوان ریختہ کا اشاریہ

پہلے چھ صفحوں پر فارسی میں دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اپنے والد کے ہندستان آنے اور اپنی تصانیف کے متعلق تفصیل دی ہے۔

دیوان قصیدے سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا قصیدہ نواب ظفر یار خاں بہادر کی تعریف میں ہے اس میں ۶۹ شعر ہیں پہلا شعر یہ ہے ؎

تڑپے ہے کیوں آہ دلِ ناتواں دے مجھے آرام کہیں یک زماں

قصیدے کا آخری مصرع -

دوست ہیں رنگیںؔ سو رہیں شادماں

رقعہ بطور مثنوی درجواب خط شخصے و گلہ ہائے چند درچند ؎

بہجت افزائے خاطر دل ہا یعنی عقدہ کشائے مشکل ہا

اس میں ۲۷ شعر ہیں۔ آخری شعر کا آخری مصرع

ہیں ہزار اور دو سو اور چوں تیس[1]

رقعہ درجواب پیغام شخصے ؎

کرم فرما و مشفق میرے جو ہیں نہایت ہی خفا وہ مجھ سے گو ہیں

اس رقعے میں دس شعر ہیں ۔ آخری شعر ؎

یہ سب کچھ میں نے ان کو کہہ سنایا ولے کچھ دھیان میں ان کے نہ آیا

اشعار چند بطور مثنوی دربیان احوال خصلت موت و حیات

---

[1] دیوان ریختہ پہلے مرتب ہوا تھا۔ یہ خط ۱۲۳۰ھ کا ہے۔ غالباً قلمی نسخہ لکھتے وقت اسے بھی شامل کرلیا گیا۔ قلمی نسخے کے ابتدائی ۱۴ صفحات اسی قسم کے ہیں۔

ذوی القربا در زمانۂ گزشتہ وحال آئندہ از روئے علم قیافہ شناس واللہ اعلم۔

موا پہلے مرا بھائی خدایار   ہوا ہیں زندگی سے اپنی بیزار

اس میں ۵۷ شعر ہیں۔ خدایار خاں اپنے بھائی اور والد بزرگ وار صوفی جی صاحب، محمد یار خاں، ابراہیم سلمان خاں، اختر یار خاں، نصرت یار خاں احمد یار خاں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی سخاوت، بہادری اور موت وحیات کا ذکر ہے۔

آخری شعر ؎

بُرا پڑھ کر اسے گر کوئی مانے   تو بس رنگیںؔ کو وہ نادان جانے

مرثیہ ؎

ہے روایت یوں کہ ہو کر شہ مدینے سے رواں   آئے جب دشت بلا میں لے کے سارا خانماں

اس مرثیے میں ۴۷ شعر ہیں --- آخری شعر

دوست کا اس خانداں کے دن بدن ہو خوب کام   اور دشمن کا رہے ہرگز نہ دنیا میں نشاں

مرثیہ ؎

ایک راوی سے سُنا ہے کہ جناب سرور   کر گئے جس گھڑی اس عالم فانی سے گزر

اس مرثیے میں تین شعر ہیں۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔

بعد مردن ز جفا ہائے تو فریاد کنم   از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

سلام ؎

مدام جھک کے یہ کرتا فلک ہے جس کو سلام   وہی امام ہے کیسا امام ابن امام

صرف ایک ہی شعر ہے باقی صفحہ خالی ہے۔

غزلیں ورق ۵۱ سے شروع ہوتی ہیں ؎

بخش اپنے کرم سے مجھے اے بارِ خدایا   آیا ہوں ترے در پہ گنہگار خدایا

اس غزل میں سات شعر ہیں۔

آخری شعر ؎

رنگیں کو تعصب سے تبرّے سے بری رکھ دے عشق اماموں کا دھنواں دھار خدایا

ایذا مجھے دینے سے حاصل تجھے کیا ہوگا تو مجھ سے بھلائی کر تیرا بھی بھلا ہوگا

آخری شعر ؎

ہاتھوں کو عبث اپنے مہندی سے نہ کر رنگیں رنگیں کے لہو جیسا کب رنگ حنا ہوگا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

ہندو بچے کو یار کیا ہم نے کیا کیا پھر کفر اختیار کیا ہم نے کیا کیا

کُل نو شعر ہیں ـــــ آخری شعر ؎

بولے پہ دل دیا اسے رنگیں ہزار حیف نے قول دنے قرار کیا ہم نے کیا کیا

جو ربط ہم میں تم میں بہت تھا وہ کم ہوا تم خوش ہوئے پہ ہم پہ قیامت ستم ہوا

آخری شعر ؎

کیفیتِ جہاں وہیں پیتے ہی کھُل گئی رنگیں کے حق میں ساغرِ مے جامِ جم ہوا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

تجھ کو میں اپنے سے بیگانہ کہوں تو ہی بجا پر تو میرا جی ہی جانا نہ کہوں تو ہی بجا

آخری شعر ؎

چاہتا ہی اس کو یہ رنگیں جسے دیکھا نہیں اس دلِ وحشی کو دیوانہ کہوں تو ہی بجا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

عشقِ بتاں سے کب جی رنجور ہی ہمارا تیرِ جفا سے زخمی دل چور ہی ہمارا

آخری شعر ؎

ہم بے خبر ہیں رنگیں لیکن بہ قول سیّم ہر ایک کی زباں پر مذکور ہی ہمارا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

جب سے نظر پڑا ہے ہم کو جمال اس کا رہتا ہے رات اور دن تب سے خیال اس کا
رنگیں کی رنگ رو ہیں سرخی نظر ہے آتی
احوال ان دنوں میں کچھ ہے بحال اس کا
کُل پانچ شعر ہیں۔
چاہ کر دل نے اسے آہ یہ کیا کام کیا آپ بدنام ہوا اور مجھے بدنام کیا
کیا کہیں ہجر میں کس طرح سے ہم نے رنگیں
شام کو صبح کیا صبح کو پھر شام کیا
کُل پانچ شعر ہیں۔
توسنِ حسن پر اپنے جو وہ بے باک چڑھا اتنا روندا کہ فلک پر دی مری خاک چڑھا
ذبح کرنے کا ارادہ ہے مگر رنگیں کے
آستینوں کے جو ظالم نے لیے چاک چڑھا
کُل پانچ شعر ہیں۔
فن میں پیارے عشق کے جو خوب کامل ہوئے گا تجھ پہ صدقے ہوکے مرجائے گا قائل ہوئے گا
راہ دل سے دل کو ہے رنگیں یہ ہم کو ہے یقیں
چاہتے ہیں ہم تو اس کا دل بھی مائل ہوئے گا
کُل سات شعر ہیں۔
ہے کون میرے دل میں تری چاہ کے سوا ہم دم نہیں ہے کوئی مرا آہ کے سوا
کیا بے کسی کا وقت ہے عشقِ بتاں میں آج
رنگیں نہیں ترا کوئی اللہ کے سوا
گر گلشن سے گزرا تھا صبا وہ گُل بدن اپنا دکھاتا تھا سحر بلبل کو غنچہ پیرہن اپنا
اگر شیریں سے شیریں کام ہوتا عشق میں رنگیں سر آخر چیرتا تیشے سے پھر کیوں کوہ کن اپنا
کُل پانچ شعر ہیں۔

تا حشر رہے یہ داغ دل کا یارب نہ بجھے چراغ دل کا
معلوم نہیں کس کو رنگیں
دے کون ہمیں سراغ دل کا

کُل سات شعر ہیں ۔

ہمارا شیشۂ دل یار نے پتھر سے کیوں پٹکا خدا جانے کہ اس کے دل میں یارو خار کیا کھٹکا
جو دیکھا ہاتھ خالی راہ میں رنگیں نے قاصد کو
بھری ایک آہ سرد اور سر در و دیوار سے پٹکا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

ہوا ہے داغ مجھے اب یہ اس ستم گر کا چراغ خانہ ہوا ہے وہ غیر کے گھر کا
عبث ہے خوف مجھے روزِ حشر کا رنگیں
تری زباں پہ ہے کلمہ شفیع محشر کا

کُل سات شعر ہیں ۔

جہاں تجھ سا ظالم طرح دار ہوگا وہاں اس کا ہر یک طلب گار ہوگا
وہاں رنگ رنگیں کا دیکھو گے یارو
جہاں عشق کا گرم بازار ہوگا

کُل چھ شعر ہیں ۔

غم اس کا یونھیں میری گر جان نکالے گا تو کون میرے دل کے ارمان نکالے گا
پھر شعر کسی کا وہ پڑھنے کا نہیں رنگیں
جُزدان سے جو تیرا دیوان نکالے گا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

جُدا تجھ سے جو اے گُل اندام ہوگا اسے فرشِ گل پہ نہ آرام ہوگا

ذکر عشق میرا کہا مان رنگین
خدا جانتا ہی تو بدنام ہوگا

کُل چھ شعر ہیں۔

گم ہوا دل مرا ایسا ہی کہ پایا نہ گیا   پھنس گیا دام میں کس کے کہ پھر آیا نہ گیا
عشق جس کا ہی لقب سو وہ ہی بھاری پتھر
کوہکن جیسے سے رنگیں وہ اٹھایا نہ گیا

کُل پانچ شعر ہیں۔

سر اپنا ہم نے ای ظالم تری شمشیر کو سونپا   جو ہونا ہو سو ہو یہ کام اب تقدیر کو سونپا

کُل پانچ شعر ہیں ۔

سر بہ صحرا تھیں نہ لیلیٰ کا محمل ڈھونڈھتا   کاروانِ عشق میں پھرتا ہوں میں دل ڈھونڈھتا
کیا ہوئی تقصیر ایسی تجھ سے جو رنگیں مجھے
تیغ کھینچے ہاتھ میں پھرتا ہی قاتل ڈھونڈھتا

کُل پانچ شعر ہیں۔

ترے کوچے میں ہر شب یار لائے بن نہیں رہتا   تجھے پیارے ہی دل مجھ کو ستائے بن نہیں رہتا
غرض مند اپنے مطلب سے رکھے ہی کام ای رنگیں
وہ آوے یا نہ آوے میں بلائے بن نہیں رہتا

کُل سات شعر ہیں۔

خفا مجھ سے جو وہ بیداد گر ہوگا تو کیا ہوگا   جدا ایک دم میں گر تن سے یہ سر ہوگا تو کیا ہوگا
جہاں غمزوں کا اس کے تیر باراں ہوئے ای رنگیں
کسی کا اس جگہ سینہ سپر ہوگا تو کیا ہوگا

کُل چھ شعر ہیں۔

خواب میں بھی خیال ہے تیرا ہجر میں بھی وصال ہے تیرا
کیا تو عاشق نہیں کہیں رنگیں
اِن دنوں رنگ لال ہے تیرا

کل سات شعر ہیں ۔

نہ اپنے میں نہ بیگانے میں دیکھا جو رشتہ شمع پروانے میں دیکھا
بہت اس شوخ کو رنگیں نے ڈھونڈھا
نہ آبادی نہ ویرانے میں دیکھا

کل پانچ شعر ہیں ۔

جس بن کہیں ایک دم کبھی آرام نہ آیا افسوس کہ اپنے وہ کبھی کام نہ آیا
تھا جی میں یہ اس کے کہ بلاوے مجھے رنگیں
یاد اس کو کسی وجہ مرا نام نہ آیا

کل سات شعر ہیں ۔

پڑ گیا اس سے یوں مرا لانجھا جیسے مفتوں تھا ہیر پر رانجھا
رنگ رنگیں کا ان دنوں ہے زرد
کہیں پینے لگا ہے وہ گانجھا

کل پانچ شعر ہیں ۔

مژدہ وصل کا ہے اس کے نوشتہ پہنچا آپ کو چشم تک ای جان بر شتہ پہنچا
کی یہ طغیانی مرے جوشِ جنوں نے رنگیں
کہ دیا قیس تک آخر مرا رشتہ پہنچا

کل پانچ شعر ہیں ۔

درد ہے اس کو ہمیشہ آہ کا ہے یہ حال اپنے دلِ آگاہ کا

دوست تیرے خوش رہیں رنگیں مدام
ہے یہ قول اس بندۂ درگاہ کا

کل سات شعر ہیں۔

مارا پتھر پہ سر اور سینے پہ پتھر مارا پر ترا دل نہ ہلا ہم نے بہت سر مارا
دل کو رنگیں کے لیا یوں تری الفت نے دبوچ
باز نے جوں کوئی رنگین کبوتر مارا

اوس کو نوستانے بن کچھ کام نہیں آتا اور مجھ کو بغیر اس کے آرام نہیں آتا
اقرار کا کیا اس کے ہو مجھ سے بیاں رنگیں
وہ صبح کا وعدہ کر شام نہیں آتا

ورق ۳۲ و تک کی ہر غزل کا مطلع اور مقطع نقل کیا گیا ہے۔

کل ۲۶۱ غزلیں ہیں۔ علاوہ ان کے ایک غزل قطعہ والی بھی ہے جس میں گیارہ قطعات ہیں۔ ورق ۸ ب پر غزل قطعات درجواب غزل بی خانم جان بنیا تخلص وتضمین مضمون آں غزل یہ غزل قطعات میں ہے اس کے پہلے قطعہ کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "چاہت" حائے حطی سے لکھا ہے ؎

غزل تیری وہ پہنچی ای میاں ہے کہ جس میں تیری چاہت کا بیاں ہے

غزلیں ۲۶۱ ایک غزل قطعوں والی ہے۔
رباعیات ۴۴ ہیں
فردیات ۸۲ ہیں
قطعات ۴۴ ہیں
ترجیع بند ایک ہی ہے اس کے سات بند ہیں۔
واسوخت ایک ہے اس میں سات بند ہیں۔
مسدس ایک ہی ہے اس میں پانچ بند ہیں۔
مخمس نو ہیں۔ یہاں دیوان ختم ہو جاتا ہے۔

اشاریہ حدیقۂ رنگیں[1]

---

[1] دوسرا نام دخنشہ رنگیں،

(۱۹) لعل ہم سنگ آستاں تو نیست ۶ شعر
(۲۰) آزردہ من آں بتِ چین است غم این ست ۹ شعر
(۲۱) چشم حارص راز خواہش سیر کردن مشکل است ۷ شعر
(۲۲) ہر کہ را چشم دل بہ ماہ من است ۹ شعر
(۲۳) غمِ دنیا و فکر دیہم نیست ۹ شعر
(۲۴) خط سبزش اگرچہ رستہ دیر است ۸ شعر
(۲۵) تختہ سینہ تخت شاہیٔ ماست ۸ شعر
(۲۶) کمال حسن را آخر زوال است ۹ شعر
(۲۷) بہ تو در سینہ دلم خون شدہ است ۷ شعر
(۲۸) آن بتِ بیگانہ دوست یار نہ چوں من کش است ۵ شعر
(۲۹) رخنہ ہا از مژہ در سینہ چاکم انداخت ۶ شعر
(۳۰) شنیدم از طبیبان محبّت ۸ شعر
(۳۱) بہ دردِ عشق و درمانِ محبّت ۷ شعر
(۳۲) آں گل بہ مزار ما نیاید ۱۰ شعر
(۳۳) تیر آہے کہ سر از سینہ کشد ۷ شعر
(۳۴) بیان ہجر امکانے ندارد ۔ عنوان بیان غزل قطعات ہے۔ پانچ قطعوں میں کل ۱۲ شعر ہیں ۔
(۳۵) چہ شد ای نالۂ شب گیر چہ شد ۷ شعر
(۳۶) شکر للہ کہ ترا غنچہ دہاں ساختہ اند ۱۰ شعر
(۳۷) ہر کس کہ دید روئے تو دیوانہ می شود ۵ شعر
(۳۸) جز تو ام سیمبر نمی باید ۔ اس میں چھ قطعات ہیں جن کے ۱۶ شعر ہیں۔

(۳۹) مارا کہ دل ہمیشہ بہ سوئے تو می کشد ۵ شعر

(۴۰) اشک خوں چکیدہ را ماند ۱۰ شعر

(۴۱) کشت غیر را قاتل خوں من بہ جوش آمد ۵ شعر

(۴۲) ز طوف کعبہ و بیت خانہ ہا کی تنگ می گردد ۶ شعر

(۴۳) رفتی و شور بہ محفل افتاد ۸ شعر۔ ساتواں شعر کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکتا۔

(۴۴) آتش عشق زباں ہا دارد ۷ شعر

(۴۵) ای گل پردہ ساز ہا دارد ۵ شعر

(۴۶) بہ تو ای ماہ چہ می باید کرد ۵ شعر

(۴۷) رد کش حسنت ار چہ حور بود ۷ شعر

(۴۸) راز دل خود نہ گفتہ بہتر ۵ شعر

(۴۹) خبر عشق نہ دارم راز دگر ۴ شعر

(۵۰) دارم بہ ذوق وصل او در دل تمنّائے دگر ۷ شعر

(۵۱) در غم ہجر اشک فشانی ہنوز ۷ شعر

(۵۲) افسر شاہیست ہر بر سر گدا اینست و بس ۱۲ شعر

(۵۳) بے تو من سوختہ ام ہیچ مپرس ۸ شعر

(۵۴) ای دل ز حد زیادہ مبیں در ادیم[۱] خویش ۷ شعر

(۵۵) از چشم اشک آمد بیرون افشاندہ چیچوں نہ کردمش ۱۰ شعر

(۵۶) گر سر بہ کنم فسانۂ عشق ۷ شعر

(۵۷) ہست ز چشم جاری اشک ۷ شعر

---

[۱] ادیم: ادھوڑی، چمڑا، روئے زمین

(۵۸) ہر کس کہ بہ او شود خاک ۵ شعر

(۵۹) از غمِ ہجر ہلا کی ای دل ۷ شعر

(۶۰) ہر چہ می گویمت آئی ای دل ۶ شعر

(۶۱) یا سیم براں چوں یار شدم ۸ شعر

(۶۲) در غمِ یار نہ دانم چہ کنم ۵ شعر

(۶۳) ہوش و عقل و دیں باختہ ام ۸ شعر

(۶۴) چشم دل را کشادہ می بینم ۶ شعر

(۶۵) بر توبے ساختہ مفتوں شدہ ام ۸ شعر

(۶۶) فلک گر دد نہ گردد گر بہ کامم ۷ شعر

(۶۷) گزشت عمر وفتادہ بہ خاک کوئے توام ۷ شعر

(۶۸) ماکہ در دیدہ ہا نہ می داریم ۱۲ شعر

(۶۹) ہر زماں وصل پری رخسار می خواہد دلم ۶ شعر

(۷۰) دور از تو بسے جفا کشیدم ۷ شعر پانچواں شعر کرم خوردہ ہے۔

(۷۱) دست از قتل کہ بر داشتیم ۶ شعر

(۷۲) حال دل شرح زبانی چہ کنم ۱۰ شعر

(۷۳) ساقیا می زمن در یغ مدار ۱۱ شعر

(۷۴) بوالعجب سحر کلامی رنگین ۷ شعر

(۷۵) الٰہی بہ گزرد دامن کشاں یار از مزارمن ۷ شعر

(۷۶) ظلم ای دشمنِ جانی کم کن ۵ شعر

(۷۷) چاک شد بیش و کم ز دست جنوں ۷ شعر

(۷۸) نیست آگاہ ز من نگارمن ۸ شعر

(۷۹) خون دل ہست شرابم بے تو — ۷ شعر
(۸۰) چہ کنم شرح چسانم بے تو — ۶ شعر
(۸۱) درتلاش تو بسے گردیدہ — ۸ شعر
(۸۲) ای دل برو دل بر یگانہ — ۱۰ شعر
(۸۳) می سوزم ای ماہ از نالہ و آہ — ۶ شعر
(۸۴) در نخل وفا ثمر نہ داری ۱۵ شعر { بارہ شعر کے بعد آخری تین شعر قطعہ کے ہیں
(۸۵) ای زلف تو بر دلم کمندے — ۵ شعر
(۸۶) ہست موزوں برائے عریانی — ۷ شعر
(۸۷) فلک با مشتِ خاک من چہ کردی — ۶ شعر
(۸۸) نالہ من گر اثرے داشتے — ۹ شعر
(۸۹) مرا با زلف مہ رویاں سروکار است پنداری — ۵ شعر
(۹۰) بے حجاب از پردہ عصمت بہ بازار آمدی — ۹ شعر
(۹۱) ہوشم ربود تو چہ گلے پہلوانگی — ۵ شعر
(۹۲) ای عشق مرا مجنوں کردی — ۸ شعر
(۹۳) غمزہ ہا بر سر خاکم کردی — ۷ شعر
(۹۴) مرا از لطف خود مہماں نمودی — ۹ شعر
(۹۵) صد ظلم ز حد افزوں کردی ۱۲ شعر اور ۶ مصرعے ہر دو شعر کے بعد ایک مصرع ہے۔
(۹۶) ہرچہ می گوییت آنی اے دل ۱۰ شعر اور پانچ مصرعے ہر دو شعر کے بعد ایک مصرع ہے۔ یہ مخمس ہے۔

لہ ۹۴ اور ۹۵ کے درمیان تلطفات ہیں۔

(۹۷) درکوئے وفا گزر نہ داری ۔ سات بند کا مخمس ہے جس میں چودہ شعر
اور سات مصرعے ہیں ۔
(۹۸) واقف ہر ناز و نیاز یم ما ۔ یہ چھ بند کا مخمس ہے جس میں ۱۲ شعر
اور چھ مصرعے ہیں ۔
(۹۹) غم بہ ہر سینہ مقابل افتاد ۔ یہ آٹھ بند کا مخمس ہے جو ۱۶ شعر اور
۸ مصرعوں پر مشتمل ہے ۔
(۱۰۰) صدمہ ہا ظاہر د پوشان بر داشت ۔ اس کا عنوان 'مخمس غزل
نور العین واقف ہے جس میں پانچ بند ہیں
دس شعر اور پانچ مصرعے ہیں ۔
(۱۰۱) از جوش جنوں سرشار شدم ۔ یہ مربع غزل کا پہلا مصرع ہے جس میں
دس شعر ہیں ۔
(۱۰۲) روز شب نار مانہ آمد ۔ یہ مربع غزل کا پہلا مصرع ہے اس میں
کل چودہ شعر ہیں ۔
(۱۰۳) ز استاد غزل خوان محبت ۔ 'مثلث غزل نور العین' کا پہلا مصرع
ہے جس کے نو بند ہیں ۔
(۱۰۴) نیست کم از بیماری رشک ۔ 'مثلث غزل تصنیف خود' کا پہلا
مصرع ہے جس کے چھ بند ہیں ۔
(۱۰۵) چو شد باغ دیوانم ای دوستاں ۔ یہ خاتمے کی نظم کا پہلا مصرع
ہے ۔ اس میں ۹ شعر ہیں ۔
(۱۰۶) اس خاتمے کے بعد 'تضمین اشعار سعدی' کے عنوان سے
چودہ شعر ہیں بمصرعۂ اوّل یہ ہے ع
در اقصائے عالم بگشتم بسے

(۱۰۷) پھر "غزلِ رنگین" ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے ؎

بحمد اللہ از نظمِ رنگیںؔ من

اس غزل میں دس شعر ہیں ۞

رباعیات	۵
مطلعات	۲۷
قطعات	۲۲ کُل ۷۱ شعر
مخمس غزل	۵
مربع غزل	۲ کُل ۲۴ شعر
مثلث غزل	۲ کُل ۱۵ شعر اور ۱۵ ہی مصرعے
خاتمے کی نظم	۸ شعر
تضمین اشعار سعدی	۱۴ شعر

اسماء الرّجال

دیوان ریختہ

(۱) الٰہی بخش خاں
(۲) شاہ حاتم شاہ
(۳) نواب اشرف الدّولہ
(۴) کلّو حجام
(۵) محمد امان اللہ خاں نثار
(۶) نواب ظفریاب خاں بہادر
(۷) محمدی خانم
(۸) میاں سلطان بخش پیرزادہ
(۹) لالہ بختاور سنگھ
(۱۰) محمدی خانم
(۱۱) خدا یار خاں
(۱۲) میاں غلام محی الدّین پیرزادہ
(۱۳) ظفر الدّولہ ثابت جنگ بہادر
(۱۴) محشر شاگرد سودا
(۱۵) اکبر شاہ بادشاہ
(۱۶) ٹیپو سلطان
(۱۷) محمد جان
(۱۸) صوفی اللہ یار بیگ
(۱۹) محمد یار خاں
(۲۰) سلمان خاں
(۲۱) اختر یار خاں
(۲۲) نصرت یار خاں
(۲۳) احمد یار خاں
(۲۴) خدا بخش پہا
(۲۵) لالہ بختاور سنگھ

امتحانِ رنگین

(۱) سندھیا مرہٹہ
(۲) نواب صوفی اللہ یار بیگ
(۳) نواب شرف الدّولہ فیض اللہ بیگ خاں
(۴) محمدی بیگم
(۵) محمد اکبر شاہ
(۶) نواب امیر خاں بہادر
(۷) نوری شہزادہ یعنی میاں شاہ دریا صاحب
(۸) کلّو حجام
(۹) انشا
(۱۰) الٰہی بخش خاں معروف
(۱۱) فیض محمد خاں
(۱۲) مولوی عبدالہادی خاں

مجموعۂ رنگیں

(۱) شاہ عالم بادشاہ
(۲) حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمتہ
(۳) نواب معتمد الدولہ وزیر لکھنؤ
(۴) والدہ نواب ذوالفقار بہادر
(۵) محمّد ہادی شارح سہ نثر ظہوری
(۶) اختر یار خاں
(۷) حضرت صوفی شاہ آبادانی
(۸) طہماس بیگ خاں
(۹) فاطمہ خانم
(۱۰) عموی صاحب نواب ترک جنگ بدل بیگ خاں
(۱۱) امین بیگ
(۱۲) برادر مہربان محمد قلی خاں
(۱۳) نواب منظفر الدّولہ
(۱۴) نواب یار خاں
(۱۵) نواب حیدر بیگ خاں
(۱۶) مرزا علی یار خاں
(۱۷) بستی خانم
(۱۸) امین الدّین خوش نویس
(۱۹) یعقوب بیگ عرف آغا مرزا

❖

مجالسِ رنگین

شاگردانِ رنگین

(۱) میر[1] سید علی غمگین
(۲) لالہ بسنت سنگھ نشاط
(۳) خواجہ آفتاب علی خاں منیر
(۴) محمدی خاں خان
(۵) ابراہیم بیگ خرم ہمشیرہ زادہ کلانِ رنگین
(۶) راجہ کدارناتھ تسنیم
(۷) راجہ شنکر ناتھ صبا
(۸) خانم جان[2] پنہا
(۹) لاڈو بیگم[3] بیگم
(۱۰) عزیزن خانگی عزیز

حضرت شاہ حاتم شاہ صاحب

شاگردانِ حاتم مجلس اوّل

محمد امان خاں نثار
اکبر علی اکبر
لالہ مکند رائے فارغ
میاں غلام علی شاہ غلامی
مرزا عظیم بیگ عظیم

---

[1] مطبوعہ مجالس رنگین، مرتبہ مسعود حسن رضوی میں صرف نو نام ہیں۔ ابراہیم بیگ خرم ہمشیرہ زادہ کلان رنگین کا نام نہیں ہے۔
[2] " " " " میں خانم جان کی جگہ 'عالم النساء' لکھا ہے جو غلط ہے۔
[3] مجالس رنگین مرتبہ مسعود حسن کے صفحہ ۱۰ پر لاڈو بیگم کی جگہ آدم بیگم لکھا ہے جو غلط ہے۔

	مجلس
سبحان قلی بیگ راغب	۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۲۴، ۲۹
انشاء	۳، ۴، ۲۵، ۲۶، ۳۱، ۳۹
مسیح الزماں حکیم محمد اشرف	۴
خلف الرشید حکیم شریف خاں	
مرزا مکھو بیگ شور برادر نواب	۶، ۲۳
بہادر بیگ خاں طالب جنگ بہادر غالب	
برادر مسیح الزماں حکیم محمد اشرف خاں	۸[1]، ۱۱
کھورے خاں آشفتہ	۹
میر سیّد علی غمگیں	۱۰
حکیم ثناء اللہ خاں فراق	۱۱
بسنت سنگھ نشاط	۱۲
امتیاز الدّولہ افتخار الملک	
سیّد احمد میر خاں منصور جنگ بہادر صوبے دار	۱۳
روشن الدولہ نواب غلام قادر خاں فرخ پسر نواب ضابطہ خاں	۱۴
عبد الکریم بیگ تاشقندی	۱۴
مصطفیٰ خاں پسر عموی مراد بیگ خاں	۱۵
مرزا علی بیگ اصفہانی	۱۵
دین محمد خاں پسر ملک عموی صاحب مراد بیگ خاں یہ رنگین کے بہنوئی بھی تھے۔	۱۶
دختر قصاب کا قصہ ہے	۱۷
نواب صیف الدّولہ نجف قلی خاں	۱۸

---

[1] یہ مجلس نمبر ۸ مطبوعہ میں نہیں ہے

مجلس

نوٹ :۔ مجلس نمبر ۶۲ میں حج کے سفر کا ذکر ہے ؞

رنگین کے معروف احباب کی مختصر فہرست

(۱) محمد امان خاں نثار[1]
(۲) لالہ مکند رائے فارغ } شاگردانِ حاتم
(۳) اکبر علی اکبر امروہی
(۴) نواب بہادر بیگ خاں غالب دہلوی
(۵) بھورے خاں آشفتہ شاہ جہاں آبادی
(۶) انشاء اللہ خاں انشا
(۷) میاں محمد خاں بہار
(۸) صوبے دار سید احمد میر خاں دہلوی
(۹) علی رضا بیگ اصفہانی
(۱۰) نواب نجف علی خاں (کانوڑ)
(۱۱) نواب اسمٰعیل خاں بہادر (نارنول)
(۱۲) مرزا لکھو بیگ شور مرشد آبادی
(۱۳) سبحان قلی بیگ راغب
(۱۴) مرزا باقر بہادر جنگ، استاد راغب
(۱۵) جرأت
(۱۶) مصحفی
(۱۷) قاسم علی خاں لکھنوی
(۱۸) منشی میر حسن منشی "
(۱۹) رام رتن مودی "
(۲۰) مرزا نعیم بیگ جوان[2] لکھنوی
(۲۱) مرزا الٰہی بخش
(۲۲) میر غلام علی تلی خاں
(۲۳) کاظم علی خاں ولد نواب فخر الدولہ عظیم آبادی
(۲۴) شیر علی خاں عظیم آبادی
(۲۵) نواب شجاع قلی خاں "
(۲۶) حکیم رضا قلی حکیم مرشد آبادی
(۲۷) مرزا بھجو دستار بدل بھائی "
(۲۸) نواب غلام قادر خاں فرخ پسر نواب ضابطہ خاں سہارن پوری دستار بدل بھائی۔
(۲۹) حکیم محمد اشرف خاں حکیم منھ بولے بھائی
(۳۰) مرزا عزیز

---

[1] اسپرنگر نے لکھا ہو کہ رنگین، حاتم کی وفات کے بعد نثار سے مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن کہیں اس کا ثبوت نہیں ملا

[2] رنگین نے مرزا نعیم بیگ کے کہنے پر "مجالس رنگین" لکھی، جس کی تائید انشا نے کی۔

(۳۱) شیخ ہدایت اللہ
(۳۲) میر جاگن
(۳۳) الٰہی بخش خاں معروف، برادر نواب اشرف الدولہ (الور)
(۳۴) حکیم ثناء اللہ خاں فراق
(۳۵) عبدالکریم بیگ کاشغری اتالیق فرخ
(۳۶) محمد یار بیگ سائل جھجپوری بعد میں منعم تخلص کیا۔
(۳۷) نواب قدرت اللہ خاں پسر نواب قاسم خاں اجمیری

اعزّہ کی مختصر فہرست

(۱) یعقوب بیگ عرف آغا مرزا نبیرہ
(۲) نصرت یار خاں
(۳) مرزا علی یار خاں عرف نواب یار خاں ثانی
(۴) اختر یار خاں
} بیٹے
(۵) بستی خانم دختر اختر یار خاں
(۶) محمدی خانم دوسری بیوی سے
(۷) فاطمہ خانم
} بیٹیاں
(۸) خدا یار خاں
(۹) صوفی اللہ یار بیگ خاں
(۱۰) محمد یار خاں
} بھائی
(۱۱) مراد بیگ خاں، ساکن فیروز پور جھرکہ، چچازاد بھائی

منتخب کلام

غزلیات

تری[1] فرقت میں ظالم نالہ و زاری ہے اور میں ہوں
نہیں ایک پل جھپکتی آنکھ بیداری ہے اور میں ہوں

اُدھر ہے آئینہ اور تو، اِدھر سامان ہے اتنا
جنوں ہے، غم ہے، وحشت ہے گرفتاری ہے اور میں ہوں

طرب ہے عیش ہے، آرام ہے گلشن ہے اور تو ہے
تعب ہے تپ ہے، درد دل ہے بیماری ہے اور میں ہوں

وفا ہے، مہر ہے، الفت ہے اوروں سے تجھے ظالم
فغاں ہے، آہ ہے حسرت ہے، ناچاری ہے اور میں ہوں

ادا ہے، ناز ہے، غمزہ ہے اور عشوہ ہے اور تو ہے
تپش ہے، شور ہے، فریاد ہے، خواری ہے اور میں ہوں

چمن ہے، سیر ہے، سبزہ ہے اور وہ گل ہے اے رنگیں
الم ہے، رنج ہے، رقت ہے، خونباری ہے اور میں ہوں

یاد[2] جو آئیں مجھے منھ کی ترے جھائیاں
غم کی گھٹائیں جو ہیں دل پہ مرے چھائیاں

گزرے مرے دھیان میں لاکھوں طرح کے خیال
تم نے کیا[3] رات کو مجھ سے جو چترائیاں

وہ بھی تو دن تھے کہ تم رہتے تھے ہمسائے میں
اب تو بدک جاتے ہو دیکھ کے پرچھائیاں

جو ہے مری آرزو، جانتے ہو اُس کو تم
کیوں یہ سمجھ بوجھ کر، کرتے ہو مچلائیاں

نیند تو آئی ہے جان، سو نہیں رہتے ہو کیوں
انکھن[4] جھکی جاتی ہیں لیتے ہو انگڑائیاں

شانہ اور آئینہ آہ ہاتھ سے چھٹتا نہیں
دیکھن کریں گے یہ کیا تری خود آرائیاں

کس سے چھپاتے ہو تم، کھل گئیں رنگیں یہ وہ
باتیں جو غیروں سے ہیں[5] آپ نے ٹھیرائیاں

---

[1] دیوان ریختہ ورق [illegible] [2] دیوان ریختہ ورق [illegible] [3] کیں [4] آنکھیں [5] ہیں۔

ہمارا[1] شیشۂ دل یار نے پتھر سے کیوں پٹکا   خدا جانے کہ اس کے دل میں یار و خار کیا کھٹکا
یہ جانا میں نے یار آتا ہے شاید آج گھر میرے   جہاں کانوں تلک پہنچا کسی کے پاؤں کا کھٹکا
کیا ہے ناتواں ایسا تری بیمار آنکھوں نے   کہ مشکل ہو گیا ہے یار لینا مجھ کو کروٹ کا
جنوں ہے مجھ کو یارو دل مرا بے تاب ہوتا ہے   خدا کے واسطے ہر گز نہ دو زنجیر کو جھٹکا

جو دیکھا ہاتھ خالی راہ میں رنگیں نے قاصد کو
بھری ایک آہ سرد اور سر در و دیوار سے پٹکا

جہاں[2] تجھ سا ظالم طرح دار ہوگا   وہاں اس کا ہر یک طلب گار ہوگا
دل و جاں سے چاہے گا جو تجھ کو پیارے   وہ ساری خدائی سے بیزار ہوگا
بنے گا تو جس بزم میں جا کے ساقی   مقرر وہاں یہ گنہگار ہوگا
تو اس ناز سے ہو جہاں جلوہ فرما   سرکنا ہمیں واں سے دشوار ہوگا
جہاں بام پر تو کھڑا ہو ادا سے   وہاں اک جہاں نقش دیوار ہوگا

وہاں رنگ رنگیں کا دیکھو گے یارو
جہاں عشق کا گرم بازار ہوگا

نہ[3] اپنے میں نہ بیگانے میں دیکھا   جو رشتہ شمع پروانے میں دیکھا
نہ مسجد میں، نہ بت خانے میں دیکھا   جو جلوہ دل کے کاشانے میں دیکھا
جو کیفیت تری آنکھوں میں پائی   نشہ ایسا نہ پیمانے میں دیکھا
ہوا دل چاک چاک اس آرزو میں   تری زلفوں کو جب شانے میں دیکھا

بہت اس شوخ کو رنگیں نے ڈھونڈھا
نہ آبادی میں نہ ویرانے میں دیکھا

جس[4] بن کبھی ایک دم کبھی آرام نہ آیا   افسوس کہ اپنے وہ کبھی کام نہ آیا

---

[1] دیوان ریختہ ورق ۱۸ ب   [3] دیوان ریختہ ورق ۱۹ ب
[2] ” ” ” ۱۹ ا   [4] ” ” ” ۲۱ ب

جب تک کہ بغل میں وہ دلارام نہ آیا — تب تک مرے دل کو کبھی آرام نہ آیا
پیغام مجھے یوں تو بہت آتے ہیں اس کے — پر وصل کا اصلا کبھی پیغام نہ آیا
پستے کو خجالت ہی رہی ترے دہن سے — اور آنکھوں کے آگے تری بادام نہ آیا
انگشت نما ہم ہوئے جس ماہ کی خاطر — وہ ماہ کبھی تا بہ لب بام نہ آیا
لاکھوں کو گرایا ہے فلک تو نے زمیں پر — ہرگز کسی گرتے کو بچھے تھام نہ آیا

تھا جی میں یہ اس کے کہ بلا وے مجھے رنگین
یاد اس کو کسی وجہ مرا نام نہ آیا

مدام[1] اپنی رہے محفل میں یوں ہی جام کی گردش — الٰہی مت دکھانا گردشِ ایام کی گردش
بسان مہر و ماہ تا چند گہہ ای طالع واژوں — رہے گی اپنی قسمت میں یہ صبح و شام کی گردش
نہیں گردش سے دور جام کی کچھ کام ای ساقی — تری آنکھوں کی گردش ہے ہمارے کام کی گردش
سمجھ میں نے لیا ہے گور[2] کی تھی جستجو اس کو — نہ تھی صحرا میں بن اس کام کے بہرام کی گردش

پھرے پروانہ گرد شمع جوں محفل میں ای رنگین
یہ گرد شیشہ ہے یوں رند مے آشام کی گردش

کچھ[3] اپنی دم بہ دم وحشت فزوں ہے — بہار آئی ہے اور تازہ جنوں ہے
وہی ہے عشق کے نزدیک آساں — قیاس و فکر سے جو کچھ بروں ہے
جہاں کی خوبیاں ہیں اس میں ساری — مگر ہر ایک سے لگ چلنا زبوں ہے
ہمارا عشق کی دولت سے یارو — جنوں ہادی ہے وحشت رہنموں ہے
نشاں رہ جاتے ہے مردوں کا باقی — گیا فرہاد لیکن بے ستوں ہے
میسر ہوئے گا دیدار اس کا — پھڑکنا آنکھ کا اچھا شگوں ہے

گلے میں لعل کا تکمہ ہے اس کے
گریباں گیر یا رنگین کا خوں ہے

---

[1] دیوان ریختہ ورق ۲۶ب [2] جنگلی گدھا [3] دیوان ریختہ ورق ۲۶ب

اشک آنکھ سے برسایا اور چشم گلابی کی | اس دل کے اٹکنے نے کیا خانہ خرابی کی
کچھ شعلے سے اُٹھتے ہیں اور جی کو جلاتے ہیں | سینے میں مرے دل ہے دوکان کبابی کی
مستی میں جو کچھ چاہے کہ بیٹھ ہمیں پیارے | خاطر میں نہیں لاتے ہم بات شرابی کی
کر ابر کے موسم میں اتنی نہ تنک ظرفی | باقی ہے کسر ساقی اب ایک گلابی کی

دیکھے مری آنکھوں میں وہ بیٹھ کے ای رنگین
منظور ہے سیر اس کو گر مردم آبی کی

اسے کب داغ دل اپنا دکھایا جائے ہے مجھ سے[1] | مٹاؤں اس کو میں جوں جوں وہ رٹھا جائے ہے مجھ سے
نشہ دونوں کو ہے ایسا کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا | نہ بیٹھا جائے ہے اس سے نہ اٹھا جائے ہے مجھ سے
میں اس کے پاس جب محفل میں بیٹھوں تب یہ نقشہ ہے | میں لپٹا اس سے جاتا ہوں وہ سرکا جائے ہے مجھ سے
حقیقت گو مگو ہے دل کی سو دل کی کہوں کس سے | دیا جاتا نہیں اس سے نہ پھیرا جائے ہے مجھ سے
اسے میں چھپ کے دیکھوں برملا وہ غیر کو دیکھے | بھلا یوں دیکھنا، دیکھو تو دیکھا جائے ہے مجھ سے
کہوں کس سے نظر میں ہے مری سب اس کی عیاری | خفا مجھ سے نہیں، مچلا ہے، مچلا جائے ہے مجھ سے
اسے تو تمکنت ہے اور مری جرأت نہیں پڑتی | بُلایا اس سے جاتا ہے نہ جایا جائے ہے مجھ سے

کمر باندھے کھڑا ہے نامہ بر خط کیا لکھوں رنگین
نہ ٹھہرا جائے ہے اس سے نہ لکھا جائے ہے مجھ سے

غیر کے گھر کون کہتا ہے کہ وہ مہمان ہے[2] | یہ غلط ہے، جھوٹھ ہے، طوفاں ہے، بہتان ہے
اس میں مجھ میں کچھ نہیں ہے، مانتا کوئی نہیں | گھر بہ گھر پھرتا ہوں میں اور ہاتھ پر قرآن ہے
شاید اس نے سان پر تیغہ لگایا آج پھر | کچھ تو ہے ای دل کہ جو اتنا تو بے اوسان ہے
امتحاں کے واسطے وہ سو کرے جور و جفا | باز آوے اس سے یہ دل اس کا کیا امکان ہے
مجھ کو سمجھاتا ہے کیا، میں جانتا ہوں ناصحا | عشق میں بے شبہ میری جان کا نقصان ہے
پر کروں کیا جی ہی میرا میرے کہنے میں نہیں | عقل یاں کھاتی ہے چکر اور خرد حیران ہے

---

[1] دیوان ریختہ ورق ۳۷ب [2] دیوان ریختہ اس دیوان میں صنعات کی قید ملحوظ ہے۔

بدبختی کا یہ تیرا دیوان ہے رنگیں عجیب
اس کا ہم نے شعر جو دیکھا وہ ایک دیوان ہے

نے آشیاں کے دیکھنے کی ہے ہوس ہمیں — صیاد بس رہنے کو کنج قفس ہمیں
نامحرمو، شتاب چلو، دیر مت کرو — کہتی ہے قافلے میں صدائے جرس ہمیں
نامے کو ایک عمر ہوئی ہے اسے لکھے — گزرے ہیں انتظار میں بارہ برس ہمیں
نے دن کو چین ہے، نہ کہیں شب کو خواب ہے — آرام اس جہاں میں نہیں اک نفس ہمیں
ناحق کی شیخیاں تھیں کہ رنگیں کروں گا قتل
زخمی ہی کر کے چھوڑ دیا، یار بس ہمیں

دوغزلہ

شب کو ایک رشکِ گُل ایسا اپنے گھر مہمان تھا
جس کے نقشِ پا سے گھر سب رشکِ صد بستان تھا

تیرے رونے نے کیا دنیا کو غرق اے چشمِ تر
یہ ترا رونا نہ تھا ایک نوح کا طوفان تھا

قتل کر کر مجھ کو وہ کہتا ہے، مَیں نے کیا کیا
ہائے یہ تو شخص میرا جان اور پہچان تھا

غیر کے گھر تھوکنے کو بھی نہیں جاتا ہے وہ
مَیں نے اس کو خوب سا چھانا ہے یہ بہتان تھا

اس کے ناحق روٹھنے پر مجھ کو آتی تھی ہنسی
لیکن اس کے مَیں خفا ہونے سے بے اوسان تھا

ملہ: رنگین نامہ، ۱۳۵، دیوان بیختہ۔

وہ چھڑاتا تھا اُدھر اور کھینچتا تھا میں اِدھر
میرے دونوں ہاتھ تھے، اور اس کا ایک دامان تھا

دوسری تو اس زمیں میں کیوں غزل پڑھتا نہیں
اس کے ہی سُننے کا اے رنگیں مجھے ارمان تھا

شب تصور اس کا آنکھوں میں مری مہمان تھا
تھا تعجب مجھ کو میں جوں آئینہ حیران تھا

اس کی فُندقِ[1] کے تصور میں گرا جو آنکھ سے
کوئی تھا یاقوت، لختِ دل، کوئی مرجان تھا

چاہنے والوں نے اس پر منھ کیے لال لال
تو نے جو کھایا تھا، جادو تھا کہ پیارے پان تھا

شب جو آنے کا کیا تھا اس نے وعدۂ صبح تلک
حلقۂ در کی ہی جانب کو ہمارا کان تھا

کوئی قائل ہی نہ تھا عصمت کا تری کل تلک
گھر بہ گھر پھرتا تھا میں اور ہاتھ پر قرآن تھا

حسرتِ بوسہ نکالی تو نے حقہ اپنی دے
ایک مدت سے ہمارے جی میں یہ ارمان تھا

دیکھنے والے جو ہیں تیرے، کہیں گے تیرے بعد
سب تو ہیں انساں ولے رنگیں عجب انسان تھا

---

[1] ایک قسم کا میوہ جو سرخ رنگ، بیر کے برابر، انسان کی انگلیوں کے سروں سے مشابہ ہوتا ہے۔ شاعر اس سے محبوب کے ہونٹھ کو مثال دیتے ہیں اور کبھی مینھدی سے رنگین انگلیوں کے سروں کو۔

ہنستے ہنستے یار سے اپنے کہی میں نے یہ بات[1] ہائے صد افسوس ہی تیرا ہوں تو میرا نہیں
دیکھیو خوبی ڈھٹھائی کی، تو کیا کہتا ہی نہیں ہاں نہیں ہاں ہاں نہیں بس بس نہیں اچھا نہیں

چار عنصر کی غزل رنگیں کہو تم اور بھی
ہی قسم تم کو علیؑ جی کی یہ مت کہنا نہیں

تجھ سے قاصد بار لے اتنا بھی کیا پوچھا نہیں ہی کہاں کس طور ہی کیسا ہی وہ کیسا نہیں
یہ جو بیماری ہی اپنی عشق کہتے ہیں اسے زر نہیں رجعت نہیں وحشت نہیں سودا نہیں
شاد اپنا دل کرے اس دور میں کیوں کر کوئی مے نہیں، ساغر نہیں، ساقی نہیں، مینا نہیں
کس طرح بحرِ عمیق عشق کو تیروں کہ یہ جو نہیں، دریا نہیں، ندی نہیں نالا نہیں
بے سر انجامی ہی جاوے شیخ کعبہ کس طرح خر نہیں، خرقہ نہیں، ٹوپی نہیں کرتا نہیں
سیم بر آویں بھلا کس طرح میرے پاس آہ زر نہیں حشمت نہیں دولت نہیں دنیا نہیں

کچھ تو رنگیں کو ہوا ہی آج کوچے میں ترے
غل نہیں، غوغا نہیں، نالہ نہیں، بلوہ نہیں

مثلث غزل

جو ہیں پابندِ بجت وہ یہی کہتے ہیں[2] اس کو لذت نہیں جو دل کہ گرفتار نہیں
خوب دیکھا تو یہاں ایک پہ مرتا ہی ایک کونسا دل ہی جسے عشق کا آزار نہیں

اب مثلث غزل ایک کہ کے سنا اے رنگیں
شعر یہ پڑھنے کے قابل ترے زنہار نہیں

دل وہ کیا دل ہی کہ جس دل میں کوئی یار نہیں یار کیا یار ہی جو یار کہ دل دار نہیں
زلف وہ زلف جس زلف سے پھنس جاوے آنکھ آنکھ کیا آنکھ ہی جو آنکھ کہ بیمار نہیں
خال وہ خال ہی جو خال ہو لب کے نزدیک لب بھی کیا لب ہی وہ جو لب کہ شکربار نہیں

---

[1] دیوان ریختہ، [2] دیوان ریختہ

غم وہی غم ہے کہ جس غم سے بھرا ہو سینہ — سینہ کیا سینہ ہے جو سینہ کہ افگار نہیں
ناف وہ ناف ہے جو ناف بلی پیٹ سے ہو — پیٹ کیا پیٹ ہے جو پیٹ کہ ہموار نہیں
بال وہ بال ہیں جو بال کہ ہوں زانوں تک — ران کیا ران ہے جو ران کہ تیار نہیں
شخص وہ شخص ہے جو شخص کہ بے مے ہو مست — مست کیا مست ہے جو مست کہ ہشیار نہیں
بات وہ بات ہے جو بات کہ ہو مردوں کی — مرد کیا مرد ہے جو مرد کہ غم خوار نہیں
شعر وہ شعر ہے جو شعر ہو رنگیں گل سا
گل وہ کیا گل ہے بھلا، جو گلِ بے خار نہیں

مخمس از غزل فارسی شاہ حاتم شاہ

آرزو دارد عبث ایں بوالہوس برشاخِ گل[1] — از خزاں مانداست اکنوں خار و خس برشاخِ گل
گل نہ می بیند عزیزاں ہیچ کس برشاخ گل — بلبلِ بے بال و پر دارد ہوس برشاخِ گل
می تواں آویخت صیاداں قفس برشاخِ گل

کیا کہوں میں تجھ کو تو سنتا نہیں ہے ای نگار — عرض ہے خدمت میں تیری یہ مری لیل و نہار
کان دھر کر بات کو میری تو سن ای گلعذار — امشب از جورِ خزاں عزمِ سفر دارد بہار
جائے غنچہ می تواں بستن جرس بر شاخِ گل

کہنے کی صاحب نہیں یہ بات ہے سب پر عیاں — جیسے تو چاہے اسے تحقیق کر لے میری جاں
باغباں کب چھوڑتا گل کا گلشن میں نشاں — تہمت دردے مکن بر عندلیب ای مہرباں
غیر گل چیں کس نہ دارد دست رس برشاخِ گل

فصلِ گل میں ہے ای ظالم نہ کر اس کو اداس — جس طرف جاتا ہے تو پھرتی ہے تیرے آس پاس
عرض کر سکتی نہیں از بس کہ ہے تیرا ہراس — بلبل ای صیاد یک پرواز دارد التماس
رخصتی دہ تا نشیند یک نفس برشاخِ گل

---

[1] 'دیوان ریختہ'، ورق ۱۰۵ ب

باغ میں رنگیں بہ قولِ حضرت حاتم اگر | بے محابا یک بہ یک ایسے کا ہو جاوے گزر
باغ باں ہر گل سے کتنا ہی بھی سر پٹک کر | در نظراں قامت رعنا چو گرد جلوہ گر
در چمن ہرگز نہ بیند ہیچ کس بر شاخ گل

مخمس[1] از غزل حضرت شاہ حاتم شاہ قدس سرہ

بے جہت[2] چشم کو کب اشک فشاں رکھتے ہیں | بے سبب کا ہے کو ہم آہ و فغاں رکھتے ہیں
کچھ نہ کچھ چاشنی عشق بھی ہاں رکھتے ہیں | ہم بھی اس پیری میں ایک راحت جاں رکھتے ہیں
شغل ہیں اس کے دل اپنے کو جواں رکھتے ہیں

کب تلک ہجر میں ناحق یوں ہی مرتے رہیے | کب تلک جور و جفا، ظلم و ستم اب سہیے
بول سکتے نہیں کچھ خوف سے ہم کیا کہیے | گالیاں خوب دیاں اب تو بھلا چپ رہیے
کب تلک سنتے رہیں، ہم بھی زباں رکھتے ہیں

دل سے اپنے تو بتاں کی نہ کبھی یاد گئی | گو، نہ کانوں تلک ان کے مری فریاد گئی
جان میری گئی، پر ان کی نہ بیداد گئی | مر گیا، خاک ہوا، خاک بھی برباد گئی
تو بھی جینے کا مرے شوخ گماں رکھتے ہیں

بادہ نوشوں کو بھی ناداں[3] خدا بخشے گا | گو وہ ہیں کیسے ہی حیراں، خدا بخشے گا
ہم کو بھی دین اور ایمان خدا بخشے گا | محتسب گو تو برا مان خدا بخشے گا
دختر رز کے اوپر تاک تو ہاں رکھتے ہیں

جتنا رنگیں نے کیا مرنے کا تیرے ماتم | اتنا غم اور کو استاد کا ہوئے گا کم
دور ہونے کا نہیں دل سے ہمارے یہ غم | مختلف قافیے سے اور غزل میں حاتم
اپنے احوال کا ہم شرح و بیاں رکھتے ہیں

---

[1] 'دیوان ریختہ' ورق ۱۰۳ ب [2] بے سبب [3] بے پوچھے

واسوخت مسدس[1]

آتشِ ہجر سے جو دل مرا بریاں ہوا　　تو یہی پہلے مرے رونے کا ساماں ہوا
آخرش حد سے زیادہ جو میں گریاں ہوا　　تو نئے سر سے بپا نوح کا طوفاں ہوا
چشمۂ چشم سے ایک پل نہیں ٹھیرا پانی
رویا اتنا ہے کہ سر سے گیا لہرا پانی

کوئی دیوانہ مجھے سمجھے، کہے یا عاقل　　کوئی فرزانہ کہے خواہ بتاوے جاہل
منزلِ عشق یہ آساں ہو یا ہو مشکل　　ہوئے جو ہوئے سو ہوا اب تو دیا تجھ کو دل
در پہ ای شوخ ترے بیٹھا ہوں آسن مارے
خواہ بخشے مجھے اب، خواہ تو گردن مارے

میں کسی ڈھب سے وہاں آؤں یہ ممکن ہی نہیں　　اور تو آئے یہاں یہ نہیں تیرا آئیں
در بہ در پھرتا ہوں میں دے کے تجھے دل اور دیں　　اب دعا آٹھ پہر ہے یہ بہ قولِ رنگیں
ہو میں پیوندِ زمیں جلد وہ ارمان بھرے
جن رقیبوں نے مرے یار کے جا کان بھرے

اشعار چند بہ طور مثنوی[2]

موا پہلے مرا بھائی خدا یار　　ہوا میں زندگی سے اپنی بیزار
رہی کچھ زیست کی مجھ کو نہ لذت　　گیا میں بھول یک سر عیش و عشرت
گئی والد کے مرنے سے امیری　　گھسی اس گھر میں آ پیری، فقیری
بکھر ہم یوں گئے سب مرد اور زن　　کہ جاوے ٹوٹ جوں جھاڑ کا بندھن

---

[1] 'دیوان ریختہ' سے واسوخت کے یہ آخری تین بند پانچواں، چھٹا اور ساتواں بہ طور نمونہ پیش ہیں۔ [2] 'دیوان ریختہ' ورق ۹ ب

ہوا ہر شغل میں، ہر یک گرفتار — کوئی تو وار گونڈے کے، کوئی پار

ہوئی جب [1]ستونی جی صاحب کی رحلت — تو بالکل اُٹھ گئی اس گھر کی برکت

اجل کا جب کہ پہنچا اُن تلک ہاتھ — تو وہ سب یہاں کی خوبی لے گئی ساتھ

مرا ہونا نہ ہونا تو ہے یکساں — کہ میں زندہ ہوں، پر مردہ ہوں بے جاں

محمد یار خاں[2] کے بعد الحق — شجاعت یہاں سے اُٹھ جاوے گی مطلق

سخاوت کا نہیں رہنے کا یہاں نام — نہ نکلے گا کسی کا ہم سے کچھ کام

بہت الایشوں سے پاک ہے یہ — غرض اس خانداں کی ناک ہے یہ

جب ابراہیم کو چھوڑے گی ہستی — تو کون ایسی کرے گا کھل کے مستی

یہ ذوق اور شوق کس میں پاؤ گے تم — اگر سب ملک میں پھر آؤ گے تم

سلماں خاں تو مجھ سے بھی پرے ہیں — کہ جو بدیاں ہیں وہ ان سے بھرے ہیں

مساوی ہے انھوں کا مرنا جینا — عبث ہے کچھ نصیحت ان کو کرنا

لکھوں احوال اختر یار خاں کا — نہ ہوگا لطف لیکن اس بیاں کا

کہ وہ بیٹا ہے میرا، اس کا احوال — لکھوں جو کچھ وہ گویا ہے مرا حال

یہ سرداری کا جو ہے طور بے شک — رہے گا سو وہ نصرت یار خاں تک

بہت ہوتے ہیں کم ایسے اولو العزم — کہ ہر شے پر ہے اس کا عزم بالجزم

رہے گی پھر ریاست کی نہ بو باس — نہ ہوگا گھوڑا، ٹٹو پھر کسی پاس

جب احمد یار خاں کی ہوگی باری — تو ہوگی بعد اس کے سخت خواری

ہمیں قدر اس کی اے یارو کہاں ہے — کہ تم سب کا وہ فخر خانداں ہے

خدا اس کو ہمیشہ شاد رکھے — جہاں آباد میں، آباد رکھے

---

[1] بڑے بھائی تھے [2] چھوٹے بھائی

قطعات

اپنے[1] رنگیں کو ای کریم مرے بخش دے مرتبہ امیری کا
مفلسی نے بہت ستایا ہے ہے یہی وقت دست گیری کا

چُرائیں گو ترے مضمون حاسد ای رنگیں تو مَن کے غصّے ہو جی میں یہ عقل سے ہے دور
بہ قول سعدی کے یوں جان فضلہ زرا چوں باغ باں بہ برد بیش تر دہد انگور

میر[2] کو مجھ پر عبث ترجیح دیتا ہے حسود میں ہوں بحرِ شعر میں غواص اور وہ غرق ہے
میر ہے گر اکبر آبادی تو میں دلی کا ہوں مجھ میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے

عثمانؓ و علیؓ و عمرؓ و حضرت صدیقؓ یارانِ پیمبرؐ جو ہیں یہ چار خدایا
صدقے سے انھوں کے یہ میرے چار عناصر کر اپنی محبت کے سزاوار خدایا
رنگیں کو تعصب سے تبرّے سے بری رکھ دے عشق اماموں کا دو چند و چار خدایا

رباعیات[3]

رنگیں تیرا کہا نہ مانا ہم نے دشمن کو دوست اپنا جانا ہم نے
ہے کون کسی کا اپنے مطلب کے ہیں سب دیکھا دنیا کا کارخانا ہم نے

وہ چار جو ہیں یار معلی القاب ہے ان میں کوئی مہر، کوئی ہے مہتاب
جوں چار پیمبر کو ملیں چار کتاب ویسے ہی محمدؐ کو ملے چار اصحاب

اصحاب میں چار تن ہیں سب سے بہتر کیا سوچے ہے حق ہیں ان کے حق سے نہ گزر
تو جان نبیؐ کو یوں، وہ دن ہے رنگیں اور اس کے وہ چار یار ہیں چار پہر

گو کوئی خوشی سے دکھ کو سہنے کا نہیں لیکن یہ کسی سے بھید کہنے کا نہیں
رنگیں سب عارضی ہے رنج و راحت شادی نہ رہے تو غم بھی رہنے کا نہیں

---

[1] دیوان ریختہ، ورق ۹۳ و ۔ [2] دیوان ریختہ ۔ [3] دیوان ریختہ ۔

الفت دنیا کی دل سے جانے کی نہیں　　اور دین کی بات ہاتھ آنے کی نہیں
رنگیںؔ ان دو بلا میں ہوں میں پابند　　فرصت مجھے اپنے سر کھجانے کی نہیں

فردیات

نہ ہو واقف کوئی زنہار یوں رہیے جہاں رہیے
تکلف زیست کا یہ ہے کہ بے نام و نشاں رہیے

وا عقدۂ دل کو مرے بادِ صبا کیوں کر کرے
تصویر کا غنچہ ہے یہ، وہ اس میں جا کیوں کر کرے

اُٹھ گیا دل مرا زمانے سے　　تنگ ہوں یہاں کے کارخانے سے

غم بہت دنیا میں ہیں پر عشق کا غم اور ہے　　ہے اسی عالم میں لیکن اس کا عالم اور ہے

بلبلا پانی کا ہے اپنے کو پہچان تو　　سوچ لے جی میں کوئی دم کا ہے مہمان تو

اگر 'عادت یار' ہو اور کم[2]　　تو نکلے مرا نام کر لو رقم

دلا شہرِ دہلی کو یوں ہم نے چھوڑا　　کہ جس طرح جنت کو آدم نے چھوڑا

---

[1] دیوان ریختہ [2] 'کم' کے ساٹھ عدد ہوتے ہیں اور 'س' کے بھی ساٹھ ہی [3] دیوان ریختہ ورق ۵۹ و

عشق سے عالم عالم ہو جو، صحرا صحرا وحشت ہو ہاموں ہاموں الفت ہو تو دریا دریا رقت ہو

شعر ایسا نہیں کچھ کھیل، جو ہر ایک کھیلے ہم نے ستر برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

بھلا کرنے آئے، بُرا کر چلے ہم آئے تھے کیا کرنے کیا کر چلے

چنے ہم نے دانتوں کے ہونے نہ پائے بنے پوپلے تب چنے ہاتھ آئے

جھلک ہی جو ترے سینے کے اب پسینے میں چمک کہاں ہے وہ الماس کے نگینے میں

حرمت اپنے ہاتھ ہی رنگیں بجا کہتے ہو تم چھیڑ کر سیتار کو کیا کیا سنا مضراب نے

کہتا نہیں کہ حشمت و مال و منال دے اس مرے میلے دل کو الٰہی کھنگال دے

کتابیات

تصانیف رنگین قلمی انڈیا آفس :-

(۱) دیوان ریختہ
(۲) دیوان بیختہ
(۳) دیوان آمیختہ
(۴) دیوان انگیختہ
(۵) مجموعۂ رنگین
(۶) اخبار رنگین
(۷) امتحان رنگین
(۸) مجالس رنگین
(۹) فرس نامہ
(۱۰) عجائب و غرائب رنگین
(۱۱) مثنوی مثلث رنگین کہ مشہور بہ شہر آشوب رنگین ا
(۱۲) مثنوی ربع رنگین (چہار چمن رنگین
(۱۳) مثنوی مخمس رنگین (پنجۂ رنگین)
(۱۴) گل دستۂ رنگین
(۱۵) سبع سیارۂ رنگین
(۱۶) خمسۂ رنگین
(۱۷) قوت الایمان
(۱۸) قصیدہ ترجمہ غوثیہ
(۱۹) ترجمہ قصیدہ بانت سعاد
(۲۰) نسخہ درستی قصیدہ سودا
(۲۱) ایجاد رنگیں (موحد رنگین)[۱]

(۱۷ تا ۲۱) انگ نمبر ۲۱۰

تصانیف رنگین قلمی پنجاب یونی ورسٹی لائبریری :-

(۱) مثنوی باغ و بہار رنگین
(۲) مثنوی مہ جبین و نازنین (مثنوی دل پذیر)
(۳) شش جہت رنگین نامکمل
(۴) فرس نامہ رنگین
(۵) حدیقۂ رنگین فارسی

---

[۱] ملاحظہ ہو فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۳

مطبوعہ کتب :-

(۱) 'مجالس رنگین' مرتبہ مسعود حسن رضوی

(۲) 'ولی گجراتی' از سید ظہیر الدین

(۳) 'جرأت' از ڈاکٹر ابو اللیث

(۴) 'ذکر میر'

(۵) 'تاریخ ہندوستان' از مولوی ذکاء اللہ

(۶) 'نکات الشعراء' میر تقی میر

(۷) 'گلشن بے خار' آشفتہ

(۸) 'آب حیات' آزاد

(۹) 'اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' از مولوی عبد الحق

(۱۰) 'پنجاب میں اردو' از شیرانی

(۱۱) 'تذکرہ میر'

(۱۲) 'تاریخ زبان اردو' از ڈاکٹر مسعود حسین خاں

(۱۳) 'دکن میں اردو' نصیر الدین ہاشمی

(۱۴) 'اردوئے قدیم' شمس اللہ قادری

(۱۵) 'معراج العاشقین' مطبوعہ تاج پریس مرتبہ مولوی عبد الحق

(۱۶) 'تذکرہ اردو مخطوطات' از محی الدین قادری

(۱۷) مقدمہ مولوی عبد الحق "سب رس" مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو

(۱۸) 'مخزن نکات' از قائم مطبوعہ انجمن ترقی اردو

(۱۹) مجموعہ نغز محمود شیرانی

(۲۰) 'دلی کا دبستان شاعری' مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو

(۲۱) 'انڈو مغل پرشین پوئٹری'

(۲۲) 'تذکرہ شعرائے اردو' میر حسن مطبوعہ انجمن ترقیٔ اردو

(۲۳) 'کلیات ولی' مطبوعہ انجمن ترقی اردو

(۲۴) 'سودا' از شیخ چاند " "

(۲۵) 'طبقات الشعراء' مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث

(۲۶) 'نصرتی' مولوی عبد الحق

(۲۷) 'مقدمہ شعر و شاعری' از حالی

(۲۸) 'تذکرہ شعرائے اردو' مؤلفہ میر حسن بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن خاں

(۲۹) 'کلیات سودا' مطبوعہ نول کشور

(۳۰) 'چند قدیم لغات' اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۹ء از ڈاکٹر ابو اللیث

(۳۱) 'شعر العجم' حصہ سوم از شبلی

(۳۲) 'شعر العجم' " پنجم "

(۳۳) غرۃ الکمال قلمی از امیر خسرو، پنجاب یونیورسٹی لائبریری

اشاریہ

(ا)